منهاج البراعه

فی شرح

نهج البلاغه

منہاج البراعہ

فی شرح

نہج البلاغہ

جلد اوّل، دوم

تالیف

علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ

ترجمہ

حجتہ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی

ناشر

حق برادرز

8۔ مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

فون:0333-4431382

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ذکر حوالہ کے ساتھ صرف اقتباس کی اجازت ہے

تعارف کتاب

نام	منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ
جلد	اول، دوم
مئولف	علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ
مترجم	حجۃ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی
ڈیزائننگ وکمپوزنگ	محمد تقی فاضل
ناشر	حق برادرز لاہور
مطبع	معراج دین پرنٹرز لاہور
اشاعت دوئم	2008ء
قیمت	-/450روپے

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر	نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر
۱۹۳	زمین وآسمان کی تعداد	۲۹۵	۲۱۸	فرشتوں کے پروں کی تعداد	۳۳۴
۱۹۴	ستاروں کا ٹھکانہ	۲۹۶	۲۱۹	دسویں فصل، حضرت آدمؑ کی تعریف	۳۳۵
۱۹۵	آفتاب وماہتاب کے بارے میں	۲۹۷	۲۲۰	حضرت آدمؑ کی تخلیق	۳۳۶
۱۹۶	ایک اہم حدیث	۳۰۰	۲۲۱	انسان کو انسان کیوں کہتے ہیں	۳۴۱
۱۹۷	سورج کی حرارت وچاند کی برودت	۳۰۱	۲۲۲	رنگ، بو اور ذائقہ	۳۴۲
۱۹۸	سورج وچاند کی حرکات	۳۰۱	۲۲۳	ہشام بن حکم کا مناظرہ	۳۴۲
۱۹۹	اختتام جلد اول	۳۰۳	۲۲۴	دل شک کو کیونکر دور کرتا ہے؟	۳۴۵
۲۰۰	آغاز جلد دوم	۳۰۵	۲۲۵	انسان کی مختلف طبیعتیں	۳۴۶
۲۰۱	نویں فصل، ملائکہ کی قسمیں	۳۰۷	۲۲۶	گیارھویں فصل، ملائکہ کا سجود، ابلیس کا انکار	۳۴۷
۲۰۲	فرشتوں کے بارے میں مختلف نظریات	۳۰۹	۲۲۷	ابو حنیفہ سے امام جعفر صادقؑ کی گفتگو	۳۵۱
۲۰۳	ملائکہ کی عبادت	۳۱۲	۲۲۸	ابلیس کی عبادت کا عرصہ	۳۵۵
۲۰۴	آیا فرشتے سوتے ہیں؟	۳۱۷	۲۲۹	وقت معلوم سے کیا مراد ہے؟	۳۵۵
۲۰۵	سہو، نسیان اور غفلت میں فرق	۳۱۹	۲۳۰	چند اہم امور کی نشاندہی	۳۵۶
۲۰۶	فرشتے وحی کے امین ہیں	۳۱۹	۲۳۱	آدمؑ کی داستان بار بار کیوں دہرائی گئی؟	۳۵۶
۲۰۷	قضا کیا ہے؟ تدبیر کرنے والے فرشتے	۳۲۱	۲۳۲	آدمؑ کو فرشتوں کے سجدہ کا راز؟	۳۵۷
۲۰۸	قدر کیا ہے؟ شب قدر، نزولِ ملائکہ	۳۲۲	۲۳۳	ابلیس کو کس چیز نے سجدہ سے روکا؟	۳۵۹
۲۰۹	فرشتوں کے بارے میں، روح القدس	۳۲۳	۲۳۴	آیا ابلیس جن ہے یا فرشتہ؟	۳۶۰
۲۱۰	بندوں کے محافظ فرشتے	۳۲۴	۲۳۵	ابلیس کے فرشتہ ہونے کے دلائل	۳۶۲
۲۱۱	شیعیان علیؑ اور جنت	۳۲۵	۲۳۶	سجود ملائکہ کی کیفیت	۳۶۴
۲۱۲	جنت میں داخل ہونے کی کیفیت	۳۲۶	۲۳۷	شیطان کی تخلیق..... کی حکمت	۳۶۵
۲۱۳	بہشت کی ساخت	۳۲۸	۲۳۸	ابلیس کے خدا پر اعتراضات	۳۶۶
۲۱۴	فرشتوں کی ایک اور قسم	۳۳۰	۲۳۹	بارھویں فصل۔ آدم کا جنت میں ٹھکانہ	۳۷۱
۲۱۵	عرش کیا ہے؟	۳۳۰	۲۴۰	ایک ادبی نکتہ	۳۷۲
۲۱۶	حاملین عرش	۳۳۱	۲۴۱	کونسی جنت؟	۳۷۲
۲۱۷	حاملین عرش کی تواضع وانکساری	۳۳۳	۲۴۲	آدمؑ کا عہد	۳۷۵

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر
۲۴۳	ابلیس کی آدمؑ تک رسائی	۳۷۷
۲۴۴	شجرہ ممنوعہ کیا ہے؟	۳۷۹
۲۴۵	شجرہ ممنوعہ کی عرفانی تفسیر	۳۸۰
۲۴۶	عصمت انبیاء کی بحث	۳۸۲
۲۴۷	عصمت کب ملتی ہے	۳۸۴
۲۴۸	شیعوں کے نزدیک دلائل عصمت	۳۸۴
۲۴۹	مخالفین شیعہ کے دلائل	۳۸۵
۲۵۰	ان دلائل کا جواب	۳۸۷
۲۵۱	آدمؑ نے پھل کیوں کھایا؟	۳۸۹
۲۵۲	مامون کے امام رضاؑ سے سوالات	۳۹۰
۲۵۳	حدیث امامؑ پر تبصرہ	۳۹۱
۲۵۴	آدمؑ کی توبہ اور اس کی قبولیت	۳۹۳
۲۵۵	توبہ ہبوط سے پہلے تھی یا بعد میں	۳۹۴
۲۵۶	آدمؑ کتنا عرصہ روتے رہے	۳۹۹
۲۵۷	آدمؑ کو کونسے کلمات بتائے گئے؟	۴۰۰
۲۵۸	انبیاء کی توبہ کے انداز	۴۰۴
۲۵۹	عصمت انبیا کا ایک اور پہلو	۴۰۶
۲۶۰	علامہ مجلسیؒ کا موقف	۴۰۸
۲۶۱	چودھویں فصل۔ لفظ ذریت کی تشریح	۴۱۰
۲۶۲	لفظ "شیاطین" کی تحقیق	۴۱۱
۲۶۳	نماز پنجگانہ کا وجوب	۴۱۱
۲۶۴	انسان کی افزائش نسل اور اس کی تحقیق	۴۱۴
۲۶۵	انبیاء کرام سے عہد و پیمان لیا گیا	۴۱۷
۲۶۶	حضرت آدمؑ کی وفات	۴۱۹
۲۶۷	ہبۃ اللہ کو قابیل کی دھمکی	۴۱۹

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر
۲۶۸	حضرت نوحؑ کی وفات	۴۲۰
۲۶۹	سلسلہ نبوت آگے بڑھتا ہے	۴۲۱
۲۷۰	خاتم الانبیاءؐ کے بارے انبیاؑ کی خوشخبری	۴۲۱
۲۷۱	نبیؑ کو وصیت اور امانت سپاری کا حکم	۴۲۲
۲۷۲	عالم ذر کی باتیں	۴۲۳
۲۷۳	حق سے کیا مراد ہے؟	۴۲۷
۲۷۴	فطرت الہیہ کیا ہے؟	۴۲۸
۲۷۵	نعمت سے کیا مراد ہے؟	۴۲۹
۲۷۶	قدرت الہی کی چھ آیات	۴۳۰
۲۷۷	پندرھویں فصل۔ نبی اور رسول میں فرق	۴۳۰
۲۷۸	نبوت کیوں ضروری ہے؟	۴۳۱
۲۷۹	ہر دور میں حجت خدا کا ہونا ضروری ہے	۴۳۳
۲۸۰	زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی	۴۳۵
۲۸۱	سولہویں فصل۔ خدا کی حجتیں	۴۳۷
۲۸۲	انبیاؑ سے خصوصی میثاق لیا گیا	۴۳۹
۲۸۳	ایک مشکل مسئلہ اور اس کا حل	۴۴۰
۲۸۴	پیغمبر اکرمؐ کی سابقہ کتابوں میں علامات	۴۴۱
۲۸۵	سرکار رسالت مآبؐ کی ولادت باسعادت	۴۴۲
۲۸۶	بعثت کے وقت عالم عرب کی کیفیت	۴۴۳
۲۸۷	سترھویں فصل۔ قرآن کا تفصیلی جائزہ	۴۴۶
۲۸۸	پیغمبر اسلامؐ کی رحلت	۴۴۷
۲۸۹	قرآن واہل بیتؑ کی ضرورت	۴۴۹
۲۹۰	احکام خمسہ	۴۴۹
۲۹۱	رخص وعزائم کا بیان	۴۵۰
۲۹۲	عام اور خاص کا بیان	۴۵۱

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر	نمبر شمار	تفصیل مطالب	نمبر شمار
۲۹۳	امثال وعبر	۴۵۲	۳۱۸	ایک اہم سوال اور اس پر دلائل	۴۸۷
۲۹۴	مطلق ومقید اور محکم ومتشابہ	۴۵۳	۳۱۹	ایک اور اعتراض	۴۸۸
۲۹۵	مفسر اور مجمل کا بیان	۴۵۴	۳۲۰	ایک سوال اور جواب	۴۸۹
۲۹۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۴۵۶	۳۲۱	تیسرا امر، علم قرآن ائمہؑ کے پاس ہے	۴۸۹
۲۹۷	شارح بحرانی کا مؤقف اور اس کی تردید	۴۵۶	۳۲۲	عقلی دلائل	۴۸۹
۲۹۸	سنت میں واجب اور کتاب میں اجازت	۴۵۷	۳۲۳	نقلی دلائل	۴۹۰
۲۹۹	بعض اور قسم کے واجبات	۴۵۸	۳۲۴	احادیث پر تبصرہ	۴۹۳
۳۰۰	گناہان صغیرہ وکبیرہ کی تفصیل	۴۵۹	۳۲۵	چوتھا امر۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت	۴۹۴
۳۰۱	کم عمل قبول ہے، زیادہ کی گنجائش ہے	۴۶۲	۳۲۶	امام غزالی کا تبصرہ	۴۹۶
۳۰۲	تتمہ، امر اول، قرآن مجید کی توصیف	۴۶۳	۳۲۷	ساری گفتگو کا نتیجہ	۴۹۶
۳۰۳	امر ثانی۔ جو قرآن ہمارے پاس ہے	۴۶۶	۳۲۸	اٹھارویں فصل۔ حج اور بیت اللہ	۴۹۷
۳۰۴	اخباریوں اور اصولیوں کا موقف	۴۶۷	۳۲۹	حج کا تفصیلی تذکرہ	۴۹۸
۳۰۵	شیخ صدوق اور شیخ طوسی کا نظریہ	۴۶۷	۳۳۰	بیت اللہ کا تفصیلی ذکر اور محل وقوع	۴۹۹
۳۰۶	خلاصہ کلام	۴۶۸	۳۳۱	دوسرا مقصد۔ حجر اسود کیا ہے؟	۵۰۱
۳۰۷	مصنف کی رائے	۴۶۸	۳۳۲	حجر اسود کا تفصیلی ذکر	۵۰۱
۳۰۸	منکرین تحریف کے دلائل	۴۶۹	۳۳۳	حجر اسود کی تنصیب	۵۰۳
۳۰۹	ایک سوال اور اس کا جواب	۴۶۹	۳۳۴	مقام ابراہیمؑ اور اس کا محل وقوع	۵۰۴
۳۱۰	طریق استدلال	۴۷۳	۳۳۵	تیسرا مقصد خانہ کعبہ بیت الحرام کیوں	۵۰۵
۳۱۱	حدیث ثقلین سے استدلال	۴۷۴	۳۳۶	بیت العتیق کے معنی	۵۰۵
۳۱۲	محقق کاظمی کا اعتراض وقول مصنف	۴۷۵	۳۳۷	مکہ معظمہ کے مختلف نام	۵۰۵
۳۱۳	تحریف کے دلائل	۴۷۶	۳۳۸	خانہ کعبہ قبلہ عالم ہے	۵۰۶
۳۱۴	پہلی قسم کے دلائل	۴۷۶	۳۳۹	حج کیلئے حضرت ابراہیمؑ کی اذان	۵۱۱
۳۱۵	دوسری قسم کے دلائل	۴۸۱	۳۴۰	انبیاء ومرسلین کا حج	۵۱۲
۳۱۶	تیسری قسم کے دلائل	۴۸۲	۳۴۱	فرشتے مشغول طواف ہیں	۵۱۶
۳۱۷	غلط فہمی کا ازالہ۔ مصنف کا تبصرہ	۴۸۶	۳۴۲	طواف کا فلسفہ	۵۱۷

منهاج البراعه

فی شرح

نهج البلاغه

جلد دوم

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خداوند رحمان ور حیم کے نام کے ساتھ

نویں فصل

ملائکہ کی قسمیں

ثُمَّ فَتَقَ سُبْحَانَهٗ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلٰى فَمَلَأَهُنَّ اَطْوَارًا مِّنْ مَّلَائِكَتِهٖ فَمِنْهُمْ سُجُوْدٌ لَّا يَرْكَعُوْنَ وَ رُكُوْعٌ لَّا يَنْتَصِبُوْنَ وَصَافُّوْنَ لَا يَتَزَايَلُوْنَ وَمُسَبِّحُوْنَ لَا يَسْأَمُوْنَ لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ وَلَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ وَلَا فَتْرَةُ الْاَبْدَانِ وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ وَ مِنْهُمْ اُمَنَاءُ عَلٰى وَحْيِهٖ وَ اَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهٖ وَمُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهٖ وَاَمْرِهٖ وَ مِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهٖ وَالسَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهٖ وَمِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى اَقْدَامُهُمْ وَ الْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَآءِ الْعُلْيَا اَعْنَاقُهُمْ وَ الْخَارِجَةُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْكَانُهُمْ وَالْمُنَاسِبَةُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ اَكْتَافُهُمْ نَاكِسَةٌ دُوْنَهٗ اَبْصَارُهُمْ مُتَلَفِّعُوْنَ تَحْتَهٗ بِاَجْنِحَتِهِمْ مَضْرُوْبَةٌ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَنْ دُوْنَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ وَ اَسْتَارُ الْقُدْرَةِ لَا يَتَوَهَّمُوْنَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيْرِ وَ

پھر خداوند عالم نے بلند آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کئے اور ان کی وسعتوں کو طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا۔ کچھ ان میں سربسجود ہیں جو رکوع نہیں کرتے، کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے، کچھ صفیں باندھے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ نہیں چھوڑتے اور کچھ پاکیزگی بیان کر رہے ہیں جو اکتاتے نہیں۔ نہ ان کی آنکھوں پر نیند غالب آتی ہے، نہ ان کی عقلوں میں بھول چوک پیدا ہوتی ہے، نہ ان کے بدنوں میں سستی آتی ہے اور نہ ان پر نسیان کی غفلت طاری ہوتی ہے۔ کچھ ان میں وحی الٰہی کے امین، اس کے رسولوں کی طرف پیغام رسانی کیلئے زبان حق، اس کے قطعی فیصلوں اور فرمانوں کو لے کر آنے جانے والے ہیں، کچھ اس کے بندوں کے نگہبان اور جنت کے دروازوں کے پاسبان ہیں، کچھ وہ ہیں جن کے قدم زمین کی تہ میں جمے ہوئے ہیں، گردنیں بلند آسمانوں سے بھی باہر نکلی ہوئی ہیں، ان کے پہلو اطراف عالم سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کے شانے عرش کے پایوں سے میل کھاتے ہیں، عرش کے سامنے ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور اس کے نیچے اپنے پروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان میں اور دوسری مخلوق میں عزت کے حجاب اور قدرت کے سراپردے حائل ہیں۔ وہ شکل وصورت کے ساتھ اپنے رب کا تصور نہیں کرتے، نہ اس

لَايُجْرُوْنَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوْعِيْنَ وَلَا يَحُدُّوْنَهُ بِالْاَمَاكِنِ وَلَايُشِيْرُوْنَ اِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ.

پر مخلوق کی صفتیں طاری کرتے ہیں، نہ اسے محل و مکان میں گھرا ہوا سمجھتے ہیں اور نہ اشباہ و نظائر سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

تشریح

(اَطْوار) "طور" (بروزن ثوب) کی جمع ہے (اثواب) کے وزن پر ہے۔ "تارۃ" کے معنی میں ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے "اَتَيْتُهٗ طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ" یعنی میں اس کے پاس کئی مرتبہ آیا اور "حالت" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور اس خطبے میں "مختلف قسمیں" مراد ہیں جس طرح کہ اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ کی گئی ہے: "قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" "تحقیق اس نے تمہیں مختلف اقسام میں پیدا کیا ہے، یعنی مختلف صفات میں؛ کوئی غنی ہے تو کوئی فقیر، کوئی بیمار ہے تو کوئی تندرست۔ (اَلْمَلَائِكَة) کا لفظ "اَلُوْكٌ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "پیغام" جیسے مثال ہے کہ "اَلْكٌ بَيْنَ الْقَوْمِ اَلْكًا" (قوم کے درمیان پیغام رسانی کا سلسلہ جاری رہا) اور "اَلُوْكٌ" رسول (پیامبر) کو کہتے ہیں۔ ملائکہ جمع کا لفظ ہے اور اس کا مفرد "مَلَكٌ" ہے اور فیومی کے بقول "مَلْاَكٌ" (بروزن مَغْفَلٌ) ہے اور بعض کے نزدیک "لَاَكَ" بمعنی "اَرْسَلَ" سے ماخوذ ہے لہذا "مَلْاَكٌ" (مَفْعَل کے وزن پر) ہے۔ بہر حال صورت خواہ کچھ بھی ہو لفظ "مَلَكٌ" اسم مکان ہے جو "محل الرسالۃ" (پیغام کی جگہ) کے معنی میں ہے، یا پھر مصدر میمی ہے اور مفعول کے معنی میں ہے۔ "اَلسُّجُوْدُ" اور "اَلرُّكُوْعُ" اسم فاعل "ساجد" اور "راکع" کی جمع ہیں "فُعُوْلٌ" کے وزن پر۔ "اَلسَّدَنَةُ" (بروزن خَدَمَةٌ) جمع ہے "سَادِنٌ" (بروزن خادم) کی جو کہ لفظ اور معنی میں ایک ہیں۔ "اَلنَّظَائِرُ" جمع ہے "نَظِيْرَةٌ" کی جس کے معنی مثل اور مشابہ۔ یعنی اشکال، افعال اور اخلاق میں مشابہ ہونا۔ بعض نسخوں میں لفظ "اَلنَّظَائِرُ" کی جگہ "اَلنَّوَاظِرُ" ہے جس کے معنی ہیں "آنکھیں" اور بعض نسخوں میں "اَلْمَوَاطِنُ" ہے جس کے معنی ہیں مقامات۔

بہر حال حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ساتوں آسمانوں کی تخلیقی کیفیت اور ان کی شمس و قمر اور ستارگان کے ساتھ زینت کا تذکرہ فرمانے کے بعد ان میں رہنے والی مخلوق، اس کے حالات، صفات اور مختلف اقسام و صفات کا تذکرہ فرمایا اور اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آسمانوں میں رہنے والی مخلوق ملائکہ ہیں جن کے مختلف حالات و کیفیات کی وجہ سے ان کی مختلف اقسام ہیں امیر المؤمنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں (پھر خداوند سبحانہ نے بلند آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کئے) شارح بحرانیؒ کے کلام سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پر "ثُمَّ" (پھر) کا لفظ "ترتیب ذکری" کے طور پر ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ "آسمانوں کے شگافتہ کرنے اور ان میں ملائکہ کے ٹھہرانے کو شمس و قمر اور ستاروں کے ذکر کرنے کے بعد کیوں بیان فرمایا ہے؟ حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ ان کا شگافتہ ہونا دوسری تمام باتوں پر مقدم ہے؟" اس کا جواب یہ ہے کہ آپؑ نے تمام آسمانوں کی برابری کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ایک بالجملہ اشارہ ہے۔ گویا آپؑ نے تمام آسمانوں کو ایک کرہ فرض کیا ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا بھی یہی موقف ہے۔ پھر ان آسمانوں کے اوپر اور نیچے والے حصوں کو داخلی اور خارجی سطح کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ پھر ان کے بعض کمالات کو جو کہ سورج، چاند اور ستارے ہیں مجموعی اور اجمالی صورت میں بیان کیا ہے، اس کے بعد ان کی تفصیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہر ایک کو علیحدہ بیان فرمایا ہے اور ملائکہ کی سکونت کو بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فصاحت کے لحاظ سے یہ

چیز بہتر ہوتی ہے کہ پہلے اجمال کو ذکر کیا جائے پھر اس کی تفصیل بیان کی جائے"۔
مؤلف کہتے ہیں: "لفظ "ثُمَّ" کے ظاہر سے بھی اور حضرت کے ظاہری کلام سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ترتیب حقیقی پائی جاتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی تخلیق شمس و قمر اور ستاروں کی تخلیق کے بعد ہوئی ہے۔ البتہ یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ ساتوں آسمان آپس میں ملے ہوئے ہوں اور شمس و قمر اور ستارے بھی ان میں خلق ہو چکے ہوں پھر ہوا وغیرہ کے ذریعہ انہیں علیحدہ کر دیا گیا ہو! جیسا کہ اس کی نظیر تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس کا قول ہے جو اس آیت شریفہ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے: "اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا" (سورہ انبیاء / ۳۰) آیا ان کافروں نے نہیں دیکھا کہ یہ زمین و آسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے انہیں الگ کیا ہے۔
گویا یہ فرماتا ہے کہ زمین و آسمان آپس میں جڑے ہوئے اور ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو ہوا کے ذریعہ جدا کیا (ابن عباس وغیرہ)"

خلاصہ کلام حضرت کے اس فرمان "ثُمَّ" (پھر) پر کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جو اس کے "ترتیب ذکری" ہونے پر دلالت کرے بلکہ اس کے "ترتیب معنوی" ہونے پر دلالت کرنے کا احتمال ہے۔ ہاں! البتہ ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ترتیب خواہ ذکری ہو یا معنوی یہ بات مسلّم ہے کہ حضرتؑ کا کلام فلاسفہ کے اس نظریہ کو باطل کرتا ہے جس میں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ افلاک کا آپس میں اس طرح کا تعلق ہے کہ ہوا وغیرہ کے ذریعہ ان میں کوئی جدائی نہیں ہوئی"۔
بہر صورت جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو خلق فرمالیا اور ان کو ایک دوسرے سے جدا بھی کر دیا تو (ان کی وسعتوں کو طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا) اور انہیں وہاں وہاں پر ٹھہرایا جہاں اس کی تدبیر و حکمت کا تقاضا تھا۔

فرشتوں کے بارے میں مختلف نظریات

فرشتوں کی ماہیت کے بارے میں لوگوں کے مختلف آراء و نظریات ہیں، چنانچہ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ: "فرشتے ایسے لطیف نورانی اجسام ہیں جو مختلف اشکال تبدیل کرنے پر قادر ہوتے ہیں، سخت سے سخت افعال کو بجالانے میں علم اور قدرت کے لحاظ سے کامل ہوتے ہیں، ان کا ٹھکانہ آسمان ہیں، انبیاء کی طرف خدا کے رسول (فرستادے) ہیں اور اس کی وحی کے امین ہیں، شب و روز خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں اور کبھی اکتاتے نہیں، کبھی اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم ملتا ہے اسے پوری طرح بجالاتے ہیں"۔ "شرح مقاصد" میں اس نظریے کی نسبت اکثر امت کی طرف دی گئی ہے اور فخر رازی نے اسے اکثر مسلمین کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ "فرشتے وہی ستارے تو ہیں جنہیں "سعد" یا "نحس" کہا جاتا ہے۔ سعد ستارے ملائکہ رحمت ہیں اور نحس ستارے ملائکہ عذاب ہیں" یہ مت پرستوں کا نظریہ ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ: "فرشتے نور کے جوہر سے پیدا کئے گئے ہیں البتہ مذکر مونث کے ملاپ کی صورت میں نہیں بلکہ ایسے جس طرح شعاع سورج سے اور حکمت حکیم سے پیدا ہوتی ہے، اسی طرح شیاطین ظلمت کے جوہر سے پیدا کئے گئے ہیں جیسے حماقت احمق سے پیدا ہوتی ہے"۔ یہ مجوسیوں کے بہت بڑے گروہ

اور دوگانہ پرستوں کا مذہب ہے۔ اور اس کی تفصیل جلد اول کی ساتویں فصل میں گزر چکی ہے۔ البتہ کہنے کی جوبات ہے وہ یہ کہ یہ اقوال اس بات پر متفق ہیں کہ ملائکہ ایک جسمانی مخلوق ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ "فرشتے در حقیقت "نفس ناطقہ" ہی ہوتے ہیں جن کی ذات مستقل ہوتی ہے اجسام سے ایسے جدا ہوتے ہیں جس طرح "صفا" اور "خیر" جدا ہوتی ہے جیسا کہ شیاطین بھی ناطقہ ہوتے ہیں لیکن "خبیث" اور "گندے"۔ اس نظریہ کے حامل نصاریٰ میں سے کچھ لوگ ہیں، جب کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ: "فرشتے ایسے جوہر ہوتے ہیں جو بذاتہ قائم ہیں اور ماہیت کے لحاظ سے نفوس ناطقہ کے مخالف ہوتے ہیں، طاقت اور قوت میں ان سے زیادہ کامل ہوتے ہیں علم میں ان سے زیادہ فائق ہوتے ہیں، نفوس انسانی ان کیلئے ایسے ہوتی ہیں جیسے روشنی کا سورج کے ساتھ تعلق ہو"۔ ان کے نظریئے کے مطابق "ان جواہر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ان کا افلاک اور کواکب کے اجرام کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جیسے ہمارے نفس ناطقہ کا ہمارے اجسام کے ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ اجرام فلکی سے بھی ان کی شان بہت بلند ہوتی ہے بلکہ وہ معرفت اور حب الٰہی میں مستغرق اور اس کی اطاعت میں ہمہ وقت مگن رہتے ہیں اور فرشتوں کی اسی قسم کو "ملائکہ مقرب" کہتے ہیں۔ یہ آسمانوں کی تدبیر کرتے ہیں اور انہیں "مدبر سماوات" بھی کہا جاتا ہے، جس طرح کہ پہلی قسم کے فرشتے ہمارے نفوس کی تدبیر کرتے ہیں"۔ فرشتوں کی یہ دو قسمیں ایسی ہیں جن کے اثبات پر تمام فلاسفہ کو اتفاق ہے، جبکہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ: "اگر تدبیر امور کرنے والے اچھے اور نیک ہوں تو وہ ملائکہ ہوتے ہیں اور اگر بدکار اور شریر ہوں تو وہ شیاطین ہوتے ہیں یہ آخری اقوال فرشتوں کے اجسام ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

محدث علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں ارشاد فرماتے ہیں: "معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب امامیہ کا بلکہ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اپنے آپ کو "فلسفی" کہلاتے ہیں اور خود کو خواہ مخواہ مسلمانوں کی صفوں میں داخل کیا ہوا ہے تاکہ اس طرح سے مسلمانوں کے اصول و عقائد کو خراب کیا جاسکے۔ کہ فرشتوں کا وجود ہے۔ اور یہ نورانی اجسام لطیفہ ہیں جن کے دو دو، تین تین اور چار چار بلکہ اس سے بھی زیادہ پَر ہیں اور وہ مختلف شکلیں تبدیل کرنے پر قادر ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت جو شکل و صورت چاہے انہیں عطا کر دیتا ہے۔ اور وہ "صعودی" (اوپر کی طرف) اور "ہبوطی" (نیچے کی طرف) حرکت کرنے پر بھی قادر ہوتے ہیں، انہیں انبیاء کرام اور اوصیائے عظام علیہم السلام نے بچشم خود دیکھا ہے۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ فرشتے مجرد مخلوق ہیں اور ان کی عقول یا نفوس فلکیہ یا قوتوں اور طبیعتوں کے ساتھ تاویل کرتے ہیں اور حد سے زیادہ آیات اور متواتر روایات کی بے جا تاویلیں کرتے ہیں در حقیقت ان لوگوں کا سارا دارومدار شکوک و شبہات اور بودے استدلالات پر ہوتا ہے، جو راہ راست سے ہٹے ہوئے اور صاحبان ہوا و ہوس کے پیروکار ہیں"۔

پھر ملائکہ کی کئی قسمیں ہیں، ان کی یہ مختلف قسمیں نعت و صفات اور مراتب و درجات کے لحاظ سے بے شمار اقسام ہیں، چنانچہ کچھ تو ان میں:

"کروبیین" ہیں، کچھ "روحانیون" ہیں، کچھ "مدبرین" ہیں، کچھ "حافظین" ہیں، کچھ "مسکین" ہیں، کچھ "صافون" ہیں،

کچھ "امناء وحی وسفراء رُسُل" ہیں، کچھ "خازن جنت" ہیں، کچھ "زبانی جنہم" ہیں۔ اور بھی بہت ساری قسمیں ہیں جنہیں اللہ تعالی اچھی طرح جانتا ہے۔ البتہ حضرت امام سید الساجدین، زین العابدین علیہ السلام نے صحیفہ سجادیہ میں "حاملین عرش اور تمام ملائک مقرب" پر درود و سلام بھیجتے ہوئے بعض اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جبکہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس خطبہ میں لفظ "مِنْ" کے ساتھ ان کی چار قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کی ہیں ہی یہی چار قسمیں، بلکہ ان کی بے حد وحساب اقسام ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے ایک دوسرے میں جمع بھی ہو سکتی ہیں اور علیحدہ بھی۔ ان میں حقیقی تباین اور انفصال نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ دو دو تین تین اقسام ایک قسم میں بلکہ ایک فرد میں بھی جمع ہو سکتی ہیں، جیسا کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام "صحیفہ سجادیہ" میں ارشاد فرماتے ہیں "اَللّٰھُمَّ وَ حَمَلَةُ عَرْشِكَ الَّذِیْنَ لاَ یَفْتُرُوْنَ مِنْ تَسْبِیْحِكَ وَ لاَ یَسْأَمُوْنَ مِنْ تَقْدِیْسِكَ" خداوندا! اور تیرے وہ حاملین عرش بھی ہیں جو تیری تسبیح بیان کرنے سے اکتاتے نہیں اور تقدیس بیان کرنے سے تھکتے نہیں۔

شارح معتزلی نے قطب راوندی کے کلام سے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے، وہ یوں کہ انہوں نے بندوں کے محافظ اور باب جنت کے نگہبانوں کو امناء وحی کے ساتھ ملا کر ایک قسم بتایا ہے اور چار قسموں کی تین قسمیں بنائی ہیں۔ اسی طرح شارح بحرانیؒ کے کلام سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے امناء وحی اور رسولوں کے ترجمان فرشتوں کو اور قضاو قدر پر مامور ملائکہ کو سابقہ اقسام میں داخل کر دیا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جناب علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے کلام میں فرشتوں کی یہ اقسام صفات کے اعتبار سے فرمائی ہیں نا کہ حقیقت کے طور پر۔

چنانچہ (ان میں سے کچھ) یعنی ان کی پہلی قسم سے (سربسجود ہیں جو رکوع نہیں کرتے اور کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے، کچھ صفیں باندھے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ نہیں چھوڑتے اور کچھ پاکیزگی بیان کر رہے ہیں جو اکتاتے نہیں) یعنی ان میں سے کچھ ایسے سجدہ کناں ہیں جو رکوع کیلئے اپنا سر سجدہ سے نہیں اٹھاتے، کچھ رکوع میں ایسے جھکے ہوئے ہیں کہ اس سے کبھی سر نہیں اٹھاتے، کچھ عبادت کیلئے اس طرح صفیں باندھے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ کو نہیں چھوڑتے اور کچھ اس طرح تسبیح بیان کر رہے ہیں جو اکتاتے نہیں، جیسا کہ خداوند جل شانہٗ ان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وَ مَا مِنَّا اِلاَّ لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ" (صافات / ۱۶۴ تا ۱۶۶) اور ہم میں سے ہر ایک کیلئے ایک مقام معین ہے۔ اور ہم اس کی بارگاہ میں صف بستہ کھڑے ہونے والے ہیں۔ اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

یہ عبادت میں ان کے مراتب اور درجات میں باہمی فرق کی طرف اشارہ ہے، گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کیلئے خدا کی عبادت، معرفت اور اس کے تدبیر عالم کیلئے حکم پر عمل کرنے کیلئے ایک مقام معین ہے۔ اور ہم ادائے اطاعت اور منزل خدمت میں صف بستہ کھڑے ہیں اور ہم اسے ہر اس چیز سے منزہ و مبرا جانتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ "صف بستہ ہونے والوں" سے مراد "نماز کی صفوں میں کھڑے ہونے والے" ہیں، چنانچہ "کلبی"

ایک قول یہ بھی ہے کہ "صف بستہ ہونے والوں" سے مراد "نماز کی صفوں میں کھڑے ہونے والے" ہیں، چنانچہ "کلبی" کہتے ہیں "آسمان میں ملائکہ کی صفیں ایسی ہیں جیسے زمین میں اہل دنیا کی صفیں ہیں"۔ "جبائی" کہتے ہیں "صافُّوْنَ" (یعنی صف باندھنے والوں) سے مراد وہ فرشتے ہیں جو فضا میں عبادت اور تسبیح کیلئے اپنے پروں سے صف بستہ ہیں۔ اور "مُسَبِّحُوْنَ" (تسبیح کرنے والوں) سے مراد وہ فرشتے ہیں جو خدا کی تعظیم کی بنا پر اس کیلئے "سُبْحَانَ اللّٰہِ" کہتے ہیں"۔

ملائکہ کی عبادت

حضرتؑ کے کلام میں مذکور "سجود، رکوع، صف اور تسبیح" سے مراد وہی کچھ سمجھنا چاہئے جو ذہن میں متبادر ہوتا ہے یعنی سجدہ کا معنی ایسی چیز پر پیشانی کا رکھنا جس پر سجدہ کرنا صحیح ہوتا ہے، رکوع کا معنی جھکنا، صف کا معنی خط مستطیل پر کھڑے ہونا اور تسبیح کا معنی "سُبْحَانَ اللّٰہِ" وغیرہ کہنا ہے۔ جبکہ شارح بحرانیؒ نے ان معانی کا انکار کیا ہے۔ مطلب کی وضاحت کیلئے ان کی عبارت کو نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں: "سجود، رکوع، صف اور تسبیح، حق کی طرف سے جانی پہچانی عبادات کو کہا جاتا ہے جو خضوع و خشوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کا ایسے معانی پر حمل کرنا ممکن نہیں جو ظاہر میں سمجھے جاتے ہیں کیونکہ زمین پر پیشانی کا رکھنا اور کمر کا جھکانا، ایک ہی مستطیل خط پر کھڑا ہونا اور زبان کا تسبیح وغیرہ سے متحرک کرنا ایسے امور ہیں جن کا دارومدار ان آلات پر ہوتا ہے جو بعض حیوانات کے ساتھ خاص ہیں۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان کو ان کے مذکورہ مراتب پر ان کے ذات کردگار کی عظمت و کبریائی کے سامنے خضوع و خشوع کے معیار اور مرتبہ کے مطابق حمل کیا جائے۔ لفظ "مُلزوم" کا اطلاق "لازم" پر کیا ہے، اس لئے کہ سجود کا لغوی معنی اطاعت وانکساری ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

جب آپ یہ بات سمجھ چکے ہیں تو اب ہم کہتے ہیں کہ: امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ "بعض فرشتے سجدے کی حالت میں ہیں" سے مراد یہ احتمال ہے کہ اس سے ملائکہ مقربین کے مراتب مراد ہوں، اس لئے کہ ان کے درجات دوسرے ملائکہ کے درجات سے کامل تر ہیں۔ لہٰذا ان کے خضوع و خشوع اور عبادت کی نسبت دوسرے ملائکہ کی عبادت اور ان کے خضوع و خشوع سے یوں ہو جیسے سجدے کی نسبت روح سے ہوتی ہے، ......"۔

مصنفؒ کہتے ہیں کہ ان کا یہ نظریہ دو طرح سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ جان چکے ہیں کہ:

اول: یہ کہ موصوف پہلے یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ "ظہور، حقیقت پر دلالت کرتا ہے" اور یہاں پر الفاظ کو اپنے ظاہری معانی سے دوسرے معانی لے جانے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی خاص وجہ نظر آتی ہے۔ بلکہ اس نظریہ کے برعکس ظاہری معنی پر متواتر روایات بھی دلالت کر رہی ہیں، مثلاً:

الف: بحارالانوار میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے اور جو کچھ میں سن رہا ہوں وہ بھی تم نہیں سن رہے! اس لئے کہ آسمان سے گریہ اور شیون کی آوازیں آرہی ہیں اور حق بھی یہی ہے کہ اس سے یہ آوازیں آنی بھی چاہئیں، کیونکہ وہاں پر چار انگشت کی جگہ بھی خالی

نہیں ہے کیونکہ ہر جگہ پر فرشتے اللہ کی بارگاہ میں سر بسجود ہیں"۔

ب: ابن جبیر، عمر سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے سرکار رسالتؐ سے ملائکہ کی عبادت کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ خاموش رہے، اتنے میں جبرائیلؑ تشریف لائے اور کہا: پہلے آسمان والے سر بسجود ہیں اور ان کا یہ سجدہ قیامت تک چلا جائے گا، وہ اپنے سجدے میں کہہ رہے ہیں "سُبْحَانَ ذِيْ الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ" (پاک و منزہ ہے بادشاہت اور حاکمیت کا پورا حق رکھنے والی ذات) دوسرے آسمان والے قیامت تک رکوع کی حالت میں ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں "سُبْحَانَ ذِيْ الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوْتِ" (پاک و منزہ ہے غلبے اور جبروت کی مالک ذات) تیسرے آسمان والے قیامت تک کیلئے قیام کی حالت میں یہ کہہ رہے ہیں "سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَايَمُوْتُ" (پاک ہے وہ زندہ ذات جسے موت نہیں ہے)

ج: انوار نعمانیہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "شب معراج ہم خدا کے فرشتوں میں سے کچھ فرشتوں کے پاس سے گزرے، جنہیں اللہ نے اپنی مرضی کے مطابق خلق فرمایا ہے، جیسا چاہا ان کے چہروں کو خلق فرمایا، انہی کے منہ سے صرف تسبیح اور حمد کی آوازیں نکل رہی تھیں، اور وہ مختلف انداز میں ہر طرف سے تسبیح و تقدیس کی آوازیں بلند کر رہے تھے، یا خوف خدا سے ان سے گریہ و بکا کی آوازیں آرہی تھیں میں نے جبرائیلؑ سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب میں کہا: یہ ایسی حالت میں پیدا کئے گئے تھے جیسا کہ آپؐ دیکھ رہے ہیں! جب سے یہ پیدا ہوئے ہیں ان میں سے کسی نے اپنے ساتھ والے ساتھی سے بات تک نہیں کی، نہ ہی اوپر کو سر اٹھایا ہے اور نہ ہی نیچے کی طرف جھانکا ہے، خدا کے خوف اور خضوع و خشوع کی وجہ سے۔"

چنانچہ میں نے ان فرشتوں پر سلام کیا، تو انہوں نے سر کے اشارے سے میرے سلام کا جواب دیا۔ لیکن اپنے خضوع و خشوع کی بنا پر میری طرف نظر نہیں کی۔ جبرائیل نے ان سے کہا: "یہ پیغمبر رحمت حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کی طرف رسول اور نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اور آپؐ ہی خاتم الانبیا اور سید المرسلین ہیں"۔ جب انہوں نے جبرائیل کے یہ کلمات سنے تو میری طرف منہ کر کے مجھ پر سلام کیا، مجھے خوشخبری دی اور میرے لئے اور میری امت کے لئے خیر کے کلمات ادا کئے"۔

د۔ ایک اور روایت میں ہے کہ: "عرش کے اطراف میں قیام کرنے والے فرشتوں کی ستر ہزار صفیں ہیں جنہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں اور وہ بلند آواز میں تکبیر و تہلیل کہہ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک لاکھ صف ہے جن میں موجود فرشتے تسبیح و تہلیل میں مشغول ہیں............"

علاوہ ازیں اور بھی اس قسم کی بہت سی روایات ہیں جو ایک محقق کیلئے معاون ثابت ہو سکتی ہیں کہ فرشتگان الٰہی رکوع و سجود، تسبیح و تہلیل کے ظاہری معنوں کے ساتھ مشغول ہیں، اس لئے کہ پہلی روایت یہ بتا رہی ہے کہ فرشتے سجدے میں اپنا سر رکھے ہوئے ہیں اور پھر یہ کہ ایسے ساجد فرشتے آسمان دنیا یا پہلے آسمان میں ہیں۔ رکوع کرنے والے دوسرے آسمان میں اور قیام کرنے والے تیسرے میں ہیں، اسی طرح دوسری روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ مذکورہ سے ان کے ایسے معانی مراد ہیں جو عرف عام

میں استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ان الفاظ سے وہ معانی مراد لئے جائیں جس شارح بحرانیؒ نے مراد لئے ہیں تو لازم آئے گا کہ "ساجدین" سے مراد وہ فرشتے ہوں جو خضوع و خشوع کے لحاظ سے تو سب فرشتوں سے کامل واکمل ہوتے ہیں لیکن جگہ اور مکان کے لحاظ سے ان رکوع کرنے والوں سے نیچے ہوتے ہیں جو خضوع و خشوع کے اعتبار سے ان سے کم ہوتے ہیں، اسی طرح باقی اقسام کے بارے میں ہے

اسی طرح شارح بحرانیؒ کا یہ نظریہ بھی باطل ہے جو انہوں نے اپنی شرح میں "ساجدین" کو "مقربین" سے تعبیر کیا ہے اور "راکعین" کو "حاملین عرش" سے اور "صافین" کو "اطراف عرش کو گھیرے ہوئے فرشتے" قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ جتنا خشوع زیادہ ہوگا اتنا ہی درجہ بلند ہوگا، چونکہ سجدہ کرنے والوں کا خشوع، رکوع کرنے والوں سے زیادہ ہوتا ہے لہٰذا وہ رکوع کرنے والوں سے زیادہ بلند مرتبہ ہوں گے۔ اسی طرح رکوع کرنے والے "صف بستہ" فرشتوں سے زیادہ کامل خشوع کے مالک ہوتے ہیں، اسی لئے ان کا مقام ان سے بلند ہوگا۔

اس نظریئے کے بطلان کی وجہ یہ ہے کہ موصوف نے جو بھی دلائل پیش کئے ہیں وہ سب عقلی ہیں جن کی نص کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں اور نص ان دلائل کے خلاف ہے، جیسا کہ تیسری روایت میں ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ملائکہ کی تسبیح بلند آواز کے ساتھ اور زبان کی حرکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ :

ا۔ جب پہلی مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نے ان پر سلام کیا تو انہوں نے سر کے اشارہ کے ساتھ اس کا جواب دیا۔

۲۔ لیکن جب جبرائیلؑ نے انہیں متوجہ کیا تو پھر انہوں نے زبان سے بات بھی کی، سلام بھی عرض کیا اور خوشخبری بھی دی۔

رہی چوتھی روایت تو وہ بھی اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ملائکہ کی صفیں قیام کے ساتھ قائم ہیں، جس طرح کہ ان کی تسبیح بلند آواز کے ساتھ ہو رہی ہے۔

سابق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اعضاء و جوارح بعض ذی حیات کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن شارح بحرانیؒ نے فرشتوں کے بارے میں ان کا انکار کیا ہے، جیسا کہ ان کے ظاہری کلام سے واضح ہے اور یہ بات بھی نہایت ہی تعجب آور ہے، حالانکہ یہ بات ضروریات (واضحات) میں شامل ہے کہ ملائکہ کے ہاتھ بھی ہیں اور پاؤں بھی، شانے بھی ہیں اور آنکھیں بھی، چہرے بھی ہیں اور پر بھی اور دوسرے اعضاء بھی جن کا ثبوت آیات و روایات اور آثار و احادیث میں موجود ہے۔ اور اس حد تک کہ اس کا شمار ضروریات دین میں شامل ہونے کے زیادہ قریب ہے۔

ہاں البتہ جو بات ماننے والی ہے وہ یہ کہ ان کے اعضاء و جوارح ہم انسانوں جیسے کثیف اعضاء و جوارح نہیں بلکہ نورانی اور لطیف ہیں۔ لیکن شارح بحرانیؒ نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ فلاسفہ کے فروعات سے لیا گیا ہے جو نہایت ہی بودے ادہام، ناقص عقول اور ناقابل توجہ استدلال پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے اور دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے مقابلے میں قطعاً قابل اعتبار ہیں۔

۳۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر ملائکہ کا خضوع و خشوع، سجدہ، رکوع، قیام اور تسبیح وغیرہ وہ نہیں ہے جو انسانی اور بشری عبادت میں ان عنوانات کے ساتھ متصور ہیں تو پھر وہ کس عنوان سے خضوع و خشوع کرتے ہیں؟ اگر تو اس سے مراد "خضوع

تکوینی" ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ خضوع تو کائنات کی تمام موجودات میں پایا جاتا ہے، ملائکہ کے ساتھ ہی کچھ مخصوص نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کیلئے خاضع ہے اور اس کی قدرت کے آگے بے چارہ ہے۔ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلاَّ یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ" (بنی اسرائیل / ۱۷) ہر شئے اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ اگر اس سے مراد "خضوع تکلیفی" ہے جیسا کہ ظاہر میں ایسا ہی ہے تو پھر ضروری ہے کہ کسی عنوان کے تحت یہ تکلیفی خضوع ہونا چاہئے! اور اخبار و روایات سے ثابت ہے کہ ان کی عبادت مذکورہ عنوانات میں سے ایک ہی عنوان کے ضمن میں واقع ہوئی ہے۔ اور کوئی بھی نقلی دلیل اس کے علاوہ نہیں ملتی۔ جبکہ نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے عقلی دلائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

علاوہ ازیں خداوند عالم کا یہ قول ہے کہ: "فَسَجَدَ الْمَلاَئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلاَّ اِبْلِیْسَ" (حجر / ۱۵) تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس آیت میں تمام ملائکہ کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے اور کوئی بھی اکائی اور قسم اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لہٰذا اس مقام پر ہم یہی کہیں گے کہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ یا تو اس عنوان کے ساتھ ہوگا جو مرسوم اور متعارف ہے یعنی پیشانی کا رکھنا، تو اس صورت میں شارح بحرانیؒ کے تمام نظریات باطل ہو جاتے ہیں یا پھر اس لحاظ سے کہ آدمؑ کے آگے فرشتوں نے صرف تواضع کا اظہار کیا ہے، تو ایسی صورت میں ظاہر حالات کے خلاف ہوگا۔ اس لئے کہ:

الف: انہوں نے آدمؑ کے سامنے تواضع کا اظہار اور اس کی فضیلت کا اعتراف تو اس وقت کر لیا تھا جب حضرت آدمؑ نے انہیں امتحانی سوالوں کے موقع پر ناموں سے مطلع کر دیا تھا۔

ب: جب ایک قوم کسی دوسری قوم کو مخصوص الفاظ سے مطلع کرتی ہے تو اس سے ان کے وہی معانی مراد ہوتے ہیں جو اس قوم کے نزدیک مرسوم اور جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب سجدہ کا لفظ بولا گیا ہے تو اس سے مراد بھی اس کا شرعی معنی ہی ہوگا۔

علاوہ ازیں بھی بعض روایات مثلاً حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ سجدہ سے مراد وہی ہے جو عام مسلمانوں کے نزدیک ہے۔ مزید بر آں اگر ہم رواداری کے طور پر کچھ نرمی کا ثبوت دیں بھی تو یہی کہیں گے کہ "اکثر مفسرین نے احتمال کے ساتھ سجدہ کے دونوں معانی مراد لئے ہیں۔ اگر فرشتوں کے بارے میں پیشانی رکھنا تصور نہیں کیا جا سکتا تو پھر انہوں نے اس کا احتمال کیوں دیا؟ بلکہ وہ یہ احتمال دینے کی بجائے آیت کو کسی اور معنی میں نص قرار دیتے"۔

۴۔ شارح بحرانیؒ نے یہ احتمال دیا ہے کہ "سجود" سے مراد "ملائکہ مقربین" ہیں اور اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ ان ملائکہ کا درجہ دیگر سب ملائکہ سے کامل تر ہے۔ جس طرح کہ "سجودی خضوع" خضوع کی دیگر تمام اقسام سے افضل ہوتا ہے۔ تو ان کا یہ نظریہ اس لئے صحیح نہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ روایات میں ہے "پہلے آسمان یا آسمان دنیا کے رہنے والے فرشتے سجدہ کناں ہیں اور آسمان میں چار انگشت کے برابر بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پر کوئی سجدہ کناں فرشتہ نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ ان (شارح) کے نزدیک ملائکہ مقربین کا درجہ حاملین عرش کے درجہ سے زیادہ بلند ہے، جبکہ حاملین عرش کا درجہ آسمان اول کے فرشتوں سے کئی حصے بالاتر ہے اور صرف انہی سے نہیں بلکہ تمام دوسرے فرشتوں سے بھی بالاتر ہے۔

۵۔ شارح موصوفؒ ملائکہ مقربین کو جسم و جسمانیت سے منزہ اور مبرا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ نظریہ فلاسفہ کا ہے جن کا اسلام سے کافی حد تک اختلاف ہے، اس بارے میں ہم پہلے بھی کافی حد تک گفتگو کر چکے ہیں۔ اس مقام پر ہم شارح موصوفؒ سے پوچھتے ہیں کہ "آیا جبرائیلؑ ملک مقرب ہے یا نہیں؟" اگر تو وہ کہتے ہیں کہ "نہیں ہے"۔ (اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسا کہیں) تو پھر ہم اس کا جواب قرآن سے دیں گے: کیونکہ قرآن مجید میں حضرت جبرائیلؑ کی توصیف یوں کی گئی ہے:

"اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ" (تکویر / ۱۹ تا ۲۰) بے شک یہ ایک معزز فرشتے کا بیان ہے۔ وہ صاحب قوت ہے اور صاحب عرش کی بارگاہ کا مکین ہے، وہ وہاں قابل اطاعت امانتدار ہے۔ اس آیت میں "مکین" ہونے سے مراد "قرب" ہے، جیسا کہ مفسرین نے اسی معنی کی تصریح کی ہے۔ اور حضرت امام زین العابدینؑ صحیفہ سجادیہ کی ایک دعا میں بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے ہیں "وَجِبْرَائِيْلَ الْاَمِيْنِ عَلٰى وَحْيِكَ الْمُطَاعِ فِيْ اَهْلِ سَمٰوٰاتِكَ الْمَكِيْنِ لَدَيْكَ الْمُقَرَّبِ عِنْدَكَ" (خداوندا! اپنا درود و سلام) جبرائیلؑ (پر بھیج) جو تیری وحی کا امین، تیرے آسمانوں میں قابل اطاعت، تیرے نزدیک اسے قرب حاصل اور تیری بارگاہ میں مقرب ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی روایات ہیں جو اسی معنی پر دلالت کر رہی ہیں، مثلاً "حدیث معراج" میں ہے کہ علی ابن ابراہیم روایت کرتے ہیں کہ: "جبرائیلؑ نے کہا! خدا کی قسم تمام مخلوق سے زیادہ میں اور اسرافیلؑ خدا سے زیادہ نزدیک ہیں....." اگر شارح بحرانیؒ کے بقول کہ: "جبرائیلؑ ملک مقرب ہیں!" اور ان کے ظاہر بلکہ صریح کلام سے بھی یہی بات ثابت ہے جب انہوں نے "امناء وحی" کے بارے میں گفتگو کی ہے تو اسی بات کا اعتراف کیا ہے، تو پھر ہم کہیں گے کہ وہ ملک مقرب تو ہیں لیکن کسی جہت اور مکان میں کیوں نہیں ہیں؟ جبکہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى" (نجم / ۱۳۔۱۴) اور اس نے اسے ایک بار اور بھی دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک۔ اسی طرح قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے: "وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ" (تکویر / ۲۳) اور اس نے فرشتے کو بلند افق میں دیکھا۔

شارح موصوفؒ جبرائیل کی جسمانیت کا انکار کیونکر کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے مشرق و مغرب کو اپنے پروں سے معمور کیا ہوا ہے، اور ان کی جسمانی تدبیر کا کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی کئی غزوات میں نصرت و حمایت کی ہے، آپ کی خلوتوں میں آپؐ کے ہم نشین رہے ہیں، قوم لوطؑ کے شہروں کو اپنے پروں پر اٹھا کر الٹایا ہے، اپنی گرجدار آواز سے قوم ثمود کو ہلاک کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے کہ آسمانوں میں ان کی اطاعت کی جاتی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ وہاں پر ان کا امر و نہی چلتا ہے اور واضح سی بات ہے کہ امر و نہی، تدبیر امور کیلئے ہی ہوتے ہیں۔

۶۔ شارح موصوفؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ: کسی شئے کے باہمی تعلق اور اضافت کیلئے تھوڑی سی مناسبت بھی کافی ہوتی ہے تو اس کا جواب گزشتہ روایت کے تحت دیا جا چکا ہے کہ آسمان میں چار انگلی کے برابر بھی کوئی ایسی جگہ خالی نہیں ہے کہ جہاں پر سجدہ ریز فرشتہ موجود نہ ہو۔ اور اس طرح کی دوسری روایت بھی ہے۔ جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے آسمان میں حقیقی معنی کے لحاظ سے نہ کہ مجازی معنی کے طور پر سجدہ کرنے والے فرشتے موجود ہیں۔

۷۔ یہ جو انہوں نے فرمایا ہے کہ :''اجرام سماوی اور ملائکہ کی اس قسم کے درمیان ایک مناسبت موجود ہے اور وہ ہے علت و معلول یا شرط و مشروط والی مناسبت''۔ ان کی یہ دلیل ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیونکہ آسمان کیلئے ''علت فاعلی'' تو ذات خداوند متعال ہے، ''علت مادی'' پانی یا دھواں ہے یا پھر جھاگ ہے۔ یا پھر نورِ محمدؐ ہے، جیسا کہ جلد اول میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اور ملائکہ میں ان میں سے کوئی بھی علت نہیں پائی جاتی۔ اب رہا یہ قول کہ ''خداوند تعالیٰ علت العلل ہے اور عقول مجردہ آسمانوں کیلئے علت ہیں'' تو یہ فلاسفہ کا مذہب ہے جو ہم امامیہ کے نزدیک باطل ہے۔

خلاصہ کلام، یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ملائکہ اطاعت رب العزت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کی چار قسمیں ہیں: ا۔ سجدہ کرنے والے ۲۔ رکوع کرنے والے ۳۔ صف بستہ اور ۴۔ تسبیح کناں جو کبھی اس سے تھکتے نہیں بلکہ تقویت حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے :''فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ وَ هُمْ لَا يَسْأَمُوْنَ'' (فصلت / ۳۸) جو مخلوق پروردگار میں ہے وہ دن رات اس کی تسبیح کر رہی ہے اور تھکنے کا نام نہیں لیتی۔

آیا فرشتے سوتے بھی ہیں؟

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرشتوں کے اوصاف کے سلسلے میں فرماتے ہیں (ان کی آنکھوں پر نیند نہیں چھاتی) ظاہراً (ھُمْ) کی ضمیر فرشتوں کی تمام اقسام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کی شارح بحرانیؒ نے اس طرح توجیہ کی ہے کہ :''ان پر نیند کا چھا جانا، اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ انہیں نیند آسکتی ہے۔ چونکہ لازم باطل ہے لہٰذا ان کے حق میں ملزوم بھی باطل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ''نیند حواس ظاہرہ کا اپنے کام نہ کرنے کا نام ہے'' کیونکہ حواس ظاہرہ میں، روح نفسانی کا عمل دخل رک جاتا ہے، یا جب یہ حواس تھک جاتے ہیں یا کمزور ہو جاتے ہیں تو پھر یہ روح ان کی طرف واپس آجاتی ہے، جبکہ آسمانی فرشتے ان اسباب و آلات سے منزہ و مبرا ہیں، لہٰذا ضروری قرار پاتا ہے کہ ان کیلئے نیند نہ ہو جب وہ ہوگی ہی نہیں تو ان کو ڈھانپ کیسے لے گی؟''

قطب راوندیؒ فرماتے ہیں کہ :''ان کا یہ کہنا کہ فرشتوں کی آنکھوں پر نیند غالب نہیں آتی، اس بات کا متقاضی ہے انہیں اس قدر تھوڑی سے نیند آسکتی ہے جو انہیں ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی، جبکہ ذات باری تعالیٰ ہی وہ واحد ذات ہے کہ جسے نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند، جبکہ وہ ذات اقدس حی اور زندہ ہے۔ اور یہ اس کی ایک عظیم مدحت ہے''۔ قطب راوندیؒ کے اس نظریئے پر شارح معتزلی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''انہیں اس قدر تھوڑی سی نیند آسکتی ہے جو انہیں ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی'' صحیح نہیں ہے کیونکہ ''نیند'' اور ''ذکر'' کا باہمی اجتماع محال ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ ویسے ہی ناممکن ہے جیسے ان کے کھانا اور پینا، کیونکہ نیند مزاج کے تابع ہوتی ہے اور ملائک (فرشتوں) کا مزاج نہیں ہوتا''۔

اب رہی یہ بات کہ باری تعالیٰ کو اونگھ اور نیند نہ آنا یہ اس کی ایک عظیم مدحت ہے، اس لئے کہ اس کا اس باب سے تعلق ہی نہیں ہے، کیونکہ باری تعالیٰ کو نیند آنا اس کے لئے ذاتی طور پر محال ہے جس سے اس میں کسی طور پر تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ جبکہ فرشتے میں اس صفت کے پیدا ہونے سے اسے ''فرشتگی'' سے خارج کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے جسمانی اجزا میں رطوبت،

یبوست، حرارت اور برودت کو خلق کیا جائے کہ جن کے اجتماع سے "مزاج" بنتا ہے اور نینداسی مزاج کے تابع ہوتی ہے، اور جب تک ملک فرشتہ رہتا ہے اس وقت تک اس کے لئے نیند محال ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ کہتے ہیں کہ مثلاً "پانی ٹھنڈا ہے" یعنی جب تک یہ پانی رہے گا ٹھنڈا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ "استحالہ" کے طور پر ہوا بن جائے یا پھر آگ میں تبدیل ہو جائے، تو وہ ٹھنڈا نہیں رہے گا، کیونکہ اب وہ پانی نہیں رہا۔ ذات باری جل شانہٗ کے لئے یہ بات قطعاً محال ہے کہ اس کی ذات میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ جب تبدیلی واقع نہیں ہوگی تو اسے مطلقاً نیند نہیں آئے گی، جبکہ وہ زندہ اور پائندہ ذات ہے، اور یہی بات اس کی مدحت عظمیٰ کا موجب ہے۔"

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں شارح معتزلی فرشتوں کیلئے نیند کا انکار کرتے ہیں اور محال جانتے ہیں کیونکہ اگر ان کے لئے نیند جائز مان لی جائے تو پھر وہ حقیقت "مَلَکِیَّة" (فرشتگی) سے خارج ہو جائیں گے البتہ قطب راوندیؒ کے کلام سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "فرشتوں کو نیند تو نہیں آتی البتہ اونگھ ضرور آتی ہے جو کہ ذکر الٰہی سے غفلت کا موجب بھی نہیں بنتی"۔ قطب راوندی کے اس نظریہ پر وہ روایت بطور استشہاد پیش کی جا سکتی ہے جسے شیخ صدوقؒ نے داؤد عطار سے اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے ایک دوست نے پوچھا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ فرشتوں کو نیند آتی ہے؟" میں نے کہا: "مجھے نہیں معلوم!" اس نے کہا: "اللہ عزوجل فرماتا ہے "یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ" (انبیاء / ۲۰) دن رات اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور سستی کا شکار نہیں ہوتے۔ پھر اس نے کہا: "آیا میں تمہیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف سے کچھ نہ بتاؤں؟"۔ میں نے کہا: "ضرور بتاؤ!"۔ اس نے کہا: "حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہی سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: "جو بھی زندہ ہے اسے ضرور نیند آتی ہے سوائے ذات رب ذوالجلال کے" اس پر میں نے آنجنابؑ کی خدمت میں عرض کیا: "خداوند عالم تو فرماتا ہے "یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ" (انبیاء / ۲۰) دن رات اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور سستی کا شکار نہیں ہوتے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: "ان کا سانس لینا بھی یہی تسبیح ہے"۔

اس طرح سے شارح معتزلی کے اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہو گیا جو انہوں نے کہا کہ: "اگر وہ تھوڑا سا بھی سو جائیں تو وہ نیند کی اس مدت میں غافل ہو جائیں گے۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کے اس قول "ان کی آنکھوں پر نیند غالب نہیں آتی" اور علل الشرائع کی اس روایت کو جمع کرنا بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علل الشرائع میں محمد بن علی بن ابراہیم بن ہاشم سے روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملائکہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ "آیا وہ کھاتے، پیتے اور شادی کرتے ہیں؟" فرمایا: "نہیں! بلکہ وہ نسیم عرش کے ساتھ زندہ ہیں!" پوچھا گیا: "پھر ان کی نیند کی کیا وجہ ہے؟" فرمایا: "تاکہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان فرق باقی رہے! کیونکہ صرف خدا ہی وہ ذات ہے جسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند"۔

ان تمام روایات کو ملا کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جن روایات میں نیند کا اثبات ہے مثلاً یہ اور اس سے ملتی جلتی دوسری روایات تو ان میں نیند کو ایسی نیند پر حمل کیا جائے گا جو صرف اونگھ کی حد تک ہو اور ذکر و تسبیح سے مانع نہ ہو۔ اور حضرت امیرؑ کے اس

کلام کو کہ "ان کی آنکھوں پر نیند غالب نہیں آتی" ایسی نیند پر حمل کیا جائے گا جو اس قدر غالب ہو کہ غفلت کا موجب بن جائے۔ یہ ایسے ہے جیسے حضرت رسالتمآبؐ کے خواص میں سے یہ بات بھی ہے کہ آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن دل جاگتا رہتا تھا کہ کب وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو نیند آتی بھی تھی تو آپؐ کے اور مراقبے کے درمیان حائل نہیں ہوتی تھی اور کار رسالت میں خلل نہیں ڈالتی تھی۔ واللہ اعلم۔

(نہ ان کی عقلوں میں بھول چوک پیدا ہوتی ہے، نہ ان کے بدنوں میں سستی آتی ہے اور نہ ان پر نسیان کی غفلت طاری ہوتی ہے)۔

سہو، نسیان اور غفلت میں فرق

سہو۔ کسی چیز کا "قوت ذاکرہ" (یادداشت) سے دور ہونا اور مٹ جانا لیکن "قوت حافظہ" میں اس کا باقی رہنا، کہ جب بھی ذہن اس کی طرف متوجہ ہو جائے تو اسے پالے۔

نسیان۔ کسی چیز کا قوت ذاکرہ اور قوت حافظہ سے بیک وقت ایسا مٹ جانا کہ اس کے حصول کیلئے از سر نو کوشش کرنی پڑے،

غفلت۔ دونوں مذکورہ صورتوں سے عام ہے۔

جب مذکورہ تینوں امور کا تعلق انسانی قُوا سے ہے تو ملائکہ سے ان کی نفی کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ جو معروضی امور انسان میں ہیں وہ ملائکہ میں نہیں ہیں۔ اور اگر حضرت امیرؑ ان ملائکہ سے غفلت کی نفی کا ذکر فرما دیتے جو کہ سہو اور نسیان سے زیادہ عام ہے تو بھی کافی تھا کیونکہ عام کے سلب ہو جانے سے خاص سلب ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان دونوں کا ذکر کرنا تاکید مزید کیلئے ہے۔ ان اجسام سے سستی کی نفی اس لئے ہے کیونکہ جب اعضاء بدن کام کرتے کرتے تھک کر کمزور ہو جاتے ہیں اور انہیں آرام و استراحت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس وقت وہ ست پڑ جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی سستی کا تعلق حیوانی مزاج کے ساتھ ہوتا ہے، لہٰذا اگر اسے فرشتوں سے نفی کیا گیا ہے تو ایسا کرنا ضروری بھی تھا اس لئے کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: "يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ" (انبیاء / ۲۰) دن رات اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور سستی کا شکار نہیں ہوتے۔

فرشتے وحی کے امین ہیں

(اور) دوسری قسم (ان میں سے کچھ وحی الٰہی کے امین ہیں) اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے اللہ کے پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں۔ "امناء" جمع ہے "امین" کی اور "امین" اسے کہتے ہیں "جس کے سپرد کوئی چیز کی جائے اور اس کے ذمہ یہ فرض سونپا جائے کہ اسے اس کے مستحق تک پہنچائے اور وہ ایسا کرے"۔ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے "ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ" (تکویر / ۱۹ تا ۲۰) وہ صاحب قوت ہے اور صاحب عرش کی بارگاہ کا مکین ہے۔ وہ وہاں قابل اطاعت امانتدار ہے۔

روایت میں ہے کہ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جبرائیلؑ سے فرمایا: "خداوند عالم نے آپ کی کیا ہی بہترین تعریف کی ہے کہ فرمایا "ذِيْ قُوَّةٍ ......" تو آپ کی ایسی کونسی طاقت ہے اور ایسی کونسی امانتداری ہے جس کی بنا پر آپ کی اس قدر تعریف کی گئی ہے؟" جبرائیلؑ نے جواب میں کہا: "میری طاقت یہ ہے کہ مجھے خدا نے قوم لوطؑ کے شہروں کی تباہی کیلئے بھیجا جن

کی تعداد چار تھی اور ہر شہر میں چار سو تکڑے لڑاکے جوان رہتے تھے اور چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی، تو میں نے ان شہروں کو نچلی زمین سے اٹھایا اور اس قدر بلندی تک لے گیا کہ آسمان والوں نے ان کی مرغوں کی بانگیں اور کتوں کی بھونک کو سنا، پھر میں انہیں زمین پر لے آیا، جبکہ میری امانتداری کی کیفیت یہ ہے کہ مجھے جو بھی حکم الٰہی ملا میں نے اسے مطلوبہ افراد تک پہنچایا اور ذرہ برابر اس میں الٹ پھیر نہیں کیا"۔ اب رہی یہ بات کہ فرشتے وحی کے امین کیونکر ہیں؟ تو اس بارے میں بہت سی روایات موجود ہیں، مثلاً کتاب "الاختصاص" میں اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عبداللہ بن سلام نے پیغمبر اکرمؐ سے جو سوالات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "آپ کو کس نے خبر دی ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جبرائیلؑ نے" پوچھا "جبرائیلؑ نے کس سے؟" فرمایا "میکائیلؑ سے" پوچھا میکائیلؑ نے کس سے؟" فرمایا: "اسرافیلؑ سے" پوچھا "انہوں نے کس سے؟" فرمایا "لوح محفوظ سے!" پوچھا "اس نے کس سے؟" فرمایا "قلم سے!" پوچھا "قلم نے کس سے؟" فرمایا "رب العالمین سے!" اس نے کہا "آپ نے سچ فرمایا!"۔ اسی طرح کی ایک اور روایت ہے جسے شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے کتاب "عیون اخبار الرضا" میں اسناد کے ساتھ علی بن ہلال سے روایت کی ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے آپؑ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے آپؑ امام محمد باقر علیہ السلام سے آپؑ امام زین العابدینؑ سے آپؑ امام حسین علیہ السلام سے آپؑ علی بن ابی طالب علیہ السلام سے، آپؑ پیغمبرؐ سے آپؐ جبرائیلؑ سے وہ میکائیلؑ سے، وہ اسرافیلؑ سے وہ لوح سے اور وہ قلم سے روایت کرتے ہیں کہ خداوند عزوجل نے فرمایا: "وِلَايَةُ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ (عَلَيْهِ السَّلَامِ) حِصْنِيْ وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اَمِنَ مِنْ عَذَابِيْ" "علی بن ابی طالبؑ کی ولایت میرا قلعہ ہے جو بھی میرے قلعہ میں داخل ہو گا وہ میرے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے جناب اسرافیلؑ کی حضرت رسالتمآبؐ کے سامنے تعریف کرتے ہوئے کہا: "یہ رب تعالیٰ کے دربان ہیں اور اس کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ اسی کے قریب ہیں اور سرخ یاقوت کی لوح ہمیشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہے، چنانچہ جب رب تعالیٰ کوئی وحی فرماتا ہے تو وہی لوح ان کی پیشانی کو آن چھوتی ہے اور وہ اس کو دیکھ کر فوراً ہماری طرف بھیج دیتے ہیں اور ہم فوراً اسے آسمان اور زمین میں لے آتے ہیں"۔ روایات کا اختلاف شاید کیفیتوں کے اختلاف پر محمول ہے یا پھر مقامات کے اختلاف پر۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے جناب جبرائیل سے پوچھا: "آپ وحی کہاں سے لیتے ہیں؟" عرض کیا: "اسرافیلؑ سے!" پوچھا: "وہ کہاں سے لیتے ہیں؟" کہا: "روحانیون میں سے ایک فرشتے سے!" آپؐ نے پھر پوچھا کہ: "وہ کس سے لیتے ہیں؟" کہا: "اس کے دل میں ڈال دی جاتی ہے!"۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں: فرشتوں کی "امناء وحی" کی یہ قسم درحقیقت ان کی سابقہ اقسام میں داخل ہے اور امام علیہ السلام نے اسے یہاں پر ایک خصوصی وصف یعنی وحی و رسالت کے وصف کے حامل ہونے کی وجہ سے دوبارہ ذکر فرمایا ہے۔

(اور) چونکہ فرشتے حق سبحانہٗ و تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان اس کے خطابات ان تک پہنچانے کیلئے واسطہ ہوتے

ہیں، اس کے پوشیدہ علم کو ان تک واضح طور پر پہنچاتے ہیں، لہذا ان کے بارے میں حضرتؑ نے خوبصورت تعبیر پیش فرمائی ہے کہ (اس کے رسولوں کی طرف پیغام رسانی کیلئے زبان حق ہیں) کیونکہ جس طرح زبان انسان کے مافی الضمیر کو کھول کر بیان کرتی ہے، اسی طرح فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ علم کو ان تک منتقل کرتے اور اسے کھول کر بیان کرتے ہیں لہذا انہیں بھی "زبان" کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے (اور اس کے قطعی فیصلوں اور فرمانوں کو لے کر آنے جانے والے ہیں) اس میں "مُخْتَلِفُونَ" کا کلمہ "اِختلاف" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "آنا جانا" چنانچہ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ بعض خطبات میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے اور "زیارت جامعہ" میں ائمہ اطہار علیہ السلام کو "مُخْتَلَفُ المَلَائِکَۃِ" یعنی ملائکہ کے آنے جانے کا محل قرار دیا ہے۔ البتہ اس کی مزید تفصیل ۱۰۸ویں خطبہ کی آخری فصل میں بیان کی جائے گی۔

قضا کیا ہے؟

"قضا" کے دس معانی ہیں، جن میں سے ایک "حکم" بھی ہے، اور یہاں پر یا تو قضا "حکم" کے معنی میں ہے تو پھر ایسی صورت میں لفظ "اَمْرِہٖ" میں امر کا عطف قضا پر ہوگا۔ گویا یہ قسم، خاص کے عام پر عطف کی قسم سے ہوگا۔ یا پھر "امر" کے معنی میں ہے جیسا کہ اس کی تفسیر اس آیت میں کی گئی ہے کہ "وَقَضٰی رَبُّكَ اَنْ لَّاتَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" (بنی اسرائیل / ۲۳) اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا

ایسی صورت میں اس کا عطف، عطف تفسیر و تبیین ہوگا۔ بہر صورت معنی جو بھی ہو اس امر سے مراد "امر تکلیفی" ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ "قضا" سے مراد وہی ہے جو "قدر" کے ہم پلہ لفظ ہے، اور "امر" سے مراد وہ امور مقدرہ ہیں جو عالم سفلی میں رونما ہوتے رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں حضرت امیرؑ کے فرمان کے معنی ہوں گے: "وہ فرشتے خدا کے مقتضیات اور مقدرات کو لے کر آتے جاتے رہتے ہیں"۔ ہم نے مصدر بمعنی مفعول قرار دیا ہے کیونکہ قضا کا مصدری معنی یہ ہے کہ "حق تعالیٰ کا موجودات اور تمام اشیاء کی صورتوں کو معقول اور مفصل طور پر اس طرح ایجاد کرنا کہ لوح محفوظ میں ہر طرح کی تبدیلی سے محفوظ رہیں"۔ "لوح محفوظ" ہی "ام الکتاب" ہے اور اسے "علم ملزم" بھی کہتے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ وہ معنی ہے کہ جس کا فرشتوں کے لانے یا لے جانے سے تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس میں تدبیر کرتے ہیں، بلکہ ان کی تدبیر ان موجودہ تقاضوں میں ہوتی ہے جو لوح محفوظ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں...

وہ تقاضے ان اشیاء کے وجود کے بالتفصیل اور یکے بعد دیگرے موجود ہونے کا دوسرا نام ہے جو اپنے سفلی مواد میں ہوتے ہیں اور "صحائف علویہ" میں ثابت ہونے کے بعد ان فرشتوں کے ہاتھوں تک آن پہنچتے ہیں جنہیں "مدبرات امر" کہا جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَ مَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" (حجر / ۲۱) تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم معین اندازے کے سوا نازل نہیں کرتے۔

تدبیر امر کرنے والے فرشتے

اسی طرح ملائکہ کی اسی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے: "فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا" (النازعات / ۵) ان فرشتوں کی قسم جو امور کی تدبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر مجمع البیان میں عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کی گئی ہے کہ "مدبرات" یعنی تدبیر امر کرنے والے فرشتوں سے مراد چار فرشتے ہیں ا۔ جبرائیلؑ ۲۔ میکائیلؑ ۳۔ ملک الموتؑ اور ۴۔ اسرافیل علیہم السلام ہیں جو تمام دنیا کے امور کو چلاتے ہیں۔ پس: **جبرائیل**ؑ ہوا اور اس کے لشکروں پر مؤکل ہیں، **میکائیل**ؑ بارش کے قطروں اور نباتات اگانے پر مؤکل ہیں، **ملک الموت**ؑ اور **اسرافیل**ؑ ان تمام فرشتوں کیلئے احکام الٰہی لانے پر مؤکل ہیں۔

البتہ یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ "تدبیر امر" صرف ان چار فرشتوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اور بھی فرشتے ہیں جن کی تفصیل آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگی، یہاں پر تو صرف ہم نے آیت کے معانی کی وضاحت کے طور پر اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اسی طرح قضا اور اس کے تقاضوں کے معانی کا علم بھی ہو گیا ہے اور ان فرشتوں کا بھی جو قضا کو لے کر اترتے ہیں۔

قدر کیا ہے؟

اب رہی بات "قدر" کی تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا مرتبہ "قضا" سے کم ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ "موجودات کی تمام وہ صورتیں "لوح محو و اثبات" میں اس طرح موجود ہوتی ہیں جن میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے" اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اشارہ فرمایا ہے کہ "یَمْحُوا اللّٰهُ مَایَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ" (رعد / ۳۹) اللہ جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا فرماتا ہے اور ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: "یہ وہ کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے"۔ اسی کیلئے احادیث میں بتایا گیا ہے کہ "قضا" کو دعائیں پلٹا دیتی ہیں اور وہ دعا اسی میں لکھی ہوئی ہوتی ہے جس سے قضائیں بدل جاتی ہیں لیکن جب قضا، ام الکتاب تک جا پہنچتی ہے تو پھر دعا کارگر نہیں ہوتی"۔ ہمارے تمام عرائض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے کلام میں قضا سے دو طرح کے امور مراد لئے ہیں ا۔ امر موقوف ۲۔ امر محتوم۔ اور اسی سے ملتی جلتی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی وہ روایت ہے کہ جس میں آپؑ نے فرمایا ہے کہ: "امر دو طرح کا ہوتا ہے ا۔ امر موقوف ۲۔ امر محتوم، جو محتوم ہوتا ہے وہ حتمی ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوتا اور جو موقوف ہوتا ہے اس کے بارے میں خدا جو چاہے اپنی مشیت کے تحت تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

شب قدر میں ملائکہ کا نزول

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کے اس قول "مُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهٖ وَ قَدْرِهٖ" یعنی اس کے فیصلوں اور فرمانوں کو لے کر آنے جانے والے ہیں، سے مراد یہ ہو کہ "وہ اللہ کی طرف سے قضا و قدر لے کر پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان کے آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے" کیونکہ ائمہ اطہارؑ کے اوصاف میں یہ بات بھی ہے کہ وہ "مختلف ملائکہ" ہیں اور اسی بات کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے: "تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

مِنْ کُلِّ اَمْرٍ "(سورہ قدر / ۴) لیلۃ القدر میں ملائکہ اور روح اپنے رب کے اذن کے ساتھ ہر امر لے کر نازل ہوتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب شب قدر آتی ہے تو فرشتے، روح اور تحریر کرنے پر مامور فرشتے آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور وہ اس سال رونما ہونے والی تمام قضاؤ قدر کو لکھ دیتے ہیں۔ پس جب خداوند عالم چاہتا ہے کہ کسی چیز کو مقدم کردے یا مؤخر کردے تو فرشتے کو حکم دیتا ہے اسے مٹا کر دوسرا حکم لکھ دیتے ہیں"۔ مفسر قمیؒ فرماتے ہیں"، ملائکہ اور روح القدس امام زمان کی خدمت میں نازل ہوتے ہیں اور تمام نوشتہ جات ان کے سپرد کر دیتے ہیں"۔ اس بات کی شاہد کافی کی وہ روایت ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے بیان کی گئی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: "خداوند عزوجل لیلۃ القدر کے بارے میں فرماتا ہے "فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ "(دخان / ۴۴) اس سے مراد یہ ہے کہ اس رات میں ہر محکم اور پختہ امر نازل ہوتا ہے، کیونکہ "حکیم" اور "محکم" دو علیحدہ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے۔......... اور لیلۃ القدر میں ہر محکم امر ولی امر کے پاس نازل ہوتا ہے اور سال بھر کے امور میں اس کی اپنی ذات کے امور بھی اور لوگوں کے بارے میں بھی تمام امور ہوتے ہیں، اور پھر یہ بھی ہے کہ ولی امر کیلئے اس کے علاوہ، علم الٰہی کے ذریعہ روزانہ خاص، مکنون اور عجیب امور کی تجدید بھی ہوتی رہتی ہے.......... "پھر آپؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ کَلِمَاتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ " (لقمان / ۲۷) اور اگر روئے زمین پر تمام درخت قلم بن جائیں، سمندر ان کیلئے سیاہی بن جائیں اور ان میں سات دیگر سمندروں کا اضافہ کردیا جائے تو یہ سب کے سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلمات الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔

کافی ہی میں حمران، حضرت امام محمد باقرؑ ہی سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "شب قدر میں آنے والے سال تک کیلئے ہر چیز مقدر کردی (تقدیر میں لکھ دی) جاتی ہے چاہے وہ خیر ہوتی ہے یا شر، اطاعت ہوتی ہے یا معصیت، مولود ہوتا ہے یا رزق اور موت۔ پس اس سال جو کچھ کہ قضاؤ قدر میں آجاتا ہے وہ حتمی ہوتا ہے اور خداوند عزوجل کی مشیت اس میں کارفرما ہوتی ہے"۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مذکورہ تمام تقدیریں ملائکہ کو بتادی جاتی ہیں اور وہ یہ تقدیریں پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کے پاس اسی رات میں لے آتے ہیں، ورنہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ "تقدیر تو ازل سے ابد تک ام الکتاب میں درج ہو چکی ہے"۔

فرشتوں کے بارے میں دیگر گفتگو

یہ تو تھی قضاؤ قدر کے بارے میں کچھ گفتگو، اب دیکھنا یہ ہے کہ قضا اور امر کو لے کر آنے جانے والے فرشتے سارے کے سارے ہوتے ہیں یا نہ بلکہ ان میں سے بعض ہوتے ہیں؟ چنانچہ بنابر روایت، حاکم نیشاپوری کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کا جو یہ قول ہے "تَنَزَّلُ الْمَلٰئِکَةُ " تو یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سارے فرشتے نازل ہوں، چنانچہ یا تو وہ آسمان دنیا پر اترتے ہیں یا زمین پر۔ اور یہ قول اکثر مفسرین کا ہے۔ بہر حال چاہے وہ آسمان اول پر اترتے ہیں یا زمین پر نازل ہوتے ہیں، چونکہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی بھی جگہ ان کیلئے ناکافی ہوتی ہے اور سب یک وقت اس میں نہیں اترتے بلکہ فوج فوج (گروہ گروہ) ہو کر آتے اور جاتے رہتے

ہیں جیسے حجاج اپنی کثرت تعداد کی وجہ سے خانہ کعبہ میں ٹولی ٹولی ہو کر آتے اور اس سے نکلتے رہتے ہیں"۔

لیکن اگر ظاہر میں دیکھا جائے تو امیر المؤمنینؑ کے کلام میں "مِنۡهُمۡ" کا لفظ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کام کرنے والے بعض فرشتے ہوتے ہیں۔ اور یہی بات حضرت امام محمد باقرؑ کے کلام سے بھی ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ آنجنابؑ نے ایک طویل گفتگو کے دوران ارشاد فرمایا"......جب لیلۃ القدر آتی ہے تو کچھ ملائکہ ولی امر کے پاس نازل ہوتے ہیں......"۔

روح القدس کے بارے میں تحقیق

بہت سی روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ بھی شب قدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے ہمراہ ہوتے ہیں اور سورہ قدر کی آیہ شریفہ کی نص بھی یہی بتاتی ہے کہ "روح القدس" بھی ان میں شامل ہے، اور بعض مقامات پر "روح الامین" کی تفسیر "جبرائیلؑ" سے کی جاتی ہے، لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ "روح القدس" اور جبرائیلؑ مختلف فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "روح، جبرائیلؑ سے بہت بڑا ہے، جبرائیل کا شمار ملائکہ میں ہوتا ہے اور روح ایک مخلوق ہے جو فرشتوں سے بھی بڑی ہوتی ہے، آیا خداوند تبارک و تعالیٰ نہیں فرماتا: "تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَ الرُّوحُ ......"۔

صحیفہ کاملہ کی شرح میں ہے کہ ایک شخص حضرت امیرؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور "روح" کے متعلق دریافت کیا کہ "آیا وہ جبرائیلؑ ہیں؟" حضرتؑ نے فرمایا "جبرائیلؑ ملائکہ میں سے ہیں اور روح، جبرائیل کے علاوہ ہے" اس نے کہا "آپؑ نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے، یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ روح، جبرائیل کے علاوہ ہے!" حضرتؑ نے فرمایا "تم گمراہ ہو اور گمراہوں سے روایت کرتے ہو۔ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے پیغمبر اکرمؐ سے ارشاد فرماتا ہے "اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ" (نحل /۱) خدا کا حکم پہنچ گیا ہے لہٰذا اس کیلئے جلدی نہ کرو، اللہ اس سے منزہ و برتر ہے کہ اس کیلئے شریک قرار دیئے جائیں، روح کے ساتھ ملائکہ کو اپنے حکم کے ساتھ نازل کرتا ہے۔" لہٰذا روح، جبرائیلؑ کے علاوہ ہے"۔ حضرت امیرؑ ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ: "روح کے ستر ہزار چہرے ہیں، ہر چہرے کے منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں اور ہر زبان کیلئے ستر ہزار قسم کی مختلف بولیاں ہیں اور وہ ان تمام بولیوں کے ساتھ خداوند تبارک و تعالیٰ کی تسبیح کرتا رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو دوسرے فرشتوں کے ساتھ محو پرواز ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے عرش کے علاوہ اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز پیدا نہیں کی۔ اگر وہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو ایک لقمہ بنا کر نگل جائے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، پس پاک ہے وہ ذات کردگار جو ہر شئے پر قادر ہے"۔ ان دونوں روایات کی مانند بحار الانوار میں اور بھی روایات موجود ہیں۔

بندوں کے محافظ فرشتے

(اور) تیسری قسم (ان میں سے کچھ اس کے بندوں کے نگہبان ہیں) ظاہری عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بندگان خدا کو ہلاکتوں اور تباہیوں سے بچاتے ہیں تا کہ وہ جو بندوں کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے کچھ فرشتوں کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے "لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ

أمرِ اللهِ "(رعد/۱۱) انسان کیلئے کچھ خدائی مامورین ایسے ہیں جو پے درپے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے (غیر حتمی) حوادث سے اسے محفوظ رکھتے ہیں۔

مجمع البیان میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ: "وہ ایسے ملائکہ ہیں جو ان کو ہلاکتوں سے بچاتے ہیں اور یہاں تک ان کی حفاظت کرتے ہیں کہ انہیں تقدیر تک جا پہنچاتے ہیں"۔ صافی میں علی بن ابراہیم سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے سامنے کسی شخص نے یہ آیت پڑھی تو آپؑ نے اس سے فرمایا: "کیا تم عرب نہیں ہو؟ پیچھے سے آنے والے آگے کیسے ہوسکتے ہیں؟ پیچھے سے آنے والے تو پیچھے ہی ہونگے" اس نے عرض کیا "میں آپؑ کے قربان جاؤں! تو پھر یہ آیت کیسے ہوگی؟" آپؑ نے فرمایا "دراصل یوں ہے کہ کچھ "معقبات" فرشتے ایسے ہیں جو ان کی پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں اور "رقیب" ایسے ہیں جو ان کو آگے کی طرف سے امر خداوندی کے مطابق انہیں بچاتے ہیں اور کون ہوسکتا ہے جو امر خداوندی کے مطابق کسی چیز کی حفاظت کرے؟ وہ صرف وہی ملائکہ ہی ہیں جو لوگوں پر مؤکل ہیں"۔ تفسیر عیاشی میں بھی اسی طرح ہے، حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ "امر اللہ" سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کو حکم الٰہی کے مطابق کنویں میں گرنے یا اس پر دیوار گرنے (جیسی مصیبتوں) سے بچاتے رہتے ہیں لیکن جب تقدیر الٰہی کا نزول ہوتا ہے تو وہ درمیان سے ہٹ جاتے ہیں اور اسے تقدیر کے حوالے کردیتے ہیں اور دو فرشتے دن کو اور دو رات کو اس کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے ان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے"۔

جنت اور پاسبانان جنت

(اور جنت کے دروازوں کے پاسبان ہیں) یعنی ان کے ذمہ یہ کام ہوتا ہے کہ وہ جنت کے دروازوں کو کھولتے یا بند کرتے ہیں اور جنہیں بہشت جانے کی اجازت ہوتی ہے انہیں بہشت میں پہنچاتے ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کل کتنی بہشتیں ہیں؟ چنانچہ، جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد آٹھ ہے وہ اس طرح کہ:

۱۔ جنت نعیم ۲۔ جنت فردوس ۳۔ جنت خلد ۴۔ جنت ماویٰ
۵۔ جنت عدن ۶۔ دار السلام ۷۔ دار القرار ۸۔ جنت، جس

کی فقط چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے (بعض کتابوں کے مطابق اس کا نام جنت وسیلہ ہے)

اسی طرح ان کے دروازے بھی آٹھ ہیں جیسا کہ بعض کتب روایات میں ہیں وہ یوں:

۱۔ باب توبہ ۲۔ باب زکوٰۃ ۳۔ باب صلوٰۃ (نماز) ۴۔ باب امر و نہی
۵۔ باب حج ۶۔ باب ورع (پرہیزگاری) ۷۔ باب جہاد ۸۔ باب صبر

شیعیان علیؑ اور جنت

تفسیر صافی میں کتاب الخصال سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے آباؤ اجداد علیہم السلام کے ذریعہ سے

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک دروازے سے انبیا اور صدیقین داخل ہوں گے، ایک سے شہدا اور صالحین اور پانچ دروازوں میں سے ہمارے شیعہ اور محبّ داخل ہوں گے۔ میں پل صراط پر کھڑا دعا مانگ رہا ہوں گا اور کہوں گا: پروردگارا! میرے شیعوں، حبداروں، دوستوں، انصاروں اور ان لوگوں کو صحیح وسالم رکھ جو مجھ سے دنیا میں محبت کرتے تھے۔ اتنے میں عرش کے درمیان سے آواز پہنچے گی (یا علیؑ) تمہاری دعا منظور ہوئی اور تمہارے شیعوں کے بارے میں شفاعت قبول ہوئی۔ تو اس وقت میرے شیعوں، موالیوں، ناصر ومددگاروں اور میرے لئے قول اور فعل کے ذریعہ لڑنے والوں میں سے ہر ایک شخص اپنے پڑوسیوں اور رشتہ داروں میں سے ستر ہزار انسانوں کی شفاعت کرے گا۔ ایک دروازے سے وہ باقی مسلمان داخل ہوں گے جو کلمہ توحید پڑھتے تھے لیکن ان کے دل میں ہم اہل بیتؑ کے بارے میں رائی کے دانے کے برابر بھی بغض نہیں تھا"۔

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: "خدا کے بارے میں نیک گمان رکھو اور جانے رہو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ہر دروازے کی فقط چوڑائی چار سو سال کی مسافت ہے"۔

جنت کے پاسبانوں اور خازنین کے بارے میں سورہ زمر میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے "وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ" (زمر/ ۳۹) اور جن لوگوں نے تقویٰ الٰہی اختیار کیا وہ گروہ درگروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، جب وہ اس کے قریب پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھل جائیں گے اور اس کے نگہبان کہیں گے تم پر سلام ہو، یہ نعمتیں تمہیں مبارک ہوں، تم جنت میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو۔

جنت میں داخل ہونے کی کیفیت

کتاب انوار نعمانیہ میں محشر کے بارے میں گفتگو کے سلسلہ میں ہے کہ "...... تو جب وہ رضوان خدا کے پاس پہنچیں گے اور وہ جنت کے دروازے پر بیٹھا ہو گا، اس کے ساتھ ستر ہزار ملائکہ ہوں گے اور ہر ایک فرشتہ کے ساتھ ستر ہزار اور فرشتے ہوں گے، وہ ان کی طرف دیکھے گا کہ سیاہ بدن اور لمبے بالوں ...... کے ساتھ وہاں پر پہنچ چکے ہوں گے، رضوان انہیں دیکھ کر کہے گا: "تم اس کیفیت کے ساتھ جنت میں کیسے داخل ہو گے؟ اور کس طرح حور العین کے ساتھ بغل گیر ہو گے؟" پھر وہ ملائکہ کی ایک جماعت کو حکم دے گا جو اس کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کہے گا "ان مؤمنین کو بہشت کی دیواروں کے ساتھ آب حیات کے چشموں کی طرف لے جا کر نہلاؤ دھلاؤ" جب وہ اس سے نہا دھو لیں گے تو ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہے ہوں گے ان کے تمام بال جھڑ چکے ہوں گے...... اور ان کے دلوں سے نفاق، حسد، کذب، بری عادتیں اور مذموم صفات نکل چکے ہوں گے اور وہ صاف ستھرے ہو چکے ہوں گے۔ حتیٰ کہ بلندی درجات اور اختلاف مراتب پر بھی ایک دوسرے سے حسد نہیں کریں گے۔ ہر ایک شخص چودہ سال کا نوجوان نظر آئے گا، اسے یوسفؑ کا حسن، داؤدؑ کی لحن اور ایوبؑ کا صبر مل چکا ہو گا، جب وہ جنت کے دروازے پر

پہنچیں گے تو دروازے پر گھنٹی لگی ہوگی اور جب بھی کوئی شخص اندر جانا چاہے گا تو گھنٹی خود بخود بجنے لگ جائے گی اور اس سے ''یا علی یا علی'' کی آواز آئے گی اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر نئے آنے والے شخص کیلئے اس کی علیحدہ آواز ہوگی جو پہلی آواز سے مختلف ہوگی جس سے آنے والے مؤمن سے متعلقہ افراد، اس کے بہشت کے گھر کے خدمت گاروں اور حور العین کو پتہ چل جائے گا کہ فلاں مؤمن آرہا ہے لہذا وہ اس کے استقبال کیلئے جنت کے دروازے تک آجائیں گے''۔

رضوان جنت، پاسبانان بہشت، جنت اور ناقہ ہائے بہشت کی تفسیر کی طرف کتاب روضۃ الکافی میں اشارہ کیا گیا ہے جسے شیخ کلینیؒ نے علی بن ابراہیم سے، انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے ابن محبوب سے، انہوں نے محمد بن اسحاق مدنی سے، انہوں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ: ''جناب رسول خداؐ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول ''يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا'' (مریم / ۸۵) جس دن ہم متقین کو وفد کی صورت میں خدائے رحمٰن کی طرف رہنمائی کریں گے۔ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا ''یا علیؑ! یہ وفد پیدل نہیں ہوگا بلکہ سواریوں پر سوار ہوگا اور وہ ایسے لوگ ہوں گے جو (اس دنیا میں) تقویٰ اختیار کئے ہوئے تھے جن سے اللہ کی محبت ہوگی اور وہ خاصان خدا میں محسوب ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے راضی ہوگا اسی لئے انہیں ''متقین'' سے موسوم کرے گا''۔ پھر فرمایا ''یا علیؑ! مجھے اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ اور جان کو پیدا کیا وہ متقی لوگ جب اپنی قبروں سے باہر آئیں گے تو فرشتے بہشت سے ناقائیں لے کر ان کے استقبال کو آجائیں گے، وہ عزت کی ناقائیں ہوں گی ان پر سونے کے ہودج ہوں گے، در اور یاقوت کے جواہر سے مرصع ہوں گی، ان پر استبرق اور سندس کی چادریں پڑی ہوں گی، ان کی نکیلیں جندل ارجوان کی ہوں گی جب وہ ان پر سوار ہوں گے تو وہ پرواز کر کے انہیں عرصہ محشر میں لے آئیں گی، ان میں سے ہر ایک شخص کے ساتھ دائیں بائیں اور آگے پیچھے ایک ہزار فرشتے ہوں گے جو انہیں عزت واحترام اور جلوس کی صورت میں بہشت میں یوں لے جائیں گے جس طرح دلہن کو اس کے نئے گھر لے جایا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ جنت کے صدر دروازے تک پہنچ جائیں گے۔ جنت کے صدر دروازے پر ایک درخت ہوگا جس کا ایک ایک پتہ اس قدر وسیع و عریض ہوگا جس کے سایہ میں ایک ہزار آدمی بیٹھ سکے گا۔ اس درخت کے داہنی جانب صاف ستھرا اور شفاف چشمہ ہوگا، جس سے انہیں پانی پلایا جائے گا۔ اس کے پینے سے ان کے دلوں سے رہا سہا حسد بھی دور ہو جائے گا اور ان کی جلد پر سے بال جھڑ جائیں گے۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا'' (دہر / ۲۱) ان کے رب نے انہیں پاک و پاکیزہ شربت پلایا۔ یعنی اس پاکیزہ چشمے سے۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں: ''پھر ان کا ایک اور چشمے کی طرف رخ کر دیا جائے گا جو درخت کی بائیں جانب ہوگا اور وہ اس سے غسل کریں گے، اسے چشمہ ''آب حیات'' کہتے ہیں پس اس کے بعد انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ پھر انہیں عرش کے سامنے لایا جائے گا جبکہ وہ ہر قسم کے آفات واسقام اور سردی و گرمی سے محفوظ ہو چکے ہوں گے، اس پر خداوند جبار فرشتوں کو حکم دے گا: ''میرے ان دوستوں کو بہشت میں اکٹھا کر دو، انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا مت کرو، میری رضا ان کے لئے سبقت اختیار کر چکی ہے، اور میری رحمت ان کے لئے واجب ہو چکی ہے، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں اچھوں اور بروں کو ایک جگہ پر کھڑا کروں؟''

آپؐ فرماتے ہیں: ''پس ملائکہ انہیں جنت کی طرف لے چلیں گے، اور جب جنت کے صدر دروازے پر پہنچ جائیں گے تو

فرشتے ایسا دق الباب کریں گے کہ جس سے پیاری پیاری آوازیں پیدا ہوں گی جنہیں حوران جنت سن لیں گی کہ جن حوروں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے لئے پیدا کیا ہوگا، جب وہ دروازے کی آوازیں سنیں گی تو ایک دوسرے کو خوشخبری اور مبارک باد دیں گی، اور کہیں گی: "اولیاء اللہ پہنچ گئے ہیں"۔

پھر ان کیلئے دروازہ کھول دیا جائے گا اور وہ اس بہشت کے اندر چلے جائیں گے، پہلے ان کی زوجائیں حوران بہشت اور انسانوں سے عورتیں ان کے استقبال کیلئے آگے بڑھیں گی اور کہیں گی: "خوش آمدید، اھلا وسھلا، ہمیں آپ کی ملاقات کا کس قدر شوق ہے!!" اس پر اولیاء اللہ بھی انہیں وہی جواب دیں گے!!

بہشت کی ساخت

حضرت علیؑ نے حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کے اس قول "وَ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ" (زمر / ۲۰) ان کیلئے بہشت میں بالا خانے ہیں جن کے اوپر پھر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ کے بارے میں ارشاد فرمائیے کہ کس چیز سے بنائے گئے ہیں؟ تو آپؐ فرمایا: "یا علیؑ! وہ ایسے محلات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء اور دوستوں کیلئے در، یاقوت اور زمرد سے تیار کیا ہے، ان کی چھت سونے کی ہے چاندی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ہر محل کیلئے سونے کے ہزار دروازے ہیں اور ہر در پر ایک ایک فرشتہ مقرر ہے۔ ان محلات میں ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ریشم اور دیباج کے مختلف رنگوں کے فرش ایک دوسرے کے اوپر بچھے ہوئے ہیں عنبر، کستوری اور کافور ان پر چھڑکے ہوئے ہیں اسی بارے میں خداوند جل شانہ ارشاد فرماتا ہے "وَ فُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ" (واقعہ / ۳۴) اور گرانقدر بستر ہوں گے۔ جب مؤمن اپنے جنت کے محلات میں داخل ہوں گے تو ان کے سروں پر بادشاہت اور عزت و عظمت کے ایسے تاج رکھے جائیں گے جو سونے اور چاندی سے مرصع ہوں گے اور تاج کے نیچے ایک ایسی پٹی ہوگی جس میں یاقوت اور موتی جڑے ہوں گے۔ ہر مؤمن کو ریشم کے مختلف الوان کی ستر مختلف انداز کی پوشاکیں پہنائی جائیں گی جو سونے، چاندی، لؤلؤ اور سرخ یاقوت سے بنی ہوئی ہوں گی۔ اسی بارے میں خداوند عزوجل فرماتا ہے "يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤٍ وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ" (حج / ۲۳) انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور وہاں پر ان کی پوشاک ریشم ہوگا۔ جب مؤمن اپنے تخت پر براجمان ہو جائے گا تو تخت خوشی میں جھومنے لگے گا اور جب ولی خدا کیلئے جنت کے محلات مخصوص ہو جائیں گے تو ایک مؤکل فرشتہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے اللہ کی عطا کردہ عزت و شرف کی مبارک دینے کیلئے اجازت طلب کرے گا اس پر اس کے خدمت گار ملازم اور ملازمائیں کہیں گے: "ابھی ٹھہرو! کیونکہ ولی خدا نے ابھی گاؤ تکیے پر آرام کیا ہے اور اس کی زوجہ حور ابھی اس کیلئے تیاری کر رہی ہے۔ لہذا کچھ دیر ٹھہرو!!" کچھ دیر کے بعد اس کی زوجہ حور اپنے خیمہ سے اس حال میں باہر آئے گی کہ اس کے اطراف میں کنیزوں کا جھرمٹ ہوگا، ستر پوشاکوں میں ملبوس ہوگی اور ہر پوشاک یاقوت، لؤلؤ اور زمرد سے تیار شدہ ہوگی اور مشک و عنبر کی خوشبو میں رچی بسی ہوگی۔ اس کے سر پر کرامت کا تاج ہوگا۔ سونے کے جوتے جو یاقوت اور لؤلؤ سے جڑے ہوئے ہوں گے ان کے تسمے سرخ یاقوت کے ہوں گے۔

کے ولی! آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ میرے ہیں اور میں آپ کی" پس وہ آپس میں بغل گیر ہو جائیں گے اور دنیوی سالوں کے اعتبار سے پانچ سو سال تک بغل گیر رہیں گے لیکن ایک دوسرے سے نہیں تھکیں گے۔ جب ایک دوسرے سے جدا ہونے لگیں گے تو مؤمن کی نگاہ اس کی گردن پر جاپڑے گی تو دیکھے گا کہ اس کی گردن میں سرخ یاقوت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہار ہوں گے ہاروں کے درمیان میں دُر کی ایک لوح ہوگی جس پر تحریر ہوگا "اے اللہ کے ولی! آپ میرے لئے ہیں اور میں آپ کیلئے! آپ میرے حبیب میں حور آپ کی محبوبہ، آپ کو میری چاہت تھی اور مجھے آپ کی چاہت" اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس مؤمن کی طرف ایک ہزار فرشتے بھیجے گا جو اسے بہشت آنے کی مبارکباد پیش کریں گے اور اس کی حوروں کے ساتھ شادی میں شرکت کریں گے۔ جب وہ مؤمن کی اس جنت کے پہلے دروازے پر پہنچیں گے تو اس کے دربان فرشتے سے داخلے کی اجازت مانگیں گے اور کہیں گے "ولی خدا سے ہماری ملاقات کی اجازت لے آؤ تاکہ ہم اس کے پاس جاکر مبارکباد پیش کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی بات کیلئے بھیجا ہے"

اس پر وہ فرشتہ انہیں کہے گا "ٹھہر جاؤ! میں ان کے خصوصی حاجب کو تمہارے آنے کی اطلاع کر دیتا ہوں، وہ اسے تمہای اطلاع دیں گے" وہ فرشتہ مؤمن کے خصوصی حاجب کے پاس جائے گا، اور اس کے اور خصوصی حاجب کے درمیان تین بہشتوں کا فاصلہ ہوگا، جب وہ اس کے پاس پہنچے گا تو اسے کہے گا "باہر کے دروازے پر ایک ہزار فرشتے آئے ہوئے ہیں جنہیں رب تعالیٰ نے مؤمن کو مبارکباد دینے کیلئے بھیجا ہے، اب وہ ان سے ملاقات کا وقت مانگ رہے ہیں" وہ جواب میں کہے گا "میرے لئے تو یہ بات بہت ہی مشکل ہے کہ میں ولی خدا کے پاس جاؤں، کیونکہ وہ اس وقت اپنی زوجہ حور کے ساتھ خلوت میں ہیں!" چونکہ حاجب اور ولی اللہ کے درمیان دو بہشتوں کا فاصلہ ہوگا، لہذا خصوصی حاجب ایک اور مخصوص خدمت گار کے پاس آئے گا اور آکر کہے گا "باہر صدر دروازے پر ایک ہزار فرشتے آئے ہوئے ہیں جنہیں اللہ رب العزت نے بھیجا ہے تاکہ وہ ولی اللہ کو مبارکباد پیش کریں، اس وقت وہ اجازت مانگ رہے ہیں، انہیں بتایئے اور ملاقات کی اجازت طلب کریں۔ وہ ولی اللہ کے پاس آکر اجازت طلب کریں گے، وہ اجازت عطا فرمائیں گے اور تمام فرشتے ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور وہ ایک ایسے بالاخانے میں ہوں گے جس کے ایک ہزار دروازے ہوں گے اور ہر ایک دروازے پر ایک ایک فرشتہ مقرر ہوگا، جب ملاقات کیلئے آنے والے فرشتوں کو اذن باریابی ملے گا تو ہر فرشتہ جس دروازے پر متعین ہے اسے کھول دے گا۔ مخصوص خدمت گزار تمام فرشتوں کو ایک ایک دروازے سے اندر آنے کو کہے گا چنانچہ وہ اندر جاکر پاک پروردگار کا پیغام اس ولی خدا تک پہنچائیں گے، اسی بارے میں خداوند عزوجل فرماتا ہے "وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ" (رعد / ۲۳) اور ان کیلئے ہر دروازے سے فرشتے داخل ہوں گے (اور ان سے کہیں گے) "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" (رعد / ۲۴) تم پر سلام ہو تمہارے صبر واستقامت کی بنا پر۔

خداوند عالم اسی بارے میں فرماتا ہے "وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيمًا وَّ مُلْكًا كَبِيرًا" (دہر / ۲۰) اور جس وقت تو اس جگہ کو دیکھے گا تو پھر تو نعمتوں اور ایک عظیم ملک کو دیکھے گا۔ اس سے مراد وہی ولی خدا اور مؤمن ہیں جسے خدا نے نعمتیں، کرامتیں، عزت واحترام، حکومت اور سلطنت عطا کی ہوگی۔ کیونکہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے اس سے اجازت طلب کریں گے اور اس کی اجازت کے بغیر اندر نہیں جاسکیں گے۔ یہی تو ملک عظیم وکبیر ہے"۔

فرشتوں کی ایک اور قسم

(اور) چوتھی قسم کے (وہ فرشتے ہیں جن کے قدم زمین کی تہہ میں جمے ہوئے ہیں) بعض نسخوں میں زمین کا لفظ مفرد کی صورت میں اور بعض میں جمع کی صورت میں استعمال ہوا ہے۔ (اور بلند آسمان سے ان کی گردنیں آگے نکل چکی ہیں) باہر آسمان سے مراد ساتواں آسمان ہے۔ (اور ان کے پہلو اطراف عالم) ارض و سما کے اطراف و جوانب (سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں) اور یہ ان کی جسامت اور چوڑائی کی طرف اشارہ ہے۔ (ان کے شانے عرش کے پایوں سے میل کھاتے ہیں) اور میل کھانے سے مراد یا تو قرب ہے یا عظمت میں مشابہت ہے۔ اور عرش کی عظمت کے بارے میں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر عظیم ہے۔ اور اخبار و احادیث نے اس بارے میں کیا بتایا ہے؟ یہاں پر اس کی عظمت کے متعلق اتنا ہی سن لیں کہ یہ کائنات کی ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور تمام آسمان اور زمین ان میں موجود چیزیں اس کے مقابلے میں ایسی ہیں جیسے ایک وسیع و عریض بیابان میں ایک انگوٹھی ہوتی ہے۔ اور اس کے چار پائے ہیں۔

عرش کیا ہے؟

بحار الانوار میں تفسیر در منثور سے نقل کیا گیا ہے کہ حماد کہتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے عرش کو سبز زمرد سے پیدا کیا ہے، اس کے سرخ یاقوت سے چار پائے ہیں اور ایک ہزار زبانیں خلق کی گئی ہیں اور زمین میں ایک ہزار امت ایسی پیدا کی گئی ہے جو عرش کی زبان میں خدا کی تسبیح کرتی ہے"۔ بحار الانوار میں ہی روضۃ الواعظین سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے آباو اجداد سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "عرش میں مثال ہے اس چیز کی جو خداوند عالم نے خشکی اور سمندر پیدا کئے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تاویل ہے "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّاعِنْدَنَاخَزَائِنُهُ" (حجر / ۲۱) اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔

عرش کے پایوں میں ایک دوسرے کا درمیانی فاصلہ ایک تیز رفتار پرندے کی ایک ہزار سال کی پرواز کا فاصلہ ہے اور عرش کو روزانہ ستر ہزار نورانی رنگوں کی چادر اوڑھائی جاتی ہے۔ اسی لئے خدا کی کسی بھی مخلوق کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں ہو سکتی اور عرش کے مقابلے میں باقی سب کائنات ایسے ہے جیسے وسیع و عریض صحرا میں ایک انگوٹھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جسے "خرقائیل" کہتے ہیں اس کے اٹھارہ ہزار پر ہیں اور ایک پر سے دوسرے پر کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

ایک مرتبہ اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ "آیا عرش سے اوپر بھی کوئی چیز ہے؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے اتنے اور پر عطا کئے اور وہ چھتیس ہزار ہو گئے اور ایک سے دوسرے پر کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت تھا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا: "فرشتے پرواز کرو!!" تو اس نے پرواز شروع کر دی اور تیس ہزار سال تک اڑتا رہا، پھر بھی وہ وہاں تک نہ پہنچ سکا۔ اللہ نے اس پر وحی کی کہ: "اگر تو صور پھونکنے تک بھی اڑتا رہے پھر بھی اپنی اسی قوت اور انہی پروں کے ذریعہ میرے عرش کے ایک پائے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ اس پر اس فرشتے نے کہا "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَبِحَمْدِهٖ" پاک ہے میرا اعلیٰ رب اس کی میں حمد کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى" (اعلیٰ / ۱) اپنے اعلیٰ رب کی تسبیح بیان کیا کرو، اسی لئے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "اسے اپنے سجود میں

پڑھا کرو"۔

کتاب اکمال الدین میں اسناد کے ساتھ لیث بن ابی سلیم سے اور وہ مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے سنا: "خداوند عالم کا ایک فرشتہ ہے جسے "دردائیل" کہتے ہیں جس کے سولہ ہزار پر تھے اور ایک پر سے دوسرے پر کے درمیان ایک فضا کا فاصلہ تھا۔ اور فضا کا فاصلہ اسی طرح تھا جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان کا فاصلہ ہے ایک مرتبہ اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ "آیا ہمارے رب جل جلالہٗ کے اوپر بھی کوئی شئے ہے؟" اس خیال کے دل میں آتے ہی اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا اور پر عطا کر دیئے تو اس کے بتیس ہزار پر ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی کہ "پرواز کرو!!" وہ پرواز کرتے کرتے پانچ سو سال تک کی مسافت طے کر گیا پھر بھی اس کا سر قوائم عرش میں سے ایک پائے تک بھی نہ پہنچ سکا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اب تھک چکا ہے تو ارشاد فرمایا "او فرشتے!!! اپنی جگہ پر لوٹ جاؤ، میں ہر عظیم سے عظیم تر ہوں مجھ پر کسی چیز کو فوقیت حاصل نہیں نے اور نہ میں کسی جگہ میں محدود ہوں"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے پر سلب کر دیئے اور ملائکہ کی صفوں سے اس کا نام خارج کر دیا اور جب حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول خداؐ کی خدمت میں مبارکباد دینے کیلئے اترے، اسی اثناء میں ان کا گزر "دردائیل" کے پاس سے ہوا اس نے ان سے درخواست کی "پیغمبر خداؐ کی خدمت میں اس مولود کا واسطہ دے کر میری طرف سے درخواست کرنا کہ وہ میرے لئے خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت کریں"۔ آنحضرتؐ نے اس کے حق میں حسینؑ کا واسطہ دے کر دعا کی تو اللہ نے آنجناب کی دعا قبول فرمائی اور "دردائیل" کے پر بھی لوٹا دیئے اور اس کو وہی منصب و مقام بھی دو بارہ عطا فرما دیا۔

حاملین عرش

حضرت امیرؑ کے فرمان میں "مناسبت" سے مراد ممکن ہے کہ "اس کے ساتھ ملے ہوئے ہوں"۔ تو اس وقت اس سے مراد حاملین عرش ہوں گے۔ بلکہ ظاہر میں بھی اس کا معنی یہی بنتا ہے، اس لئے کہ امیر المؤمنینؑ کے کلام میں مذکور صفات وہی ہیں جو حاملین عرش کیلئے، اخبار و احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب ان سے: "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ" (الحاقہ / ۱۷) اور اس دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: "حاملین عرش کے بارے میں ہے کہ ایسے فرشتوں کی آٹھ صفیں ہیں جن کی تعداد کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آٹھ فرشتے ہیں جن کے سر ساتویں آسمان تک اور عرش کے نیچے تک پہنچے ہوئے ہیں، اور ان کے اقدام (پاؤں) آخری زمین میں ہیں۔ ان کے سینگ پہاڑی بکرے کے سینگوں کی مانند ہیں ایک سینگ کی جڑ سے چوٹی تک کا فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے"۔ کتاب الخصال میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے راوی کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے سنا آپؑ نے فرمایا: "حاملین عرش آٹھ فرشتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی آٹھ آنکھیں ہیں اور ہر آنکھ ایک دنیا

کے برابر ہے"۔

تفسیر امام میں ہے راوی کہتا ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے عرش کو خلق فرمایا تو اس کے لئے تین لاکھ ساٹھ ہزار ارکان پیدا فرمائے اور ہر ایک رکن کے پاس تین لاکھ ساٹھ ہزار فرشتے خلق کئے، اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے چھوٹے فرشتے کو حکم دے تو وہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو ایک لقمہ بنالے، اور مذکورہ زمین و آسمان یک جا اس کے حلق میں ایسے ہوں جیسے وسیع و عریض صحرا میں ریت کا ایک ذرہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ : "اے میرے بندو! میرے اس عرش کو اٹھاؤ، اس پر ان سب نے خوب زور لگایا لیکن اسے نہ اٹھا سکے بلکہ حرکت بھی نہ دے سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک فرشتے کے ساتھ ایک اور فرشتے کو پیدا کیا پھر بھی وہ اسے حرکت نہ دے سکے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے ساتھ دس دس فرشتے اور پیدا کئے لیکن وہ بھی اسے حرکت نہ دے سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے فرمایا: "اسے چھوڑ دو اور میری قدرت کے دست بدامان ہو جاؤ" تو سب نے ایسا کیا۔

پھر اللہ جل شانہٗ نے ان میں سے آٹھ فرشتوں سے فرمایا: "تم اسے اٹھاؤ!" انہوں نے عرض کیا: "پروردگارا! اس قدر خلق کثیر اور جم غفیر کے باوجود ہم سب مل کر بھی اسے نہ اٹھا سکے تو اب صرف اکیلے آٹھ فرشتے اسے کیونکر اٹھا سکیں گے؟" خداوند عالم نے فرمایا: "یاد رکھو! میں وہ خدا ہوں جو دور کو نزدیک کر دیتا ہوں، اپنے بندوں کے لئے جسے جھکانا چاہوں جھکا دیتا ہوں، سخت کو آسان کر دیتا ہوں، مشکل کو سہل بنا دیتا ہوں، جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، جیسے چاہتا ہوں حکم دیتا ہوں۔ میں تمہیں کچھ کلمات بتاتا ہوں جنہیں ادا کرنے سے تمہارے لئے سب کچھ آسان ہو جائے گا" انہوں نے عرض کیا: "وہ کیا کلمات ہیں یا اللہ!" خدا نے فرمایا کہو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّاهِرِيْنَ"۔ جب انہوں نے یہ کلمات ادا کئے تو عرش کو بڑی آسانی کے ساتھ اٹھالیا اور ان کے کولہوں پر صرف اتنا بوجھ محسوس ہوا جتنا کسی طاقتور اور قوی انسان کے کندھوں پر بالوں کا بوجھ ہوتا ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے باقی فرشتوں سے فرمایا تم ان آٹھ فرشتوں کو اپنے حال پر رہنے دو اور خود اس عرش کے گرد طواف میں لگ جاؤ! اور دوران طواف میری تسبیح، مجد اور تقدیس بیان کرتے رہو کیونکہ میں خداوند اس امر پر قادر ہوں جو تم دیکھ رہے ہو اور، میں ہر چیز پر قادر ہوں"

وہب کہتے ہیں کہ آج کے دور میں حاملین عرش چار فرشتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کے ساتھ چار اور فرشتے بھی ہو جائیں گے۔ موجودہ چار فرشتوں میں سے ایک انسانی صورت میں ہے جو بنی آدم کیلئے ان کے رزق کے سلسلے میں شفاعت کرتا ہے۔ ایک عقاب کی صورت میں ہے جو پرندوں کے لئے ان کے رزق کے لئے شفاعت کرتا ہے۔ ایک بیل(۱) کی صورت میں ہے جو جانوروں اور اور چوپایوں کے لئے دعا کرتا ہے اور ایک شیر کی صورت میں ہے جو درندوں کی روزی کے لئے شفاعت کرتا ہے۔ جب انہوں نے عرش کو اپنے اوپر اٹھایا تو خداوند عالم کی عظمت و جلال کی وجہ سے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ لیکن جب انہیں "لَاحَوْلَ وَلَا

(۱) خصال صدوق" میں ہے امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش کی تو اس وقت سے اس بیل کا سر جھکا ہوا ہے۔

قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہ "سکھایا گیا اور انہوں نے یہ کلمات اپنی زبان پر جاری فرمائے تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔

ابن زید کہتے ہیں کہ حاملین عرش میں سے صرف حضرت اسرافیل کا نام لیا گیا ہے، جبکہ ہارون بن رناب کہتے ہیں کہ: "حاملین عرش آٹھ فرشتے ہیں جن میں سے چار حاملین یہ کہتے رہتے ہیں "سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ عَلٰى حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ" خداوندا تو پاک و منزہ ہے اور تیرے علم کے باوجود حلم سے کام لینے پر حمد ہے، چار دیگر حاملین یہ کہتے رہتے ہیں کہ: "سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ عَلٰى عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ" خداوندا تو پاک و منزہ ہے اور تیرے قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دینے پر تیری حمد ہے۔

یاد رہے کہ مذکورہ روایات مندرجہ ذیل دوسری روایات کے منافی نہیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ: "حاملین عرش آٹھ ہیں جن میں سے چار اولین میں سے اور چار آخرین میں سے ہیں۔ جو اولین میں سے ہیں وہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ جو چار آخرین میں سے ہیں وہ محمد، علی، حسن اور حسین علیہم السلام ہیں" کیونکہ پہلی روایات کے مطابق عرش سے مراد وہ جسم محیط ہے جو تمام مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور ان آخری رویات میں عرش سے مراد "علم" ہے۔ کیونکہ عرش کے معانی میں سے ایک معنی یہ بھی ہے جیسا کہ آپ اسی خطبہ کی پانچویں فصل میں جان چکے ہیں، اور ہم نے جو بیان کیا ہے اس کی تفصیل شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنے اعتقادیہ میں بھی یہی پیش کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "یہ بزرگوار حاملین عرش ہیں اور عرش "علم" ہے کیونکہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تھے وہ اولین میں سے ان چار پیغمبروں کی شریعت پر تھے یعنی نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی شریعت پر۔ لہٰذا سابقین کا علم ان چار پیغمبروں کی طرف لوٹتا ہے۔ اسی طرح ان کے بعد آخرین کا علم محمد، علی، حسن اور حسین علیہم السلام کی طرف لوٹتا ہے اور حسینؑ کے بعد ان کی امام اور معصوم اولاد کی طرف لوٹتا ہے۔"

حاملین عرش کی تواضع وانکساری

(عرش کے سامنے ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں) یا تو نور عرش کی کثرت کی وجہ سے "جیسا کہ اس پر میسرہ کی روایت دلالت کر رہی ہے وہ کہتے ہیں: "ان کے آٹھوں پاؤں زمین کی آخری حدود تک پہنچے ہوئے ہیں اور سر، عرش تک۔ وہ اپنی آنکھیں نور کی شعاعوں کی وجہ سے اوپر نہیں اٹھا سکتے"۔ یا پھر کثرت خوف کی وجہ سے۔ جیسا کہ یہ روایت بھی میسرہ ہی سے ہے جو اسی بات پر دلالت کر رہی ہے، وہ فرماتے ہیں: "حاملین عرش کے پاؤں آخری زمین کی نچلی حدود تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان کے سر عرش کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں ان کے خشوع کی یہ حالت ہے کہ اپنی آنکھیں اوپر نہیں اٹھاتے اور ساتویں آسمان کی مخلوق سے بھی زیادہ خوف ان کے اندر پایا جاتا ہے، اور ساتویں آسمان والوں کا خوف چھٹے والوں سے اور چھٹے والوں کا خوف پانچویں والوں سے زیادہ ہے۔ اسی طرح بعد والے آسمان والوں سے پہلے والوں کا خوف زیادہ ہے"۔

حضرت امام زین العابدینؑ ملائکہ کی توصیف میں ارشاد فرماتے ہیں "اَلْخُشَّعِ الْاَبْصَارِ فَلَا يَرُوْمُوْنَ النَّظَرَ اِلَيْكَ النَّوَاكِسُ الْاَذْقَانِ الَّذِيْنَ طَالَتْ رَغْبَتُهُمْ فِيْمَا لَدَيْكَ" "ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں لہٰذا (خداوندا!) وہ تیری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، ان کے سر جھکے ہوئے ہیں اور جو کچھ تیرے پاس ہے اس میں ان کی لمبی خواہش مضمر ہے (صحیفہ سجادیہ) کتاب "التوحید"

میں اسناد کے ساتھ حضرت پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "خدا کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جن کی جسمانیت کے برابر کوئی بھی چیز نہیں اور وہ مختلف آوازوں میں خدا کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہیں اور خوف و بکا کی وجہ سے نہ تو اپنے سروں کو اوپر اٹھاتے ہیں اور نہ ہی نیچے کو جھکاتے ہیں"۔

ان کے پروں کی تعداد

(اس) عرش (کے نیچے اپنے پروں میں لپٹے ہوئے ہیں) چنانچہ شارح بحرانیؒ وہب سے روایت کرتے ہیں کہ حاملین عرش اور ان کے اطراف میں رہنے والے فرشتوں کے چار پر ہیں۔ دو پر تو ان کی آنکھوں کے آگے ہیں تاکہ وہ عرش کی طرف نہ دیکھ سکیں کہ اس طرح سے ان پر غشی طاری نہ ہو جائے، اور دوسرے دو پر ایسے ہیں جو وہ پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں، سوائے حمد و تسبیح کے کچھ بولتے نہیں۔ انوار نعمانیہ میں روایت ہے کہ کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جن کے چھ چھ پر ہیں جن میں سے دو پر تو ان کے جسموں کے ساتھ پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ دو پروں کے ذریعے پرواز کرتے ہیں اور شرم و حیا کی وجہ سے دو پر ان کے چہروں پر پڑے ہوئے ہیں۔ تو گویا ہر دو پر کسی خاص غرض کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے "اُولِیٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ" (فاطر/۱) دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔

یہ تو کم از کم تعداد ہے، زیادہ کے متعلق تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی اور کس قدر ہے؟ وہ جن کیلئے جتنا چاہے زیادہ کر دے اس لئے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (ان کے اور دوسری مخلوق) خواہ ملائکہ ہوں یا جن و بشر یا سب مخلوق (کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے سراپردے حائل ہیں) جو انہیں اس کی ذات کے ادراک اور اس کے حالات سے مطلع ہونے سے مانع ہیں۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ دنیوی بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ جب عزت و عظمت کے انتہائی بلند درجے تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے خواص تک بھی کسی کی رسائی نہیں ہوتی چہ جائیکہ اس کی ذات تک کوئی پہنچ سکے، سوائے خاص الخاص شخص کے اور اس کی ملاقات بھی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس کے ساتھ خصوصی تعلق ہو یا مضبوط وسیلہ و واسطہ ہو۔ اور اس کی عام ملاقات سے اس کی سلطنت کی ہیبت اور مملکت کی قدرت اور عظمت مانع ہوتی ہے۔ یہ تو ہے عارضی سلطنت کے فرمانرواؤں اور ان ملوک (بادشاہوں) کی کیفیت جو در حقیقت مملوک ہیں، تو جو حقیقی ربوبیت کا مالک اور شہنشاہوں کا شاہنشاہ ہے، اس کی عظمت و جبروت اور عزت و تمکنت کی کیا کیفیت ہوگی؟ (اور وہ شکل و صورت کے ساتھ اپنے رب کا تصور نہیں کرتے) کیونکہ وہ اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے بارے میں وہمی اور خیالی ادراکات سے منزہ اور مبرا ہیں۔ جَلَّتْ عَظَمَةُ الْخَالِقِ!

(اور نہ اس پر مخلوق کی صفت طاری کرتے ہیں، نہ اسے محل و مکان میں گھرا سمجھتے ہیں نہ اشباہ و نظائر سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں) کیونکہ محل و مکان میں صفات اور حد بندی کا اجرا اور نظائر اور اشباہ کی طرف اشارہ قوت واہمہ اور قوت متخیلہ کی اختراع ہوتے ہیں جو ایسے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں جو عناصر پر مشتمل مزاج کے حامل ہوتے ہیں اور ملائکہ سماویہ اور مقربین بارگاہ ربوبیت کے حق میں یہ بات نامناسب ہے۔

یہاں پر ملائکہ کے بارے میں گفتگو ختم کی جاتی ہے کیونکہ یہاں پر ان کے بارے میں اتنی ہی گفتگو کی ضرورت تھی البتہ آئندہ بعض خطبوں مثلاً خطبہ اشباح وغیرہ کے ضمن میں اس بارے میں مزید گفتگو ہو گی، انشاء اللہ العزیز، خدا ہی توفیق دینے والا اور مدد گار و معین ہے۔

دسویں فصل

حضرت آدمؑ کی تعریف و توصیف

مِنْهَا فِيْ صِفَةِ آدَمَؑ

ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ الأَرْضِ وَسَهْلِهَا وَعَذْبِهَا وَ سَبْخِهَا تُرْبَةً سَنَّهَا بِالْمَآءِ حَتّٰى خَلَصَتْ وَ لَاطَهَا بِالْبِلَّةِ حَتّٰى لَزَبَتْ فَجَبَلَ (فَجَعَلَ) مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ اَحْنَاءٍ وَّ وُصُوْلٍ وَّ اَعْضَاءٍ وَّ فُصُوْلٍ اَجْمَدَهَا حَتّٰى اسْتَمْسَكَتْ وَ اَصْلَدَهَا حَتّٰى صَلْصَلَتْ لِوَقْتٍ مَعْدُوْدٍ وَاَجَلٍ مَعْلُوْمٍ وَنَفَخَ فِيْهَا مِنْ رُّوْحِهِ فَتَمَثَّلَتْ اِنْسَانًا ذَا اَذْهَانٍ يُجِيْلُهَا وَفِكَرٍ يَّتَصَرَّفُ بِهَا وَجَوَارِحَ يَخْتَدِمُهَا وَاَدَوَاتٍ يُقَلِّبُهَا وَمَعْرِفَةٍ يُفَرِّقُ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ وَالاَذْوَاقِ وَالْمَشَامِ وَالاَلْوَانِ وَ الاَجْنَاسِ مَعْجُوْنًا بِطِيْنَةِ الاَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ وَالاَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ وَالاَضْدَادِ الْمُتَعَادِيَةِ وَ الاَخْلَاطِ الْمُتَبَايِنَةِ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ وَالْبِلَّةِ وَالْجُمُوْدِ وَالْمَسَآئَةِ وَالسُّرُوْرِ۔

اس خطبہ کا کچھ حصہ حضرت آدمؑ کے بارے میں ہے

پھر اللہ نے سخت و نرم اور شیریں و شورہ زار زمین سے مٹی جمع کی، اسے پانی سے اتنا بھگویا کہ وہ صاف ہو کر نتھر گئی اور تری سے اتنا گوندھا کہ اس میں لیس پیدا ہو گیا اس سے ایک ایسی صورت بنائی جس میں موڑ ہیں اور جوڑ، اعضاء ہیں اور مختلف حصے۔ اسے یہاں تک سکھایا کہ وہ خود تھم سکی۔ اور اتنا سخت کیا کہ وہ کھنکھنانے لگی۔ ایک وقت معین اور مدت معلوم تک اسے یونہی رہنے دیا۔ پھر اس میں روح پھونکی تو وہ ایسے انسان کی صورت میں کھڑی ہو گئی جو قوائے ذہنی کو حرکت دینے والا، فکری حرکات سے تصرف کرنے والا، اعضاء و جوارح سے خدمت لینے والا، اور ہاتھ پیروں کو چلانے والا ہے ایسی شناخت کا مالک ہے جس سے حق و باطل میں تمیز کرتا ہے اور مختلف مزوں بوؤں، رنگوں اور جنسوں میں فرق کرتا ہے، خود رنگا رنگ کی مٹی اور ملتی جلتی ہوئی موافق چیزوں اور مخالف ضدوں اور متضاد خلطوں سے اس کا خمیر ہوا ہے، یعنی گرمی، سردی خشکی، تری اور غم اور خوشی کا پیکر ہے۔

تشریح

"حَزَن" بروزن "فَلس" بمعنی سخت زمین "سَهَل" اس کا برعکس معنی ہے۔ "عذب" قابل کاشت زمین "سَبَخ" بروزن "فَلس" شورہ زار اور کلر والی زمین جو قابل کاشت نہ ہو "سَنَّهَا بِالْمَاءِ" اسے پانی سے بھگویا "لَاطَهَا" اسے گوندھا۔ "بِلَّة" تری، جمع "بَلَل" ہے۔ "لَزَبَت"، "لُزُوْب" سے ہے جس کے معنی ہیں لیس دار ہونا۔ "فَجَبَلَ" کی جگہ بعض نسخوں میں "فَجَعَلَ" ہے دونوں کا معنی "خَلَقَ" یعنی پیدا کیا، "اَحنَاء" جمع ہے "حِنْو" کی بمعنی جانب و کنارہ

"وُصُوْل"، جمع ہے "وَصَلْ" کی بمعنی "جوڑ" کے ہے جبکہ "فُصُوْل" جمع ہے "فَصَلْ" کی اس کے معنی بھی جوڑ کے ہیں بایں معنی کہ چونکہ دو ہڈیوں میں سے ایک دوسری سے مل رہی ہوتی ہے لہٰذا اسے "وصول" کہیں گے، اور چونکہ دو میں سے ایک دوسری سے جدا ہو رہی ہوتی ہے لہٰذا اسے "فصول" یا "مفاصل" کہیں گے۔ "اَصْلَدْ" یعنی سخت اور ٹھوس، "صَلْصَلْ" جب کسی چیز سے (کھنکتی) آواز پیدا ہو، مثلاً کہا جاتا ہے "صَلْصَلَ الْحَدِیْدُ" لوہے سے آواز پیدا ہوئی، "صَلْصَلَ الرَّعْدُ" رعد یعنی بجلی کی آواز۔ اور "صَلْصَال" اس خشک مٹی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو اور ٹھونکیں مارنے سے اس سے ویسے آواز نکلے جس طرح پکائی گئی مٹی سے نکلتی ہے۔ جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ "صلصال" بدبودار مٹی کو کہتے ہیں۔ البتہ یہ ضعیف ہے۔ "تمثلت" کے معنی ہیں صورت اختیار کر لی۔ بعض نسخوں میں "فمثلت" ہے جس کے معنی ہیں سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "اذہان" جمع ہے "ذہن" کی جس کے معنی ہیں "فطانت" اور اصطلاح میں ادراک کرنے والی باطنی قوت کا نام ہے۔ "اختدام" کے معنی خدمت لینے کے ہیں۔ "معجون" خمیر کو کہتے ہیں "طینت" خلقت اور جبلت کو کہتے ہیں۔

حضرت آدمؑ کی تخلیق

(اس خطبے کا کچھ حصہ حضرت آدمؑ کے صفات میں ہے) کیونکہ جب حضرت علی علیہ السلام ملکوت سماوی اور ان کی عجیب و غریب خلقت میں اور فضاو ہوا اور مجردات کی تخلیق میں قدرت خداوندی کے ظہور کو بیان کر چکے تو عالم عناصر میں انسانی تخلیق اور اس کے دوسری اشیاء پر فوقیت دیئے جانے اور منتخب کئے جانے کو بیان فرمایا ہے۔ اس لئے کہ "انسان" عالم ملک و ملکوت میں پائی جانے والی تمام چیزوں کا جامع ہے اور خالق کائنات کی قدرت و جبروت کا صاف ستھرا نچوڑ ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ایک شعر ہے۔

اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ   وَ فِيْكَ انْطَوىٰ الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

یعنی اے انسان! کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ ایک چھوٹا سا جسم ہے؟ حالانکہ تجھ میں ایک بہت بڑا عالم چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ (پھر اللہ سبحانہٗ نے جمع کیا) یہاں پر خدا کی طرف جمع کی نسبت "توسع فی الاسناد" کے طور پر ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "حاکم نے شہر بنایا ہے" حالانکہ شہر بنانے والے اور لوگ ہوتے ہیں لیکن نسبت حاکم کی طرف دی جاتی ہے، اسی طرح در حقیقت حکم الٰہی سے جمع کرنے کا کام حضرت ملک الموت نے کیا۔ جب خداوند عالم کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ آدمؑ کو خلق کیا جائے اور انہیں زمین میں خدا کا خلیفہ بنایا جائے۔

سید ابن طاؤسؒ اپنی کتاب "سعد السعود" میں بحار الانوار سے نقل کرتے ہیں کہ روایت کے مطابق "ایک قدیم صحیفہ ادریس میں میں نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بتایا کہ اس سے ایک مخلوق پیدا کرے گا جن میں سے کچھ لوگ تو اس (خدا) کی اطاعت کریں گے اور کچھ نافرمانی!" اس پر زمین کانپ گئی اور معافی مانگنے لگی اور درخواست کی کہ "اس سے ایسے لوگوں کو پیدا نہ کرے جو اس کی نافرمانی کریں اور جہنم میں ڈالے جائیں" چنانچہ جبرائیلؑ زمین کے پاس آئے تا کہ اس سے آدمؑ کی طینت (مٹی) اٹھائیں تو اس نے

انہیں خداوند عزوجل کی عزت کی قسم دے کر درخواست کی کہ اس سے اس وقت تک کچھ نہ اٹھائیں جب تک کہ وہ خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر درخواست نہ کرلے چنانچہ اس نے خدا سے درخواست کی تو اللہ نے جبرائیل کو واپس بلالیا۔

پھر اللہ نے میکائیلؑ کو حکم دیا، وہ گئے لیکن زمین کانپ گئی، خدا کی بارگاہ میں چیخ و پکار کر فریاد کی تو میکائیلؑ کو بھی اللہ نے واپس بلالیا، پھر اللہ نے اسرافیلؑ کو حکم دیا اس مرتبہ بھی اس نے ایسا ہی کیا، اللہ نے انہیں بھی واپس بلالیا، اس کے بعد اللہ نے عزرائیلؑ کو بھیجا، اس پر بھی اس نے وہی طریقہ اختیار کیا لیکن عزرائیلؑ نے کہا: "مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے میں تو اسے ضرور بجالاؤں گا، خواہ تجھے یہ بات اچھی لگے یا بری" پھر حکم خداوندی کے مطابق انہوں نے اس سے مٹی کو اٹھایا اور اوپر لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: "جس طرح تو نے زمین سے مٹی کو اٹھایا ہے تو وہ اس پر سخت پریشان ہوئی اور نہیں اٹھانے دیتی تھی، اسی طرح جب تو لوگوں کی روح قبض کرے گا تو انہیں ناگوار گزرے گا، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا"۔

اس روایت کا مضمون اخبار و احادیث اہل بیت علیہم السلام کے مطابق ہے۔ کیونکہ یہ اخبار بھی بتاتی ہیں کہ مٹی کا لانے والا بھی عزرائیلؑ تھا اور روح قبض کرنے والا بھی عزرائیلؑ ہے۔ (سخت و نرم اور شیرین و شورہ زار زمین سے) اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عزرائیلؑ نے جو مٹی زمین سے اٹھائی تھی وہ روئے زمین کے ایک مقام مقام سے نہیں تھی اور بہت سی روایات بھی اس کے موافق ہیں۔ اور شاید مخلوق انسانی کی مختلف نوعوں میں فرق کی وجہ بھی یہی چیز ہے کہ ان کے مواد مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ مٹی زمین کی "ادیم" یعنی اس کے چہرے سے لی گئی جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو آدم کہا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ خداوند عالم نے زمین کے مختلف اجزاء سے (مٹی لی اسے پانی کے ساتھ ملایا اور اتنا بھگویا کہ صاف ہو کر نتھر گئی اور تری سے اتنا گوندھا کہ اس میں لیس پیدا ہو گیا) اور سخت ہو گئی۔ ایک قول کے مطابق یہ دونوں فقرے، عناصر کے اصل اختلاط کی طرف اشارہ ہیں، زمین اور پانی کو اس لئے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں انسان کے ان تمام اعضاء کے پروان چڑھنے کی اصل ہیں جن پر انسانی صورت کا دارومدار ہوتا ہے۔ (پس) اس سے (ایک ایسی صورت بنائی جس میں موڑ ہیں اور جوڑ اور اعضاء ہیں) اور یہی دونوں جملے انسانی صورت کی تخلیق اور اس کے اعضاء و جوارح کے فیوض و برکات کی طرف اشارہ ہیں۔ (اسے اتنا سکھایا کہ وہ خود تھم سکی اور اتنا سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی)۔

لفظ "صلصلت" کا ایک معنی تو یہ ہے کہ مٹی اس قدر خشک ہوئی اور اتنا سخت ہوئی کہ کھنکھنانے لگی جبکہ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے "بدبودار ہو گئی" اور امام علیہ السلام کا کلام بھی اس کے خراب ہو جانے پر شاہد ہے کہ جب آپ نے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ "اتنا سکھایا کہ وہ خود تھم سکی اور اتنا سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی" اور واضح سی بات ہے کہ جب مٹی خوب خشک ہو کر از خود تھم جائے اور اس قدر سخت ہو جائے کی کھنکھنانے لگے تو اس وقت بدبو ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

"ولقد خلقنا الانسان من صلصال مّن حمإٍ مّسنون" (حجر / ۲۶) اور ہم نے انسان کو خشک شدہ مٹی سے پیدا کیا ہے جو بدبودار سیاہ رنگ کے کیچڑ سے تھی۔

(ایک وقت معین اور مدت معلوم تک) اسے یونہی رہنے دیا جب تک اس کی مصلحت اور حکمت کا تقاضا رہا اس وقت تک

اس میں روح نہیں پھونکی۔اسی کی طرف خداوند عالم اشارہ فرماتا ہے: "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" (دہر/۱) کیاایسا نہیں ہے ؟کہ انسان پر ایک ایسا طویل زمانہ گزرا ہے کہ جب وہ قابل ذکر چیز نہیں تھا۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ: "انسان شئے تو تھا لیکن قابل ذکر چیز نہیں تھا" اس لئے کہ جب تک اس میں روح نہیں پھونکی گئی تھی اس وقت تک وہ مٹی ہی تو تھا۔بقولے حضرت آدمؑ پر چالیس برس ایسے گزرے کہ وہ نہ تو آسمان میں کوئی قابل ذکر چیز تھے اور نہ ہی زمین میں، اس لئے کہ ان میں روح پڑنے سے پہلے تو وہ صرف ایک دھڑ ہی تھے۔جب کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آدمؑ کی تخلیق ایک سو بیس سال بعد ہی مکمل ہوئی۔بعض آسمانی صحیفوں کے مطابق حضرت آدمؑ کی طینت کو چالیس سال تک گوندھا جاتا رہا، جس سے وہ لیس دار مٹی بنی، پھر پختہ ٹھیکرے کی مانند کھنکھناتی مٹی بنی اور چالیس برس تک ایسی صورت حال جاری رہی۔پھر ایک دھڑ کی صورت میں چالیس سال تک فرشتوں کے راستے پر پڑے رہے، پھر اس تمام عرصے کے بعد ان میں روح ڈالی گئی۔علل الشرائع میں اسناد کے ساتھ حضرت عبدالعظیم حسنی علیہ السلام سے بھی اسی طرح کی ایک روایت نقل کی گئی ہے..............................

بحارالانوار میں خصال شیخ صدوقؒ سے اور تفسیر فرات میں اسناد کے ساتھ امام حسن علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کعب الاحبار نے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے چند ایک سوالات کئے جن میں سے ایک سوال کا یہ جواب تھا: "جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خلق فرمانے کا ارادہ فرمایا تو جبرائیل علیہ السلام کو زمین سے مٹی لانے کا حکم دیا، جبرائیلؑ نے زمین کے اوپر کی مٹی اٹھائی اور اپنے قبضے میں لے کر شیرین اور شورپانی کے ساتھ اسے گوندھا اور اس میں روح پھونکنے سے پہلے تمام انسانی طبیعتوں کو اس میں مرکب کر دیا پھر اسے ایک بہت بڑے پہاڑ کی مانند پھینک دیا اور اس زمانے میں ابلیس پانچویں آسمان کا خزانچی تھا اس کا حضرت آدمؑ کے پاس سے آنا جانا رہتا تھا اور وہ ان کے نتھنوں سے داخل ہو کر......باہر نکل جاتا تھا، پھر ان کے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہتا تھا" کس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہو؟ اگر تو تجھے میرے اوپر مسلط کیا گیا تو تیری بات کو نہیں مانوں گا اور اگر میرے ماتحت ہوئے تو تمہاری اعانت کروں گا" چنانچہ حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان میں روح پھونکنے تک کا عرصہ ایک ہزار سال ہے ......"

اگر یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ اس قدر طولانی عرصے میں روح کے پھونکے جانے میں تاخیر کیوں کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا، تاخیر کی وجہ شاید یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ پر خاص لطف و کرم کی بنا پر اس میں تاخیر کی گئی تاکہ ملائکہ کے دل میں کسی طرح کا گمان بھی باقی نہ رہے ....اور ساتھ ہی یہ بات بھی کی کہ ان کا آدمؑ پر اعتبار پختہ ہو جائے اور تدریجی صورت میں اعتبار کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو جلدبازی سے باز رکھا جائے اور انہیں ہر کام آرام، اطمینان اور تدریج کے ساتھ انجام دینے کا سبق دیا جائے۔جیسا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق چھ دنوں میں ہونے کا تذکرہ ہے اور قرآن مجید ہی نے یہ بات بتائی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات پر اچھی طرح قادر ہے کہ انہیں ایک ہی لحہ میں پیدا کر دے۔بلکہ بقول امیر المؤمنینؑ "وہ تو اس بات پر قادر ہے کہ زمین و آسمان کو پلک جھپکنے کی مدت سے بھی کم عرصے میں خلق فرمادے، لیکن اس نے تاخیر اور تدبیر کو اپنے امانت داروں

کے لئے ایک مثال قرار دیا ہے اور اپنی مخلوق پر حجت قائم کی ہے"۔

(اور) صورت خواہ کوئی بھی ہو جب آدمؑ میں روح پھونکنے کی حکمت کا تقاضا ہوا تو (اس ڈھانچے میں روح کو پھونک دیا) جو اس پھونک کی قبولیت کے لئے تیار ہو چکا تھا اس روح کو پھونکا جسے اپنی دوسری تمام روحوں میں سے منتخب کر لیا تھا اور نفخ روح یعنی روح پھونکنے سے مراد اسے اس روح کے ذریعہ فیض پہنچایا اور اسے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے..........................

بعض متالہین نے اس کی تعبیریوں کی ہے کہ روح پھونکنے کا معنی ہے پھونکیں مارنا جس طرح آگ جلانے کے لئے لکڑی یا کوئلے وغیرہ میں پھونکیں ماری جاتی ہیں اور آگ بھڑکائی جاتی ہے اسی طرح یہ روح بھی ہوا کی مانند ہے جو کوئلے وغیرہ کے سوراخوں اور اس کے اندر میں جاتی ہے، لہٰذا انسانی ڈھانچے میں روح کا پھونکنا سبب بن گیا ہے اس کے مشتعل ہونے کا..........................

رہی یہ بات کہ روح کی نسبت اور اضافت خداوند عالم کی طرف کیوں دی گئی ہے؟ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ نسبت اسے عزت اور شرف عطا کرنے کیلئے ہے۔ جیسا کہ کافی میں محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے خداوند عالم کے اس قول "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي" (جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں) کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ روح کا پھونکنا کیسا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: "روح، ہوا کی مانند متحرک ہے، اسے روح اس لئے کہتے ہیں کہ یہ "ریح" (ہوا) سے مشتق (کیا گیا) ہے، کیونکہ ارواح ریح کے ہم جنس ہیں (معنی، حرکت، تصرف اور اصطلاح میں) اور اللہ نے اسے اپنی ذات کی طرف اس لئے نسبت اور اضافت دی ہے کہ اسے دوسری تمام ارواح میں سے منتخب کیا ہے۔ جس طرح سارے گھر خدا کے ہیں لیکن صرف ایک گھر کو "اپنا گھر" کہا ہے تمام رسولوں میں سے صرف ایک رسول کو اپنا خلیل کہا ہے۔ وغیرہ، اور یہ سب، رب کی مخلوق، مصنوع، ایجاد شدہ، تربیت یافتہ اور زیر تدبیر ہیں، یہاں پر ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح "روح" کی نسبت اور اضافت اللہ سبحانہ کی طرف ہے اسی طرح "صورت" کی نسبت بھی خدا کی طرف دی گئی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ کتاب کافی میں ہے کہ محمد بن مسلم کہتے ہیں: "میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس بارے میں سوال کیا کہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اس کا کیا مطلب ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "یہ ایک ایجاد شدہ اور خدا کی پیدا کردہ صورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا اور دوسری مختلف صورتوں میں سے اسے اپنے لئے اختیار فرمایا اور اسے اپنی طرف اضافت دے دی، جیسے کعبہ کو اپنی طرف نسبت دی یا روح کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا اور فرمایا "بَيْتِيَ" اور "رُوْحِي"..........................۔"

شیخ صدوقؒ اس حدیث کو ایک اور طرح سے بیان فرماتے ہیں چنانچہ عیون الاخبار میں حسین بن خالد سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا "فرزند رسولؐ! لوگ روایت کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر خلق فرمایا ہے" تو امامؑ نے فرمایا: "خدا انھیں غارت کرے! انہوں نے حدیث کا پہلا حصہ تو حذف کر دیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ حضرت رسول خداؐ دو آدمیوں کے پاس سے گزر رہے تھے جو ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے

ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا "قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَكَ وَ وَجْهَ مَنْ يَّشْبَهُكَ" خدا تیرے چہرے کو بگاڑے اور اس کے چہرے کو بھی جو تیرے ساتھ ملتا جلتا ہے" اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: "اے بندہ خدا! اپنے بھائی کو ایسا مت کہو! کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا ہے"۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں موجود ضمیر اس شخص کی طرف لوٹ رہی ہے جسے گالیاں دی جا رہی تھیں۔ اور پہلی روایت میں حضرت امام محمد باقرؑ نے نہ تو اسے رد کیا اور نہ ہی اس کی تحریف کی طرف اشارہ کیا۔ یا تو تقیہ کی وجہ سے یا پھر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر روایت صحیح بھی ہو تو بھی اس کی دلالت اس بات پر نہیں ہو رہی جو بھائی لوگ خدا کی جسمانیت اور اس کیلئے صورت ثابت کرنے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اور پاک ہے اللہ ان باتوں سے جن کی نسبت ظالمین اس کی طرف دیتے ہیں اور وہ ایسی ناروا نسبتوں سے بلند و بالاتر ہے۔

البتہ اس سلسلے میں مذکورہ روایت کا ایک اور جواب بھی دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ "عَلٰی صُوْرَتِهٖ" سے مراد ہے کہ آدمؑ مظہر صفات کمال الٰہیہ ہیں۔ یا پھر ضمیر خود آدمؑ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو ان کی اپنی ایسی صورت پر خلق فرمایا جو ان کے لائق اور شایان شان تھی ....

روح کا اطلاق مختلف معانی پر ہوتا ہے، چنانچہ کبھی اس کا اطلاق "نفس ناطقہ" پر ہوتا ہے جسے حکماء یہ سمجھتے ہیں یہ ایک مجرد چیز ہے اور علوم و کمالات کا مرکز اور جسم کے نظم و نسق کو سنبھالے ہوئے ہے۔ بعض اوقات اس کا اطلاق "روح حیوانی" پر بھی ہوتا ہے جو بخار لطیف کی صورت میں ہوتی ہے اور دل سے پیدا ہو کر بدن کے تمام اجزا میں جاری و ساری ہو جاتی ہے، چنانچہ حضرت آدمؑ کے جسم میں پھونکی جانے والی روح سے مذکورہ دونوں قسمیں بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔

سابقہ روایت میں حضرت امام محمد باقرؑ سے بیان ہونے والے فرمان سے یہی بات سمجھی جا سکتی ہے کہ "روح" بھی "ریح" (ہوا) کی طرح متحرک ہے اور وہ جسم میں اس کے تمام اجزا میں بڑی سرعت کے ساتھ حرکت کرتی رہتی ہے اور اعضاء کے رگ و پے میں حیات و زندگی کے آثار کو جاری رکھے ہوئے ہے اور جب تک یہ اس میں موجود رہتی ہے تب تک جسم میں بھی صلاحیت موجود رہتی ہے اور زندگی بحال رہتی ہے جس طرح کہ ہوا اقطار و اکناف عالم میں بڑی سرعت کے ساتھ رواں دواں ہے اور کائنات میں آثار حیات کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ جب تک اس کا سلسلہ جاری ہے کائنات میں بھی زندگی کی صلاحیت موجود ہے اور جب یہ مفقود ہو جائے گی تو اس کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

احتجاج طبرسی میں زندیق کے ان مسائل کا تذکرہ ہے جو اس نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے دریافت کئے تھے، چنانچہ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "آیا روح کو ہلکا یا بھاری کہا جا سکتا ہے یا اس کا وزن کیا جا سکتا ہے؟" اس پر امامؑ نے فرمایا: "روح کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح کسی مشک میں ہوا بھر دی جائے تو وہ اس سے پھول تو جاتی ہے لیکن اس کے اندر ہوا کے داخل ہونے پر اس کا وزن نہیں بڑھتا اور نہ ہی اس کے نکل جانے سے اس کا وزن کم ہو جاتا ہے، تو اسی طرح روح ہے جو نہ تو ثقیل ہے اور نہ ہی اس کا کوئی وزن ہے"۔ اس نے کہا: "آپؑ یہ ارشاد فرمائیے کہ روح کا جوہر کیا چیز ہے؟" آپؑ نے فرمایا: "ریح، ہوا ہی ہے۔ جب حرکت میں ہوتی ہے تو "ریح" کہلاتی ہے اور جب رک جاتی ہے تو ہوا کہلاتی ہے، اور اسی سے ہی دنیا قائم ہے۔ اگر ریح تین دن تک رک جائے تو روئے

زمین پر رہنے والی ہر چیز خراب اور بدبودار ہو جائے، کیونکہ ریح (ہوا) پنکھے کی مانند ہے جو ہر چیز کی خرابی کو دور کرتی رہتی ہے اور اسے صاف ستھرا رکھتی ہے، گویا یہ روح کی مانند ہے کہ جب یہ بدن سے نکل جاتی ہے تو اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور بدن خراب ہو جاتا ہے، پس بابرکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے"۔

انسان کو انسان کیوں کہتے ہیں؟

(پس اس نے صورت اختیار کر لی انسان کی) جب اس میں روح پھونکی گئی تو وہ انسانی صورت میں آگئی۔ علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "انسان کو اس لئے انسان کہتے ہیں کہ وہ بھول جاتا ہے، جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے "وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ " (طٰہٰ / ۱۱۵) تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جمعہ کے دن عصر کے بعد زمین کے ظاہری حصہ سے خلق فرمایا تو آدمؑ نام رکھا، پھر اللہ نے اسے اپنا عہد عطا کیا اور وہ بھول گیا تو انسان نام رکھا، خدا کی قسم ابھی اس کا سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اسے جنت سے نیچے بھیج دیا گیا"۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ "انسان" کو اس لئے انسان کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق ہی ایسے انداز میں کی گئی ہے کہ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ مانوسیت پائی جاتی ہے، اسی لئے انسان کو "مدنی الطبع" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انسان ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور ایک دوسرے کے اسباب واحتیاجات کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے انسان اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز سے الفت کرتا ہے۔ جبکہ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی وزن "اِفعِلاَن" ہے یعنی اس کی اصل "اِنسِیَان" ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اسے عہد الٰہی عطا ہوا لیکن اس نے اسے بھلا دیا۔

شارح کہتے ہیں: اگر "انسان" کو "انس" سے لیا گیا ہے تو اس کا وزن "فِعْلاَن" ہے اور یہ بصریوں کا موقف ہے، اور اگر اسے "نسیان" سے لیا گیا ہے تو اس کا وزن "اِفعَان" بنے گا جبکہ اس کی اصل "اِنسِیَان" بروزن "اِفعِلاَن" ہے لفظ کو خفیف کرنے کیلئے "یا" کو حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ کوفیوں کا مسلک ہے۔ اور سابقہ روایت ان کے اس مسلک کی مؤید ہے۔

(جو قوائے ذہنی کو حرکت دینے والا ہے) شارح بحرانیؒ کہتے ہیں کہ یہ انسان کے ان قُویٰ کی طرف اشارہ ہے جو اس کے باطن سے تعلق رکھتے، ادراک کرتے اور تصرف کرتے رہتے ہیں (اور فکری حرکات سے تصرف کرنے والا ہے) اپنی فکری حرکات کو اپنے معاش اور معاد کے امور میں کام میں لاتا ہے، حالانکہ انسان میں قوت متفکرہ صرف ایک ہی ہے اور وہ قوت ہے جو دماغ کے اندر اور اگلے درمیانی حصہ میں ہوتی ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ صورتوں کو صورتوں کے ساتھ، معانی کو معانی کے ساتھ، صورتوں کو معانی کے ساتھ اور معانی کو صورتوں کے ساتھ جوڑتی ہے۔ (اور اعضاء و جوارح سے خدمت لینے والا اور ہاتھ پیروں کو چلانے والا ہے) جوارح اور ادوات کا یا تو ایک ہی معنی ہے اور وہ ہے تمام جسمانی اعضاء و آلات، کیونکہ یہ نفس ناطقہ کے خادم ہوتے ہیں اور چلنے پھرنے کا واسطہ ہوتے ہیں۔ یا پھر پہلے سے عمومی معنی مراد ہے اور دوسرے سے بعض خصوصی اعضاء مراد ہیں جن پر تقلیب و تقلب یا الٹ پھیر اور چلنے پھرنے کی نسبت صحیح صادق آتی ہے، مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور دل وغیرہ۔ (اور ایسی شناخت کا مالک ہے جس سے حق

وباطل میں تمیز کرتا ہے) یہاں پر شناخت سے مراد، قوت عاقلہ ہی ہے کیونکہ حق اور باطل کلی امور ہوتے ہیں اور یہی قوت عاقلہ یا معرفت انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ (اور) اس کے ذریعہ (مختلف مزوں، بوؤں، رنگوں اور جنسوں میں فرق کرتا ہے)

رنگ، بو اور ذائقہ سے مراد

مزوں سے مراد چکھی جانے والی وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق زبان کی قوت مدرکہ سے ہے اور یہ وہ قوت ہوتی ہے جو اعصابی طور پر زبان کی سطح پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ زبان پر لگنے والی چیزوں کا ذائقہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میٹھا ہے یا کڑوا، کھٹا ہے یا نمکین وغیرہ۔

بوؤں سے مراد سونگھی جانے والی وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق ناک کی قوت مدرکہ سے ہے اور یہ وہ قوت ہوتی ہے جو ناک کے اگلے حصے میں ان دو زائد حصوں میں موجود ہوتی ہے جو پستان کے سر کی مانند ہوتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ بوؤں کا پتہ چلتا ہے کہ "خوش" ہیں یا "بد" وغیرہ۔

رنگوں سے مراد دیکھی جانے والی وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کا ادراک حس باصرہ سے ہوتا ہے اور یہ وہ قوت ہے جو دو پٹھوں میں موجود ہوتی ہے جو گہرے گول حلقوں میں ایک مرتبہ آپس میں ملنے کے بعد جدا ہو جاتے ہیں اور آنکھوں تک چلے جاتے ہیں۔ اسی قوت کے ذریعہ رنگوں کا ادراک کیا جاتا ہے کہ سیاہ ہے یا سفید، سرخ ہے یا زرد؟ اسی طرح شکلوں کا ادراک کیا جاتا ہے اور مقداروں کا تعین اور حرکتوں وغیرہ کو سمجھا جاتا ہے۔

اجناس اور جنسوں سے مراد وہ کلی امور ہوتے ہیں جو جزئیات میں غور و فکر کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضرت امیرؑ نے ان کا ذکر سب سے آخر میں کیا ہے اس لئے کہ جب نفس مدرکات اور مشاعر کے ذریعہ جزئیات کا ادراک کر لیتا ہے تو پھر بتا دیتا ہے کہ کونسی چیزیں باہم مشترک ہیں اور کونسی ایک دوسرے سے جدا جدا؟ اس سے "کلی تصورات" کو اخذ کیا جاتا ہے اور معلوم کیا جاتا ہے کہ کونسی چیزیں آپس میں مشترک ہیں اور کونسی ایک دوسرے سے جدا ہیں؟ اور شاید یہ مراد بھی ہو کہ اجناس سے مراد مطلق کلی امور ہوں اور وہ جنس مراد نہ ہو جو علم منطق اور علم کلام میں اصطلاحی طور پر رائج ہے۔

سوال: مزوں، بوؤں اور رنگوں کے درمیان فرق پیدا کرنا حواس ظاہرہ کا کام ہوتا ہے کیونکہ حواس ظاہرہ ان کا ادراک کرتے اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں، تو پھر ان کو عقل کی طرف نسبت دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اگرچہ ان چیزوں کا ادراک، حواس مذکورہ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات ان میں شک پیدا ہو جاتا ہے جسے دور کرنے کیلئے عقل کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، کیونکہ عقل ہی ایسے شکوک و شبہات کو دور کرتی ہے۔

ہشام بن حکم کا مناظرہ

اس کی مزید وضاحت کیلئے کتاب کافی کی روایت کو یہاں پر درج کیا جاتا ہے، اور وہ یہ کہ کافی میں اسناد کے ساتھ یونس بن یعقوب سے روایت کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے پاس ایک مرتبہ آپؑ کے کچھ اصحاب بیٹھے ہوئے تھے جن

میں حمران بن اعین، محمد بن نعمان، ہشام بن سالم، طیار اور دوسرے بہت سے لوگ بھی تھے۔ ان میں "ہشام بن حکم" بھی شامل تھے جو اس وقت بالکل نوجوان تھے۔ اسی دوران میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے ہشام سے فرمایا: "عمرو بن عبید کے ساتھ تمہاری کیا گفتگو ہوئی، ذرا بتاؤ تا!!" اس پر ہشام نے کہا: "فرزند رسولؐ! آپؑ کے سامنے میری کیا مجال کہ کچھ بول سکوں، مجھے شرم محسوس ہوتی ہے اور زبان کچھ نہیں بیان کر سکتی" حضرتؑ نے فرمایا: "جب میں نے تمہیں حکم دے دیا ہے تو پھر اسے بجالاؤ!!" ہشام نے کہا: "مجھے معلوم ہوا کہ "عمرو بن عبید" "مسجد بصرہ" میں بیٹھ کر بہت سی غلط باتیں کرتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں خود ہی اس کے پاس پہنچ گیا جمعہ کا دن تھا، میں مسجد بصرہ کے اندر چلا گیا دیکھا کہ ایک بہت بڑے مجمع نے اسے گھیر اہوا ہے۔ اس نے سیاہ چادر اپنے اوپر لپیٹی ہوئی تھی، اونی شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور لوگ اس سے مسائل پوچھ رہے تھے۔ میں بھی اجازت طلب کر کے مجمع کے آخر میں جا بیٹھا اور اس سے کہا "اے عالم! میں ایک مسافر شخص ہوں مجھے آپ ایک مسئلہ پوچھنے کی اجازت دیتے ہیں؟" اس نے اثبات میں جواب دیا، اس پر میرا اس کے ساتھ یوں سلسلہ کلام شروع ہوا: میں نے کہا: آیا آپ کی آنکھیں ہیں؟

اس نے کہا: بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ دیکھ نہیں رہے ہو؟ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟

___: میرے سوالات ایسے ہی ہوں گے!

___: بیٹے! پوچھو خواہ احمقانہ باتیں ہی ہوں!!

___: آپ مجھے جواب دیں!

___: پوچھو!

___: آپ کی آنکھیں ہیں؟

___: ہاں، ہیں!!

___: ان سے کیا کام لیتے ہیں؟

___: رنگ اور چیزوں کو دیکھتا ہوں!!

___: ناک ہے؟

___: ہاں، ہے!!

___: اس سے کیا کام لیتے ہیں؟

___: سونگھتا ہوں!!

___: منہ ہے؟

___: ہاں، ہے!!

___: اس سے کیا کرتے ہیں؟

___: طعام کا ذائقہ چکھتا ہوں!!

___ :کان ہیں ؟
___ :ہاں، ہیں!!
___ :ان سے کیا کام لیتے ہیں ؟
___ : آوازوں کو سنتا ہوں!!
___ :دل ہے ؟
___ :ہاں، ہے!!
___ :اس سے کیا کام لیتے ہیں ؟
___ :جب تمام اعضاء و جوارح اور حواس کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو دل کی طرف رجوع کر کے اپنے شکوک و شبہات کو دور کرتا ہوں!!
___ : تو کیا یہ اعضاء اور حواس دل سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ؟
___ :نہ، بالکل نہیں!!
___ : کیوں ؟ جبکہ یہ بالکل صحیح و سالم بھی ہوتے ہیں!
___ :بیٹا! بات یہ ہے کہ حواس اور اعضاء جب کسی چیز کے سونگھنے، کسی چیز کے دیکھنے اور کسی چیز کے چکھنے میں شک کرتے ہیں تو فوراً اسے دل کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور وہ اس کے بارے میں غور و فکر کر کے صحیح فیصلہ دے دیتا ہے جس سے یقین ظاہر ہو جاتا ہے اور شکوک و شبہات زائل ہو جاتے ہیں۔
___ : تو گویا اللہ نے دل کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ اعضاء و جوارح اور حواس میں پیدا ہونے والے شک کو دور کرے ؟
___ :بالکل!!
___ : تو گویا دل کا ہونا ضروری ہے، ورنہ اعضاء و حواس سے شکوک و شبہات نہیں دور ہوں گے!!
___ :بالکل ایسا ہی ہے!!
___ : تو اے ابو مروان! اللہ تعالیٰ نے ان چند حواس اور اعضاء و جوارح کو بغیر امام کے (جو کہ دل ہے) نہیں چھوڑا جو ان کیلئے صحیح کو صحیح کر کے پیش کرتا ہے اور ان میں پیدا ہونے والے شک کو دور کرتا ہے، لیکن اس قدر عظیم دنیا کو، اس قدر خلق خدا کو ایسے چھوڑ دیا ہے کہ حیرت، شک اور اختلافات میں پڑے رہیں! ان کیلئے کوئی امام مقرر نہیں فرمایا جو ان کے شکوک و شبہات اور اختلافات کو دور کرے ؟ تمہارے چند اعضاء و جوارح اور حواس میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے دور کرنے کیلئے تو امام ہو لیکن انسانوں کے درمیان اختلافات اور شکوک و شبہات دور کرنے کیلئے امام نہ ہو ؟ حیف ہے!!
اس پر وہ بالکل خاموش ہو گیا اور کوئی بات نہ کر سکا پھر کچھ دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوا اور کہا :
___ : کیا تم ہشام بن حکم ہو ؟!

___: اگر میں کہوں نہ ؟
___: تو پھر اس کے ساتھیوں میں سے ہو ؟
___: اگر کہوں نہ ؟
___: کہاں کے رہنے والے ہو ؟
___: کوفہ کے !
___: پھر تم یقیناً وہی ہو !

اس کے بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ ملالیا اور اپنی جگہ پر بٹھایا اور جب تک میں وہاں پر بیٹھا رہا وہ ایک لفظ تک نہ بولا گویا وہ اس مجلس میں ہے ہی نہیں۔ اس پر حضرت امام جعفر صادقؑ مسکرائے اور مجھ سے فرمایا: "ہشام! تمہیں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟" میں نے عرض کیا: "یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے آپؑ سے سنی ہیں اور اپنے پلے باندھ لیا ہے!" یہ سن کر حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی قسم! یہی چیزیں صحف ابراہیم و موسیٰ میں مکتوب ہیں!"

دل شک کو کیونکر دور کرتا ہے؟

ایک محقق شارح حدیث (صدرائے شیرازی) کہتے ہیں کہ: "حواس کے شک اور غلطی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ حس یا وہم کسی اور حس کے ساتھ مل جاتا ہے جو کسی سبب کی بنا پر شک یا غلطی کرتا ہے پھر "نفس" عقل کی قوت کے ساتھ جان لیتا ہے کہ یقینی طور پر حق کیا چیز ہے؟ مثلاً بعض اوقات آنکھ کسی بڑی چیز کو دوری کی وجہ سے چھوٹا دیکھتی ہے یا قریب ہونے کی وجہ سے چھوٹی چیز کو بڑا دیکھتی ہے۔ یا بھینگا شخص ایک کو دو دیکھتا ہے یا جو درخت حوض کے کنارے کھڑا ہوتا ہے، دیکھنے والا پانی میں اس کے سائے کو الٹا دیکھتا ہے، یا پہاڑ کے ساتھ کھڑے ہو کر آواز دینے کو کان دگنی آواز میں سنتا ہے، کیونکہ ہوا جب آواز کو اپنے دوش پر اٹھا کر پہاڑ کے ساتھ جا کر ٹکراتی ہے تو پھر اس سے ایک اور آواز اٹھتی ہے جسے صدائے بازگشت کہتے ہیں، اور کان سے جا کر ٹکراتی ہے۔ یا جیسے زبان پر صفرا کی تلخی کا غلبہ ہوتا ہے تو میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے یا زکام کی وجہ سے خوشبوؤں سے بھی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ اور اس قسم کی کئی دوسری مثالیں بھی ہیں۔ تو یہاں پر متعلقہ حس غلطی کھا جاتی ہے لیکن یہ دل ہی ہے جو حقیقت حال کو واضح کر دیتا ہے"۔

تو یہ بات اب اچھی طرح واضح ہو گئی کہ حق کو باطل سے جدا کرنا اور محسوسات میں شک و شبہہ کے وقت شکوک کو دور کرنا عقل اور دل کا کام ہوتا ہے جو ایک لطیف اور نورانی چیز ہوتی ہے جس کا پہلا تعلق اس صنوبری شکل کے دل کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی حس و حرکت کے دوسرے اعضاء کی نسبت ایسے ہے جیسے خود نفس کو حس و حرکت کے قوا کے ساتھ نسبت ہوتی ہے، کہ اس سے خون اور روح کے سوتے پھوٹتے ہیں اور دیگر اعضاء تک جا پہنچتے ہیں۔ پس "نفس" تمام اعضاء کا سردار اور امام ہوتا ہے اور "دل" اس کا مرکزی ٹھکانہ ہوتا ہے جہاں سے وہ حکم خدا تمام اعضاء پر فرمانروائی کرتا ہے۔

(اس) انسان (کا خمیر رنگارنگ کی مٹی سے ہے) اور اس مٹی کے اصل سے ہے، اور یہ انسان کے مختلف اجزاء کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بعض اعضاء مثلاً ہڈیاں اور چربی سفید رنگ کی ہے، بعض جیسے خون اور گوشت سرخ رنگ کے ہیں، بعض جیسے بال اور آنکھ کے ڈھیلے سیاہ رنگ کے ہیں۔ اسی طرح دیگر اعضاء اور اجزا کے اختلاف کی مانند نوع انسانی کے افراد بھی مختلف ہوتے ہیں، کوئی سعید اور نیک بخت ہے تو کوئی شقی و بدبخت، کوئی پاک ہے تو کوئی پلید۔ اور ہر ایک کا اختلاف اس کے مواد کی وجہ سے ہے۔

انسان کی مختلف طبیعتیں

(اور ملتی جلتی موافق چیزوں سے ہے) جیسے ہڈیوں اور دانتوں کی باہمی موافقت ہے یا اس قسم کی اور چیزیں ہیں کہ یہ ایسے اجسام ہیں جو ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں، اور انہی سے انسانی صورت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ (اور متضاد خلطوں سے اس کا خمیر ہوا ہے یعنی گرمی، سردی، خشکی، تری اور غم اور خوشی کا پیکر ہے)......

ایک قول کے مطابق گرمی سے مراد "صفراء"، سردی سے مراد "بلغم"، تری سے مراد "خون" اور خشکی سے مراد "سوداء" ہے۔ تو گویا حضرتؑ نے اپنے کلام کے اس حصہ میں انسان کی چار طبیعتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جن کے ذریعہ سے "مزاج" بنتا ہے اور اسی مزاج کے ساتھ ہی انسانی جسم قائم و برقرار ہے۔ ایک حدیث کے مطابق کہ جسے قمیؒ نے ذکر کیا ہے اور اس کا تتمہ یہ ہے کہ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں کہ: "...... پھر اللہ تعالیٰ نے چار ملائکہ یعنی شمال، جنوب، صبا اور دبور کو حکم دیا کہ "مٹی کے اس پتلے" کے گرد چکر لگائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے اندر چار طبیعتوں کا اجرا کر دیا ...... چنانچہ انسانی جسم کے طبائع اربعہ (چار طبیعتوں) میں سانس "شمال" کی طرف سے ہے، بلغم "صبا" کی طرف سے ہے، تلخی "دبور" کی طرف سے ہے اور خون "جنوب" کی طرف سے ہے۔ ...... پس جب طبیعت انسانی مستقل ہو گئی اور بدن مکمل ہو گیا، تو سانس کی جانب سے اسے عورتوں کی محبت، طویل آرزوئیں اور حرص جیسی چیزیں لاحق ہو گئیں۔ "بلغم" کی جانب سے کھانے پینے، نیکی کرنے، حلم و بردباری اور نرمی جیسی چیزیں لاحق ہو گئیں، "تلخی" کی جانب سے اسے غصہ، شیطنت، تکبر، سرکشی اور جلدبازی جیسی بری خصلتیں لاحق ہو گئیں اور "خون" کی طرف سے فتنہ و فساد، اذیتوں، حرام کے ارتکاب اور خواہشات نفسانی جیسی برائیاں لاحق ہو گئیں، ......"

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں، حضرت امیرؑ کا یہ کلام ہم نے آپؑ کے ایک مکتوب گرامی میں دیکھا ہے۔

اب رہی یہ بات خوشی اور غمی کی تو ان دونوں کا تعلق نفسانی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور خوشی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب انسان کمال کا ادراک کرتا ہے اور مناسب محسوسات کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور اپنی مراد کو پانے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے، اپنے غیر پر غلبہ و تسلط پا لیتا ہے، رنج و غم سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے، لذتوں کو یاد کرتا ہے تو اپنے اندر خوشی محسوس کرتا ہے جبکہ غم کا سبب ان چیزوں کے مقابل نکات ہیں ......

گیارہویں فصل

ملائکہ کا سجود۔اور۔ابلیس کا انکار

وَاسْتَادَى اللهُ الْمَلائِكَةَ وَدِيْعَتَهُ لَدَيْهِمْ وَ عَهْدَوَصِيَّتِهِ اِلَيْهِمْ فِي الْاِذْعَانِ بِالسُّجُوْدِ لَهُ وَ الْخُشُوْعِ لِتَكْرِمَتِهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا اِلاَّ اِبْلِيْسَ وَقَبِيْلَهُ (وَجُنُوْدَهُ) اعْتَرَتْهُمُ الْحَمِيَّةُ وَغَلَبَتْ عَلَيْهِمُ الشِّقْوَةُ تَعَزَّزُوْا بِخِلْقَةِ النَّارِ وَاسْتَهْوَنُوْا خَلْقَ الصَّلْصَالِ فَاَعْطَاهُ اللهُ النَّظْرَةَ اسْتِحْقَاقًا لِلسُّخْطَةِ وَ اسْتِتْمَامًا لِلْبَلِيَّةِ وَ اِنْجَازًا لِلْعِدَّةِ فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ.

پھر اللہ نے فرشتوں سے چاہا کہ وہ اس کی سونپی ہوئی ودیعت ادا کریں اور اس کے پیمان وصیت کو پورا کریں جو سجدہ آدم کے حکم کو تسلیم کرنے اور اس کی بزرگی کے سامنے تواضع وفروتنی کیلئے تھا اس لئے اللہ نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو ابلیس اور اس کی جماعت (یا لشکر) کے سوا سب نے سجدہ کیا انہیں عصبیت میں گھیر لیا، بدبختی ان پر چھا گئی آگ سے پیدا ہونے کی وجہ سے اپنے کو بزرگ و برتر سمجھا اور کھنکھناتی ہوئی مٹی کی مخلوق کو ذلیل جانا۔ اللہ نے اسے مہلت دی تاکہ وہ پورے طور پر غضب کا مستحق بن جائے۔ اور بنی آدم کی آزمائش پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ اور وعدہ پورا ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے اس سے کہا کہ تجھے وقت معین کے دن تک کی مہلت ہے۔

تشریح

"اِسْتَادَی اللّٰهُ الْمَلائِكَةَ" اللہ نے ملائکہ سے ادا کرنا طلب کیا "خُشُوْع" بروزن خضوع لفظی اور معنوی لحاظ سے۔ "تَكْرِمَةٌ" کا معنی یا تو تکریم و تعظیم اور احترام ہے، باب تفعیل کا دوسرا مصدر ہے یا پھر "تَكْرِيْمٌ" کا اسم ہے۔ "اِبْلِيْس" بروزن "اِفْعِيْل" ہے۔ "اَبْلَسَ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے مایوس۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے: "فَاِذَا هُمْ مُبْلِسُوْنَ" (انعام/۴۴) پس وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں۔

عبرانی میں اس کا نام "عَزَازِيْل" (دو زا کے ساتھ) ہے اور عربی میں "حارث" ہے اس کی کنیت "اَبُوْ مَرَّه" ہے۔

"قَبِيْل" اصل میں ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد تین سے زیادہ ہوں اور مختلف اقوام ہوں۔ اگر ایک باپ کی اولاد ہوں تو "قبیلہ" کہلاتے ہیں، البتہ انہیں کبھی "قَبِيْل" بھی کہا جاتا ہے، اس کی جمع "قُبُل" ہے جبکہ قبیلہ کی جمع "قَبَائِل" ہے، "نَظِرَةٌ" بروزن "كَلِمَةٌ" اسم ہے "اَنْظَرْتُ الدَّيْنَ" سے یعنی میں نے قرض خواہی کو مؤخر کر دیا جیسا کہ ارشاد باری ہے "فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ" (بقرہ/۲۸۰) یعنی آسانی کے حصول تک قرض خواہی کو مؤخر کر دینا چاہئے۔

اعراب کے لحاظ سے "اَلْمَلائِكَةَ" منصوب بنزع الخافض ہے اصل میں "مِنَ الْمَلائِكَةِ" ہے۔ اور ان سے ابلیس کا استثنا یا تو استثنائے منقطع ہے جیسا کہ علمائے امامیہ کے درمیان یہ بات ظاہر اور مشہور ہے، اور بہت سے معتزلہ بھی اسی کے قائل ہیں، یا پھر استثنائے متصل ہے، جیسا کہ بہت سے علمائے اہل سنت اس کے قائل ہیں، اور ہم میں سے شیخ کتاب "التِّبْيَان" میں اسی موقف کو

درست سمجھتے ہیں اور اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا ابلیس جنات میں سے ہے یا ملائکہ سے ؟ اس کی مزید تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(اور اللہ نے ملائکہ سے چاہا کہ وہ اس کی سونپی ہوئی ودیعت ادا کریں اور اس کے پیمان وصیت کو پورا کریں)۔ اس وصیت اور ودیعت سے مراد وہی چیزیں ہیں جن کی طرف اللہ نے سورۂ حجر اور صٓ میں ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ ودیعت کے بارے میں فرماتا ہے: "وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِاِنِّي خَالِقٌ بَشَرًامِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ.فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْالَهٗ سٰجِدِيْنَ" (حجر / ۲۸۔۲۹) اور (وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک شدہ مٹی سے جو بدبودار کیچڑ سے لی گئی ہے خلق کروں گا، جب میں اس کام کو انجام دے لوں اور اس میں اپنی ایک (شائستہ اور عظیم) روح پھونک دوں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا۔

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں_ قمی کی روایت کی بنا پر_ یہ حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے کی بات ہے جو ایک ودیعت کے طور پر ان فرشتوں کو سونپی گئی۔ دوسری یعنی وصیت کے بارے میں فرماتا ہے "اِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ اِنِّي خَالِقٌ بَشَرًامِنْ طِيْنٍ فَاِذَاسَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْالَهٗ سٰجِدِيْنَ" (صٓ / ۷۱۔۷۲) اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔ جب میں اسے درست اور منظم کر لوں اور اپنی روح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کیلئے سجدہ میں گر جانا، تو خداوند عالم نے انہیں وصیت کی اور اپنا عہد ان تک پہنچایا کہ ایک بشر پیدا کر رہا ہے جس کا سجدہ انہیں اس وقت ضرور کرنا ہوگا جب وہ ٹھیک سے بن جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے۔ حضرت امیرؑ بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں (جو سجدہ آدم کے حکم کو تسلیم کرنے اور اس کی بزرگی کے سامنے تواضع اور فروتنی کیلئے تھا) پس خداوند سبحانہ نے آدم کے ٹھیک ٹھاک اور درست کر لینے اور روح پھونک دینے کے بعد (فرمایا آدمؑ کو سجدہ کرو) حضرت امام جعفر صادقؑ کے بقول یہ خطاب جمعہ کے دن ظہر کے وقت ہوا (تو ان سب نے سجدہ کیا) اور اسی دن عصر تک سجدہ میں پڑے رہے (لیکن ابلیس نے) نہیں کیا حضرت امام رضاؑ فرماتے ہیں کہ اس کا نام "حارث" اور کنیت "ابو مرہ" ہے۔ اسے ابلیس اس لئے کہتے ہیں کہ یہ نامراد اللہ کی رحمت سے مایوس ہو چکا ہے (اور سوائے اس کی جماعت) (یا بروایتے اس کے لشکر کے) محدث اہل بیتؑ حضرت علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں اس مقام پر ابلیس کے ساتھ اس کی "قبیل" (جماعت) کو ملانا تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ اس وقت آسمان میں اس کی اولاد و جماعت اور قوم و قبیلہ کوئی نہیں تھا۔ ہاں البتہ اس سے اس جیسے جن مراد ہو سکتے ہیں جو اس وقت زمین پر موجود تھے اور وہ بھی سجدے کے حکم میں داخل تھے، لیکن آیات و روایات میں ان کا ذکر اس لئے نہیں آیا کہ انہیں ناقابل اعتناء سمجھا گیا ہے، البتہ اس سے مراد ایک وہ ٹولہ بھی ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں فرشتوں کے علاوہ خلق فرمایا تھا، اور قبیل سے مراد ابلیس کی ذریت اور اولاد بھی ہو سکتی ہے، اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی نسبت ان کی طرف بھی دی گئی ہے کیونکہ وہ اس کے فعل پر راضی ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیرؑ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "لوگوں کی رضامندی اور ناراضی سب کو ایک جگہ پر جمع کر دیتی ہے، جیسا کہ ناقہ صالح کو پے کرنے والا صرف ایک شخص تھا لیکن عذاب نے سب کو عمومی طور پر آلیا، اس لئے کہ وہ سب عمومی طور پر اس کے اس فعل پر راضی

تھے"اسی پر خالق فرماتا ہے "فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نَادِمِيْنَ" (شعراء / ۱۵۷) آخر کار انہوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر اپنے کیے پر نادم ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہترین جواب آخری ہے، اور اس جواب کے ساتھ اس بات کو بھی شامل کیا جائے گا جسے سید رضیؒ نے حضرت امیرؑ کے ایک مکتوب کے آخر میں روایت کیا ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں: "کسی قوم کے فعل پر راضی ہونے والا بھی اسی قوم میں شمار ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: "قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" (آل عمران / ۱۸۳) اے پیغمبر! آپ ان سے کہئے کہ پھر تم نے مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کو کیوں قتل کیا جبکہ وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم کہتے ہو لے کر آئے تھے؟ اگر تم لوگ سچے ہو (تو جواب دو)۔ کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپؑ فرماتے ہیں: "قاتلین اور قائلین کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ تھا لیکن اللہ نے ان لوگوں کو بھی قاتل قرار دیا جو ان کے اس فعل پر راضی تھے"۔ اسی طرح تفسیر عیاشی میں بھی بہت سی روایات ہیں (انہیں عصبیت نے گھیر لیا اور بدبختی) اور گمراہی (ان پر چھا گئی، آگ سے پیدا ہونے کی وجہ سے اپنے کو بزرگ و برتر سمجھا اور کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو حقیر سمجھا) اور کہا: "ہمارا جوہر اور مادہ آدمؑ کی مٹی کے جوہر سے بہتر ہے لہذا ہم اس کا سجدہ نہیں کریں گے، کیونکہ سجدہ ہمیشہ جوہر کے شرف کو ہوتا ہے اور آگ کا شرف مٹی کے شرف سے زیادہ قیمتی ہے" اسی چیز کو اللہ تعالی نے سورہ اعراف میں بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ" (اعراف / ۱۲) خدا نے (ابلیس سے) فرمایا تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا جب میں نے تجھے حکم دیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے۔

کافی اور احتجاج طبرسیؒ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے پاس جناب ابو حنیفہ آئے تو امامؑ نے ان سے دریافت فرمایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم قیاس سے کام لیتے ہو؟" اس نے کہا "جی ہاں! ایسا ہی ہے" فرمایا "قیاس نہ کیا کرو! کیونکہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا، جب اس نے خدا سے کہا تھا: "تو نے مجھے آگ سے اور آدمؑ کو خاک سے پیدا کیا ہے" اس نے آگ اور مٹی کے درمیان قیاس کیا تھا اگر وہ آدمؑ کی نورانیت کو آگ کی نورانیت سے قیاس کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ ان دونوں قسم کی نورانیت میں سے کونسی نورانیت افضل اور صاف و شفاف ہے"۔

ایک فاضل شخصیت نے اس موقع پر یوں کہا ہے کہ: "ابلیس کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس نے فضیلت کو جوہر اور عنصر کے تناظر میں دیکھا، لیکن اگر وہ فاعل کے تناظر میں دیکھتا تو یقیناً خود پر آدمؑ کی فضیلت کا اعتراف کر لیتا کیونکہ اللہ نے آدمؑ کی روح کو اپنی طرف نسبت دی اور ان کی تخلیق کو اپنے ہاتھ کی طرف نسبت عطا کی اور اس طرح سے آدمؑ کو جو عزت عطا ہوئی تو وہ اس کا معترف ہو جاتا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے: "فَاِذَا نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" (جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں) اور دوسری جگہ پر فرماتا ہے: "لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" (جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے خلق فرمایا) پھر یہ کہ اس نے اپنی ذات کے بارے میں جو قیاس کیا تھا وہ بھی غلط تھا کیونکہ مٹی امین ہوتی ہے جو کچھ اسے امانت کے طور پر دیا جائے وہ اسے محفوظ رکھتی ہے، برخلاف آگ کے کیونکہ یہ بد

دیانت اور خائن ہے، جو کچھ اس میں ڈالا جائے اسے بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ آگ متکبر ہے اور سر اٹھانے کو ترجیح دیتی ہے جبکہ خاک متواضع ہے، پستی کو دوست رکھتی ہے اور تواضع تکبر سے افضل ہوتی ہے(۱) ہماری ان گزارشات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ قیاس کے ذریعہ عمل باطل ہوتا ہے۔ اور علمائے امامیہ نے علم اصول میں ایک عنوان قائم کیا ہے اور حکم لگایا ہے کہ شرعی احکام میں قیاسات اور استحسانات عقلیہ کے ساتھ بجالایا جانے والا عمل باطل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم بہت سے مقامات پر دیکھتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کا حکم ہماری ناقص عقلوں کے برخلاف ہے، مثلاً:

۱۔ نجس ہونے والے کنویں کو پاک کرنے کیلئے نکالے جانے والے ڈولوں کی تعداد میں اس طرح فرق ہوتا ہے کہ نجس کر دینے والی بعض چیزیں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ان کیلئے ڈولوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے اور بعض چیزیں مختلف ہوتی ہیں لیکن ڈولوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔

۲۔ وضو کو باطل کر دینے والی چیزوں میں نیند کو پیشاب اور پاخانہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۳۔ حرم سے باہر احرام باندھنا واجب ہے حالانکہ حرم میں باندھنا افضل ہونا چاہیے۔

۴۔ قدم کے ظاہری حصہ پر مسح کرنا واجب ہے حالانکہ باطنی حصہ پر مسح کرنا افضل ہونا چاہیے۔

---

(۱) صدر المتالہین شیرازیؒ اپنی کتاب "مفاتیح الغیب" میں فرماتے ہیں کہ: "اس (ابلیس) کی استدلالی غلطی کئی وجوہات کی بناپر تھی، مثلاً:

۱۔ ہم تسلیم کرلیتے ہیں کہ آگ مٹی سے افضل ہے تو یہ اس کے ظاہر کی بناپر ہوگی جبکہ اسے حقیقت میں مٹی پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ مقصد اور حقیقت کے لحاظ سے مٹی افضل ہے، اس لئے کہ مٹی کے خواص میں سے ہے کہ اس سے نباتات اگتی اور نشو و نما پاتی ہیں، اسی لئے روح کا تعلق مٹی سے قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اس میں رہ کر ارتقائی مراحل طے کرے جبکہ آگ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

۲۔ مٹی میں لیس دار مادہ بھی ہوتا ہے اور وہ روکنے کا کام بھی دیتا ہے لہذا جب روح اس کی اس خاصیت سے تربیت کا فیض اٹھاتی ہے تو وہ فیوضات الٰہی کو بھی قابو کرنے کی پوزیشن میں آجاتی ہے، جبکہ عالم ارواح میں اس قابل نہیں تھی۔

۳۔ مٹی مرکب ہوتی ہے خاک اور پانی سے، پانی زندگانی دنیا کی سواری کی مانند ہے، جیساکہ خداوند متعال فرماتا ہے "وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (ہم پانی سے ہر زندہ چیز کو خلق فرمایا ہے) اور مٹی نفس نباتی کی سواری کی مانند ہے جب دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو ان سے "نفس حیوانی" پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کی سواری "روح حیوانی" ہوتی ہے اور وہ "روح انسانی" کی سواری ہوتی ہے، اور "جوہر نطقی" روحانی مناسبت کے لحاظ سے ان کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، جبکہ آگ اس کے برعکس ہے جو سب کچھ ہلاک اور برباد کر دیتی ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ آدمؑ کو ملائکہ کا سجدہ کرنا اور ان کی فرشتوں پر فضیلت صرف مٹی کے خواص کی وجہ سے نہیں ہے کہ چونکہ اس میں صلاحیت اور قبولیت کی خاصیت ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے دست خداوندی کے خمیر کرنے کی وجہ سے شرف حاصل ہے، جیساکہ خدا فرماتا ہے: "اے ابلیس! تجھے کس چیز نے اس کے سجدہ کرنے سے منع کیا ہے جسے میں نے اپنے قدرت کے ہاتھوں سے خلق کیا ہے؟" اور آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی مٹی چالیس دن تک اپنے دست قدرت سے گوندھی"۔ لیکن حقیقی اور اصلی فضیلت تو اسے اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس میں وہ روح پھونکی گئی ہے جس کی نسبت اور اضافت کسی واسطے کے بغیر ذات پروردگار کی طرف ہے۔ اور خداوند فرماتا ہے: "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" (جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں) ساتھ ہی آدمؑ کو تجلیات الٰہیہ سے بھی نوازا گیا ہے جب ان میں روح الٰہی پھونکی گئی تو ان میں تجلیات الٰہیہ کا ظہور بھی ہونے لگا، جیساکہ حضرت رسالتمآبؐ فرماتے ہیں: "اللہ نے آدمؑ کو خلق فرمایا اور اس میں تجلیات کا ظہور ہوا"۔ ابھی گذر چکا ہے کہ ابلیس ملعون کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے "مادہ عنصریہ" اور خدا کی طرف منسوب "صورت روحانیہ" میں کوئی فرق قائم نہیں کیا۔ اور اس کی آنکھیں "صفت انسانی" اور "صورت ذاتی" سے اندھی رہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب آدمؑ کا صرف ڈھانچہ تیار ہو گیا تھا، اس وقت اللہ نے فرشتوں کو اس کے سجدے کا حکم نہیں دیا بلکہ روح پھونکنے کے بعد فرمایا: "اسے سجدہ کرو!"۔ اس لئے کہ آدمؑ میں جب خدا کی روح پھونک دی گئی تو وہ تجلیات الٰہیہ کے قابل ہو گئے کیونکہ اب ان میں روح کی صفات بھی اور روح کی نورانیت بھی یکجا ہو چکی تھیں اس سے وہ تجلی کے حقدار بن گئے تھے اور اب وہ مٹی فیض الٰہی سے چمک رہی تھی اور اسی تجلی اور چمک کے باعث جناب آدمؑ سجدہ ملائکہ کے مستحق بن گئے تھے۔ کیونکہ ان کا دل حقیقی "کعبہ" کی حیثیت اختیار کر گیا اور ملائکہ کے سجدہ کرنے کا مرکز قرار پایا۔ امید ہے انشاء اللہ آپ ہماری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے اور اس سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھائیں گے۔

۵۔ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے جبکہ اس سے ایک دن پہلے واجب ہے اور ایک دن بعد مستحب۔

۶۔ اگر کوئی کسی کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے تو اس پر پانچ سو دینار دیت واجب ہو جاتی ہے جو مکمل دیت کا نصف ہے لیکن اگر کوئی شخص چوری کرے اور وہ ایک چوتھائی دینار تک کی مالیت کی ہو تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

۷۔ ایک چوتھائی دینار کی چوری پر تو ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے لیکن مال غصب کرنے پر ایسا کرنا جائز نہیں خواہ ہزار دینار مالیت کا ہو۔ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے امور ہیں جو ایک محقق کو غور و فکر اور جانچ پڑتال کرنے سے مل جائیں گے۔ اسی لئے ائمہ اطہار علیہم السلام نے قیاس اور عقلی استحسان پر عمل کرنے سے روک دیا ہے لہذا کہیں پر فرماتے ہیں: "اِنَّ دِیْنَ اللّٰہِ لَا یُصَابُ بِالْعُقُوْلِ" خدا کا دین عقلوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یا فرماتے ہیں: "اِنَّ السُّنَّۃَ اِذَا قِیْسَتْ مُحِقَ الدِّیْنُ" جب سنت میں قیاس در آئے تو دین مٹ جاتا ہے۔ یا فرماتے ہیں: "اِنَّہٗ لَا شَیْءَ اَبْعَدُ مِنْ عُقُوْلِ الرِّجَالِ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ" خدا کے دین سے بڑھ کر لوگوں کی عقلوں سے کوئی اور چیز دور تر نہیں ہے۔

جناب ابو حنیفہ سے حضرت امام جعفر صادقؑ کی گفتگو

اس سے پہلے کہ ہم قیاس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی ابو حنیفہ سے گفتگو بیان کریں ابان بن تغلب کی امام جعفر صادقؑ سے ایک دلچسپ گفتگو آپ بھی سماعت فرمایئے:

شیخ صدوقؒ اور شیخ کلینیؒ نے اسناد کے ساتھ ابان بن تغلب سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا کہ: "آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس نے کسی عورت کی انگلیوں میں سے ایک انگلی کو کاٹ ڈالا؟ اس پر کیا دیت لازم آئے گی؟"

امامؑ نے فرمایا: دس اونٹ!

میں نے پوچھا: اگر دو انگلیاں کاٹ ڈالے؟

___ : بیس اونٹ!

___ : اگر تین انگلیاں کاٹ ڈالے؟

___ : تیس اونٹ!

___ : اگر چار انگلیاں کاٹ ڈالے؟

___ : بیس اونٹ!

___ : سبحان اللہ! عجیب بات ہے تین انگلیوں پر تو تیس اونٹ ہوں اور چار پر بیس؟ یہ بات ہمیں عراق میں بتائی جاتی، لیکن ہم اس کے قائل سے اظہار برائت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے ایسی بات لانے یا کرنے والا شیطان ہے!"

___ :ابان !ایسی باتیں نہ کیا کرو یہ تو حضرت رسول خداؐ کا حکم ہے اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ :"عورت دیت کی ایک تہائی تک مرد کے برابر ہے اور جب تہائی تک پہنچ جائے گی تو پھر نصف تک لوٹ آئے گی۔ ابان! تم نے مجھ سے قیاس کے تحت فیصلہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یاد رکھو! جب سنت میں قیاس در آئے تو دین مٹ جاتا ہے"۔

احتجاج طبرسیؒ میں حضرت امام جعفر صادقؑ کے متعلق ہے کہ ایک مرتبہ آپؑ سے حضرت ابو حنیفہ نے ملاقات کی تو امامؑ نے ان سے پوچھا:

___ : آپ کون ہیں ؟

___ :ابو حنیفہ !

___ :اہل عراق کے مفتی!

___ :جی ہاں!

___ : آپ لوگوں کو کیونکر فتویٰ دیتے ہیں ؟

___ : کتاب خدا سے!

___ : تو گویا آپ کتاب خدا کے عالم ہیں اس کے ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کو بھی تو جانتے ہوں گے ؟

___ :جی ،بالکل!

___ : تو آپ مجھے اس آیت "وَ قَدَّرۡنَا فِيۡهَا السَّيۡرَ سِيۡرُوۡا فِيۡهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيۡنَ "(سبا /۱۸) یعنی ہم نے کچھ ایسی اور آبادیاں بھی رکھی تھیں جن میں ایسے نزدیک فاصلے تھے کہ ایک سے دوسری دکھائی دیتی تھی اور ہم نے ان سے کہا تم مکمل امن وامان کے ساتھ راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی ان آبادیوں کے درمیان سفر کرو"۔ کے متعلق بتایئے کہ وہ کونسی آبادیاں ہیں؟

___ : یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان آبادیاں ہیں!

___ :(حاضرین سے متوجہ ہو کر) خدا کیلئے آپ مجھے بتائیں کیا آپ لوگوں نے مکہ اور مدینہ کے درمیان کبھی سفر کیا ہے؟ اور کیا آپ نے ان مقامات پر کبھی بے خوف و خطر ہو کر سفر کیا اور کبھی تمہیں اپنی جان و مال کا خطرہ لاحق نہیں رہا؟

ان لوگوں نے کہا :"بالکل رہا ہے اور آج تک ڈر ڈر کر سفر کرتے ہیں!" آپ نے حضرت ابو حنیفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ابو حنیفہ ! کیا بات ہے ؟ جبکہ خدا تو سچ ہی فرماتا ہے !" پھر فرمایا :"اچھا بتاؤ! اللہ تعالیٰ کے اس قول "مَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا "(آل عمران /۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا! میں مذکورہ "مقام امن "کونسی جگہ ہے ؟"

___ :وہ اللہ کا محترم گھر خانہ کعبہ ہے!

___ :(حاضرین کی طرف منہ کر کے) خدا کیلئے مجھے بتایئے عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن جبیر جب وہاں پہنچے تو کیا قتل سے محفوظ رہے ؟

حاضرین نے کہا :"ہر گز نہیں !" اس پر امامؑ نے فرمایا "ابو حنیفہ !افسوس کی بات ہے خدا تو سچ فرماتا ہے"۔

___: میرے پاس کتاب خدا کا کوئی زیادہ علم تو نہیں البتہ قیاس سے ضرور کام لیتا ہوں۔

___: اگر آپ قیاس سے کام لیتے ہیں تو پھر ہمیں قیاس کی روشنی میں بتایئے کہ اللہ کے نزدیک قتل زیادہ بڑا جرم ہے یا زنا؟

___: قتل!

___: تو پھر کیا بات ہے کہ اللہ نے قتل کیلیئے دو گواہوں کی شہادت کو کافی قرار دیا ہے جبکہ زنا کیلیئے چار گواہوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ اچھا ایک بات اور بتایئے "آیا نماز افضل ہے یا روزہ؟"

___: نماز افضل ہے!

___: پھر تو آپ کے قیاس کے مطابق حائض کے لئے ماہ رمضان میں رہ جانے والے روزوں کی قضاء نہیں ہونی چاہئے اور نماز کی قضاء ہونی چاہئے جبکہ شرعی حکم اس کے بالکل برعکس ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ "پیشاب کی نجاست زیادہ ہے یا منی کی؟"

___: پیشاب کی!

___: آپ کے قیاس کے مطابق پیشاب نکلنے پر غسل واجب ہونا چاہئے منی کے نکلنے پر نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے منی کے نکلنے پر غسل کو واجب قرار دیا ہے۔

___: میں اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں!

___: اچھا اگر ایسا ہی ہے تو پھر اپنی رائے کی روشنی میں بتایئے کہ: "ایک شخص کا ایک غلام تھا، اس نے اپنی بھی اور اپنے اس غلام کی شادی بھی ایک ہی رات میں کی اور دونوں اسی رات اپنی اپنی بیویوں کے پاس گئے، اس کے بعد دونوں سفر پر چلے گئے اور اپنی بیویوں کو ایک ہی گھر میں چھوڑ گئے، وقت آنے پر دونوں عورتوں نے لڑکوں کو جنم دیا، اتفاق سے ان پر مکان کی چھت گری دونوں عورتیں لقمۂ اجل بن گئیں اور دونوں نومولود زندہ بچ رہے۔ اب آپ ہی "ارشاد فرمایئے" کہ ان میں سے کون لڑکا مالک ہے اور کون مملوک اور کون وارث ہے اور کون موروث؟"۔

___: میں تو صرف حدود (سزاؤں) کے بارے میں ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔

___: چلو یہی سہی! یہ فرمایئے کہ اگر کوئی اندھا کسی اچھے بھلے آدمی کی آنکھیں پھوڑ دے یا کوئی ہتھ کٹا کسی تندرست اور صحیح سالم شخص کا ہاتھ کاٹ دے تو ان پر کیسے حدود جاری کی جائیں گی؟

___: میں انبیاء کی بعثت کے بارے میں ہی کچھ کہہ سکتا ہوں!

___: اچھا یہی سہی، "ارشاد فرمایئے" کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو ان سے فرمایا "اسے نرمی کے ساتھ دعوت دینا" "لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" "شاید وہ متوجہ ہو یا خدا سے ڈرے (طٰہٰ / ۴۴) آیا "لَعَلَّ" شک کے لئے آتا ہے یا نہیں؟

___: جی بالکل!

___: آپ تو شک کی بات کر سکتے ہیں لیکن خدا کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

: معلوم نہیں!

___ : تم کتاب خدا سے فتویٰ دیتے ہو حالانکہ تمہارا اور ثمین کتاب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تم نے کہا "میں قیاس سے کام لیتا ہوں" حالانکہ سب سے پہلے شیطان نے قیاس کیا، اور دین اسلام کی بنیاد قیاس پر قطعاً نہیں ہے، تم خود کو صاحب رائے سمجھتے ہو! حالانکہ رائے صرف اور صرف حضرت رسالتمآبؐ ہی کی صحیح اور باصواب تھی اس کے علاوہ کسی کی رائے درست اور صائب نہیں ہوتی۔ پیغمبر کی رائے کے بارے میں اللہ فرماتا ہے "وَانِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاانْزَلَ اللّٰهُ" (مائدہ/ ۴۹) اور ان کے درمیان تمہیں اس کے مطابق حکم کرنا چاہئے جو خدا نے نازل کیا ہے۔ یہ پیغمبر خداؐ کے علاوہ کسی اور کیلئے اجازت نہیں ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ "میں حدود کا علم جانتا ہوں" حالانکہ ان کا حقیقی علم صرف اسی ذات کے پاس ہے جس پر قرآن نازل ہوا ہے۔ تم یہ کہتے ہو کہ انبیاء کی بعثت کا علم رکھتے ہو جبکہ خاتم الانبیاء سب سے بہتر اس کا علم رکھتے ہیں۔

اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ "ابو حنیفہ، فرزند رسولؐ کے پاس آیا اور میں نے آپ سے کوئی سوال نہیں کیا" تو میں ہرگز آپ سے کوئی سوال نہ کرتا، اب آپ اگر قیاس کرنا چاہتے ہیں تو کیجئے!

___ : اس نشست کے بعد میں کبھی اللہ کے دین کے بارے میں رائے اور قیاس کی بات نہیں کروں گا۔

___ : یہ بڑی مشکل بات ہے، کیونکہ جاہ طلبی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی جس طرح کہ تمہارے سے پہلے لوگوں کو نہیں چھوڑا تھا۔

بہر حال بات ہو رہی تھی شیطان کے تمرد اور اس کی سرکشی کی کہ اس نے اپنی سرکشی کی بنا پر سجدہ نہیں کیا اور معبود کی اطاعت کی بجائے تکبر سے کام لیا، اور خدا سے روز بعث تک کیلئے زندگی کی مہلت مانگی: "قَالَ رَبِّ فَانْظِرْنِي اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (حجر/ ۳۶) کہا پروردگار! مجھے روز قیامت تک کیلئے مہلت دے۔

(پس اللہ نے اسے مہلت دی تاکہ وہ پورے طور پر غضب کا مستحق بن جائے) کیونکہ مہلت اور عمر کو لمبا کر دینے میں ایسے گناہوں میں اضافہ ہو جاتا ہے جو زیادہ سزا کے استحقاق کا موجب ہو جاتے ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے "وَ لَايَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ" (آل عمران/ ۷۸) جو کافر ہو گئے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم اگر انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے نفع میں ہے۔ ہم تو یہ مہلت انہیں اس لئے دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کرلیں اور ان کیلئے رسوا کن عذاب ہے۔

(اور بنی آدم کی آزمائش پایہ تکمیل تک پہنچے اور وعدہ پورا ہو جائے) ایک قول کے مطابق اس سے مراد مہلت کا وعدہ ہے حالانکہ یہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ خداوند سبحانہ وتعالیٰ سے مہلت کے وعدے کی پہلے کوئی بات نہیں ہوئی کہ جسے وہ پورا کرے۔ بلکہ ظاہر امر او یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اقتضائے عدل کے پیش نظر جب کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا اور ابلیس زمین وآسمان میں عبادت کر چکا ہے اور خدا کے قول کے مطابق وہ جزا کا مستحق ہے، لہٰذا اسی وعدے کے مطابق اسے اپنی عبادت کی جزا اس دنیا میں ضرور ملے گی اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

ابلیس کی عبادت کا عرصہ اور اس کی جزا

بحار الانوار میں اسناد کے ساتھ حسن بن عطیہ سے روایت کی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنا آپؑ فرما رہے تھے: "ابلیس نے آسمان میں اللہ کی چھ ہزار سال تک عبادت کی اور اس عرصے میں صرف دو رکعت نماز پڑھی۔ چنانچہ اسی عبادت کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے اسے وقت معلوم تک مہلت دی ہے"۔

ایک اور روایت میں علی بن ابراہیم حضرت امیر المؤمنینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ ابلیس نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا: "پروردگارا! یہ کیا ہوا کیونکہ تو تو عادل ہے جو کسی پر ظلم نہیں کرتا جبکہ میرے عمل کا ثواب باطل کر دیا؟"۔ اللہ نے فرمایا: "نہیں تو! میں نے باطل نہیں کیا بلکہ دنیاوی امور سے تو جو چاہتا ہے اپنے عمل کا ثواب مانگ میں تجھے دوں گا"۔ اس پر اس نے جو سب سے پہلا سوال کیا وہ یہ کہ یوم الدین تک اسے زندگی ملنی چاہئے تو اللہ نے اسے وقت معلوم تک دیدی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ زرارہ کہتے ہیں میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: "میں آپؑ کے قربان جاؤں، ابلیس نے کون سا ایسا عمل کیا تھا کہ خدا نے اسے منہ مانگی مراد دے دی؟" آپؑ نے فرمایا: "اس کے خدا کا شکر بجالانے کی وجہ سے" عرض کیا: "قربان جاؤں کیسا شکر تھا اس کا؟" فرمایا: "دو رکعت نماز جو اس نے آسمان میں چار ہزار سال تک پڑھی، جس کی وجہ سے اللہ نے اس سے فرمایا: "اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" (تجھے وقت معلوم کے دن تک اجازت دی جاتی ہے)۔

فخر الدین رازی فرماتے ہیں: "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن تک کی اس لئے مہلت مانگی تھی تاکہ وہ کبھی مرنے نہ پائے۔ کیونکہ جب وہ قیامت کے دن تک نہیں مرے گا تو ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد بھی اسے موت نہیں آئے گی، گویا وہ اپنی زیرکی کے ساتھ موت سے بچنا چاہتا تھا، لیکن اللہ نے یہ کہہ کر اس کی پیش بندی کر دی کہ: "اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" (حجر / ۳۷۔۳۸) تجھے وقت معلوم کے دن تک کی مہلت ہے۔

"وقت معلوم" سے کیا مراد ہے؟

وقت معلوم کے بارے میں مفسرین کو اختلاف ہے اور اس بارے میں چند اقوال ہیں:

۱۔ وقت معلوم سے مراد پہلی مرتبہ صور کے پھونکے جانے کا وقت ہے، جب تمام مخلوق موت کے گھاٹ اتر جائے گی اس کو وقت معلوم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ تمام مخلوق اس میں مر جائے، اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ نے اسے اسی اسم کے ساتھ اس لئے موسوم کیا ہے کہ اس وقت کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور اس کی تعیین صرف خدا ہی کے علم ہی میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ" (اعراف / ۱۸۷) اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے، اور اس کے علاوہ کوئی اس کے وقت کو واضح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" (لقمان / ۳۴) یقیناً خدا ہی کے پاس ہے قیامت کا علم۔

۲۔ وقت معلوم کے دن سے مراد وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے "اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (اعراف / ۷) دوبارہ اٹھائے جانے

کادن یعنی قیامت کادن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے "یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" کے نام سے اس لئے موسوم کیا ہے کہ ابلیس نے اسے معین کیا تھا، تو اللہ نے اسے وقت معلوم کا نام دیدیا۔

سوال: جب اللہ نے اس کا مطلوب اسے عطا کر دیا ہے تو پھر لازم آئے گا کہ وہ قیامت کے دن تک بھی نہیں مرے گا اور قیامت کے بعد تو ویسے بھی موت مر جائے گی، گویا اس سے موت بالکلیہ بر طرف کر دی گئی؟

جواب: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول "یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ" کو اس کے قریب ترین وقت پر محمول کیا جائے گا جس میں تمام مکلفین موت کا جام پیئں گے اور یہ "یَوْمَ الْبَعْثِ" کے قریب کا وقت ہو گا۔ تو گویا اگر اس وقت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو پہلی وجہ میں بیان ہو چکا ہے۔

۳۔ "یَوْمَ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" سے مراد وہ دن ہے جسے خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور یہ قیامت کے علاوہ کوئی اور دن ہے۔

شارح کہتے ہیں کہ ہماری بعض روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی وجہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے جبکہ علل الشرائع میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس وقت معلوم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: "یَوْمِ الْوَقْتِ وہی ہے جس دن پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو اس وقت ابلیس مر جائے گا اور دوسری مرتبہ کے صور پھونکے جانے تک اسی حالت میں پڑا رہے گا"۔ بعض اور روایات کی رو سے اس سے مراد "رجعت" کا زمانہ ہے اور اس کی روایت مفسر قمی نے کی ہے اور وہ یوں کہ اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے "یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جس دن حضرت رسول خداؐ بیت المقدس میں اسے ایک چٹان پر ذبح کریں گے" ایک اور روایت میں ہے جسے عیاشی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا! "کیا تمہارا ایسی گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دن موت دے گا جس دن لوگ قبروں سے دوبارہ اٹھیں گے؟ نہیں بلکہ اللہ نے اسے ہمارے قائم (آل محمدؑ) کے ظہور تک مہلت دی ہے' چنانچہ جب قائم آل محمدؑ ظہور کریں گے تو آپ کوفہ آجائیں گے تو ابلیس بھی وہاں آجائے گا اور آنحضرتؑ کے سامنے زانو ٹیک دے گا' اور کہے گا: "ہائے افسوس آج کے دن سے" تو قائم آل محمدؑ اس کی پیشانی سے پکڑ کر اس کی گردن مار دیں گے۔ اور یہی وقت معلوم کا دن ہوگا" ان تمام مختلف روایات کو جمع کرنا ممکن ہے وہ یوں کہ پہلے اسے قائم آل محمدؑ قتل کریں گے' پھر اسے زندہ کیا جائے گا اور سرکار رسالتمآبؐ اسے موت کے گھاٹ اتاریں گے، پھر زندہ کیا جائے گا اور پہلے صور کے پھونکے جانے پر اسے موت آئے گی۔

وَاللّٰہُ الْعَالِمُ بِحَقَائِقِ الْأُمُوْرِ (خدا ہی حقیقت امر کو بہتر جانتا ہے)۔

چند اہم امور کی نشاندہی

ا۔ آدمؑ کی داستان بار بار کیوں دہرائی گئی؟

یہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے قصے کو ذکر کیا ہے، اس کی تخلیقی کیفیت اور ابلیس کا آپؑ کے ساتھ سلوک قرآن مجید

میں کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے یقیناً اس میں کوئی راز ہے، ایک نہیں بلکہ کئی راز ہیں، مثلاً

الف:اس حقیقی داستان میں خدا کے کمال قدرت و عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے ایک ایسا کامل انسان خلق فرمایا ہے جس میں عقل بھی ہے اور حس بھی، حیات بھی ہے اور نشو و نما بھی نیز جامد اور ساکت مٹی سے ظاہری اور باطنی شعور رکھنے والا بھی ہے۔ اس کے ارتقائی مراحل ملاحظہ فرمایئے پہلے وہ خشک مٹی تھا، پھر اسے چکنی اور لیس دار مٹی بنایا، پھر اسے بدبودار گیلی مٹی میں تبدیل کیا اور آخر میں اسے کھنکھناتی مٹی میں بدل کر اس میں اپنی روح پھونکی اور وہ انسان کامل کی صورت اختیار کر گئی۔ اسی لئے بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے "تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" بابرکت ہے وہ اللہ جو تمام پیدا کرنے والوں سے بہتر خالق ہے۔

ب:دنیائے انسانیت کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ خالق کائنات نے ابوالبشر آدم کو کن کن نعمتوں سے نوازا ہے آدمؑ کو ملائکہ سماوی پر فضیلت دی اس لئے کہ فرشتوں کو آدمؑ نے اسماء کی تعلیم دی، انہیں فرشتوں نے سجدہ کیا، اس کے علاوہ اور بھی کئی فضیلتیں ہیں۔

ج: خلق خدا کو شیطانی پھندوں اور چالوں سے خبردار کیا ہے اور انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کی چالوں اور جالوں سے بچیں، کیونکہ اس کی دشمنی اصلی ہے اور عداوت ذاتی ہے، اس سے کسی بھی صورت میں روابط اور تعلقات قائم نہ کئے جائیں۔

د: مخلوق کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آدم اپنی اس قدر خوبیوں اور صفات حمیدہ کے باوجود ایک چھوٹی سی لغزش کی بنا پر کیسے رحمت الٰہی کے جوار سے نکال دیئے گئے اور کیونکر مقام ابتلاو آزمائش تک آپہنچے؟ تو کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جو گناہوں میں غرق ہو چکے ہیں اور ہلاکتوں اور تباہیوں اور بربادیوں کی دلدل میں پھنس اور دھنس چکے ہیں پھر بھی وہ دارالخلد کی لالچ رکھتے ہیں۔

۲۔ آدمؑ کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کا راز کیا ہے؟

یہاں پر کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا اور اس کا کیا راز ہے؟ جواب میں کہا جائے گا کہ ایک نہیں بلکہ کئی راز ہیں!

الف: ملائکہ پر آدمؑ کی فضیلت کا اظہار مقصود تھا۔

ب: ابتلاو آزمائش بھی پیش نظر تھی تاکہ ملائکہ پر شیطان کی حقیقت حال کو واضح کر دیا جائے۔ جیسا کہ سجدے سے اباو انکار کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے جبکہ وہ اس سے پہلے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ابلیس "فرشتہ" ہے۔ جس طرح کہ علی بن ابراہیم قمی اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امام سے پوچھا گیا آیا اللہ نے جو مخلوق کو دعوت دی ہے تو کیا اس دعوت میں گمراہ لوگ بھی شامل ہیں؟(۱) فرمایا "ہاں! کفار بھی اس دعوت میں داخل ہیں! کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ملائکہ کو آدمؑ کے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس حکم میں ملائکہ بھی شامل ہیں اور ابلیس بھی کیونکہ ابلیس ملائکہ کے ساتھ آسمانوں میں رہ کر خدا کی عبادت کیا کرتا تھا اور ملائکہ سمجھتے تھے کہ یہ ان میں سے ہے لیکن جب اللہ نے ملائکہ کو آدمؑ کے سجدے کا حکم دیا تو ابلیس کے دل میں چھپے ہوئے حسد نے سر نکالا اور اس نے سجدے سے انکار کر دیا، تب فرشتوں کو علم ہوا یہ تو ان میں سے نہیں تھا۔

(۱) ایک اور روایت میں حضرت امیرؑ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور یہ بات زمین میں جنات اور نسناس کے خاتمہ کے سات ہزار سال بعد کی ہے اور سب سے پہلے اس نے آدمؑ کو خلق فرمایا۔

اس پر آنجنابؑ سے پھر سوال کیا گیا کہ "سجدہ کرنے کا حکم تو صرف ملائکہ کو تھا، ابلیس پر تو یہ حکم لاگو نہیں ہوتا تھا؟" فرمایا: "ابلیس، دوستی کی وجہ سے ان میں شامل تھا، جنس ملائکہ سے نہیں تھا اور ان کے دوستانے کی وجہ یوں بنی کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے پہلے ایک مخلوق خلق فرمائی جو روئے زمین پر رہتی تھی اور ابلیس ان لوگوں کا فرمانروا تھا، اس مخلوق نے سرکشی، لوٹ مار، فتنہ وفساد اور خونریزی کی حد کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کیلئے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے ان کو قتل کر دیا اور ابلیس کو قید کر کے آسمان پر لے گئے اور وہ ملائکہ کے ساتھ عبادت کرتا رہا یہاں تک کہ اللہ نے آدمؑ کو خلق فرمایا۔

ج: آدمؑ کو فرشتوں کا سجدہ اس لئے کرایا گیا کیونکہ آدمؑ کی صلب میں انوار محمد و آل محمد علیہم السلام تھے۔ اس پر بہت سی روایات دلالت کرتی ہیں، مثلاً صافی اور بحار الانوار میں تفسیر امام سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے، آپؑ سلسلہ اسناد کے ساتھ حضرت رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "اے خدا کے بندو! جب حضرت آدمؑ نے اپنی صلب میں چمکتے ہوئے نور کو دیکھا_ کیونکہ ہمارے نور کو اللہ نے عرش کی بلندیوں سے ان کی پشت میں منتقل کر دیا تھا_ نور کو تو دیکھا لیکن نورانی شخصیتوں کو نہیں پہچانا تھا۔ عرض کیا: "پروردگارا! یہ نور کیسے ہیں؟" تو اللہ نے فرمایا: "ایسی شخصیتوں کے نور ہیں جنہیں میں نے اپنے عرش کے بہترین حصوں سے تیرے اندر منتقل کر دیا ہے۔ اسی لئے میں نے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ تیرا سجدہ کریں، اس لئے کہ تم ان انوار کا ظرف ہو۔

حضرت آدمؑ نے عرض کیا: "تو بتا تو سہی یہ نور کن لوگوں کے ہیں؟" اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: "آدم! ذرا عرش کی بلندیوں پر نگاہ کرو!" چنانچہ انہوں نے عرش کی بلندیوں پر جونہی نگاہ کی تو ہمارا نور آدم کی پشت سے منتقل ہو کر بلندی عرش تک پہنچ گیا، اور ہماری عرشی صورتوں میں داخل ہو گیا، جیسے انسانی چہرہ صاف ستھرے آئینے میں نظر آتا ہے۔ جب آدم نے ہماری صورتوں کو دیکھا تو پوچھا: پروردگارا! یہ کن لوگوں کی صورتیں ہیں؟ اللہ نے فرمایا: "آدم! یہ میری بہترین مخلوق اور کائنات کی بہترین شخصیتوں کی صورتیں ہیں، چنانچہ یہ محمدؐ ہیں اور میں اپنے افعال میں حمید و محمود ہوں، ان کا نام میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے، یہ علیؑ ہیں اور میں علی عظیم ہوں، میں نے ان کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے، یہ فاطمہؑ ہیں اور میں فاطر السموٰات والارض ہوں، یہ میرے دشمنوں کو قیامت کے دن میری رحمت سے ہٹا دینے والی اور میرے دوستوں کو ہر قسم کے عیب و عار اور ننگ سے جدا کرنے والی ہیں، میں نے ان کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے، یہ دونوں حسنؑ اور حسینؑ ہیں، جبکہ میں محسن و مجمل ہوں میں ان کا نام بھی اپنے نام ہی سے مشتق کیا ہے، یہ میری بہترین اور برگزیدہ مخلوق ہے، اور میری تمام مخلوق سے برتر مخلوق ہے، انہی کے ذریعہ سے میں لوں گا، اور انہی کے ذریعہ سے دوں گا، انہی کی وجہ سے میں مخلوق کو سزا اور جزا دوں گا۔ پس اے آدمؑ! اگر تمہیں کوئی بھی مصیبت درپیش آئے تو انہی کے وسیلے سے مجھ سے دعا مانگنا، میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ ان کا وسیلہ اختیار کرنے والوں کو ناکام اور نامراد نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس پلٹاؤں گا"۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں دعا کی ضرورت پڑی تو ان کے واسطے سے دعا مانگی تو ان کی توبہ بھی قبول ہوئی اور مغفرت کے مستحق بھی قرار پائے"۔

۳۔ابلیس کو کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ابلیس کو کس چیز نے آدمؑ کا سجدہ کرنے سے روکا؟

جواب کے طور پر عرض ہے کہ جیسا کہ آپ روایات کی رو سے جان چکے ہیں کہ اس کا اصل سبب "حسد" ہے جبکہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ "استکبار" تھا۔ اور بعض روایات نے بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، جیسا کہ بحارالانوار میں قصص راوندی سے روایت کی گئی ہے کہ وہ اسناد کے ساتھ شیخ صدوقؒ سے اور وہ اسناد کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "ایک دن ابلیس نے حضرت نوحؑ سے کہا: "آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے، لہذا اس شکریہ میں میں آپ کو چند ایک باتیں بتاتا ہوں"۔ نوحؑ نے اس سے پوچھا: "میں نے تم پر کون سا احسان کیا ہے؟" کہا: "آپ کا اپنی قوم کیلئے بد دعا کرنا جس سے ساری قوم ہلاک ہو گئی، بہر حال میری طرف سے یہ باتیں ضرور یاد رکھنا۔ تکبر، حرص اور حسد سے بچتے رہنا، کیونکہ یہ تکبر ہی تھا جس نے مجھے آدمؑ کا سجدہ نہ کرنے پر آمادہ کیا اور مجھے کفر کی حد تک جا پہنچایا اور شیطان رجیم بنا دیا۔ حرص سے بچئے کیونکہ آدمؑ کیلئے ساری جنت مباح تھی صرف ایک ہی درخت سے روکے گئے تھے لیکن حرص نے انہیں اس سے بھی کھانے پر آمادہ کیا اور اس سے انہوں نے کھا لیا۔ حسد سے بچئے کیونکہ ابن آدمؑ نے حسد کے غلبہ میں آکر اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا"۔ حضرت نوحؑ نے اس سے پوچھا: "تم اولاد آدمؑ پر کب غلبہ پاتے ہو؟"، "جب وہ غصے کی حالت میں ہوتے ہیں" ابلیس نے کہا۔

البتہ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ابلیس کا حسد اور تکبر بھی اس کے غلط قیاس کی وجہ سے اس پر اثر انداز ہوئے۔ اسی بات پر وہ روایت بھی دلیل ہے جو علی بن ابراہیم نے اسناد کے ساتھ حضرت امیر المؤمنینؑ سے بیان کی ہے جو ایک طویل حدیث ہے اور بات یہاں پر جا پہنچتی ہے کہ: "...... پس اللہ نے آدمؑ کو خلق فرمایا اور وہ چالیس برس تک ایک تصویر کی حالت میں باقی رہے اور ان کے پاس سے ابلیس لعین گزرتا تو کہتا تھا: "اگر مجھے اللہ نے تیرے سجدے کا حکم دیا تو میں یہ حکم نہیں مانوں گا"...... پھر اللہ نے ان کے اندر روح پھونکی اور جب روح ان کے دماغ تک جا پہنچی تو انہوں نے چھینک ماری اور کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تو اللہ نے فرمایا: "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ"(۱)۔ اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا: "آدمؑ کو سجدہ کرو" سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے اپنے دل میں چھپے ہوئے حسد کو باہر نکالا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اس پر اللہ نے اسے فرمایا: "مَا مَنَعَكَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ" (اعراف / ۱۲) تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے"۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور ساتھ ہی تکبر بھی کیا اور استکبار وہ خدا کی پہلی نافرمانی ہے جو شیطان کی طرف سے کی گئی۔ شیطان نے خدا سے کہا: "پروردگارا! تو مجھے آدمؑ کے ایک سجدے سے معاف رکھ میں تیری وہ عبادت کروں گا کہ نہ تو اس جیسی عبادت کسی ملک مقرب نے کی ہو گی اور نہ ہی نبی مرسل نے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مجھے تیری ایسی عبادت کی ضرورت نہیں، میں تو اپنی وہ عبادت چاہتا ہوں جو میری پسند کی ہو نہ وہ جو تیری پسند کی ہو"۔ لیکن اس نے

(۱) حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "اللہ کی طرف سے آدمؑ کی طرف رحمت کی سبقت ہو گئی"۔ (تفسیر قمی)

سجدے سے انکار کر دیا تو اللہ نے بھی اسے فرمایا: "اُخْرُجْ مِنْهَافَاِنَّكَ رَجِيمٌ وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ" (صٓ/ ۷۷۔ ۷۸) تو یہاں سے نکل جا کیونکہ تو راندہ درگاہ ہے اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہے"۔

ابلیس نے کہا: "پروردگارا! تو تو ایسا عادل ہے کہ ظلم نہیں کرتا، تو میرے اعمال کا ثواب کیوں باطل ہو گیا؟" فرمایا: "نہیں! بلکہ تو اپنے اعمال کا ثواب اس دنیا میں مانگ لے میں تجھے یہ ثواب عطا کروں گا"۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلا سوال اپنی بقا کا کیا۔ اللہ نے فرمایا: "میں نے دے دی" اس نے کہا: "مجھے اولاد آدمؑ پر مسلط کر دے!" فرمایا: "مسلط کر دیا" کہا: "مجھے ان کی رگوں میں ایسے چلا جیسے خون چلتا ہے" فرمایا: "چلادیا" کہا: "ان کا ایک بچہ پیدا ہو میرے دو ہوں، میں انہیں دیکھوں وہ مجھے نہ دیکھ سکیں اور میں ان کیلئے اپنی ہر صورت تبدیل کر سکوں!" فرمایا: "یہ بھی منظور ہے" اس نے کہا: "خدایا! کچھ اور بھی دے" فرمایا: "ان کے سینے تیری اور تیری اولاد کی آماجگاہ بنا دیئے ہیں" اس پر ابلیس نے کہا: "بس کافی ہے" ساتھ ہی ابلیس نے کہا: "قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ" (صٓ/ ۸۲۔ ۸۳) تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے تیرے مخلص ہوں گے"۔ "ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ" (اعراف/ ۱۷) پھر اس کے بعد ان کے آگے سے، پیچھے سے، داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے آؤں گا، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا"۔

روایت میں ہے زرارہ نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ جب اللہ نے ابلیس کو اس قدر طاقت دے دی تو آدمؑ نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا: "خداوندا! تو نے ابلیس کو میری اولاد پر مسلط کر دیا ہے اور اسے خون کی مانند رگوں میں چلنے تک کی اجازت دے دی ہے، اس کے علاوہ اور بھی بڑی حد تک اسے اختیارات دے دیئے ہیں۔ تو نے مجھے اور میری اولاد کو کیا دیا ہے؟" اللہ نے فرمایا: "تمہارے اور تمہاری اولاد کیلئے ایک نیکی کا ثواب دس گنا ہو گا" عرض کیا: "اور بھی!" فرمایا: "توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا رکھا ہے جب تک کہ روح حلق تک پہنچ چکی ہو گی" عرض کیا: "اور بھی!" فرمایا: "بخشتا جاؤں گا اور پروا نہیں کروں گا" عرض کیا: "بس کافی ہے"۔

۴۔ آیا ابلیس جن ہے یا فرشتہ؟

علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا ابلیس جنات میں سے ہے یا فرشتوں میں سے؟ ہمارے اکثر علمائے متکلمین اور معتزلہ کی طرف جس بات کی نسبت دی جاتی ہے وہ یہ کہ ابلیس جنات میں سے ہے۔ اور فخر الدین رازی اور جمہور مفسرین کے بقول اکثر علمائے اہل سنت، حضرت ابن عباسؓ اور بقولے شارح بحرانیؒ اس بات اور نظریئے کے قائل ہیں کہ "وہ فرشتوں میں سے ہے"۔ جبکہ ہمارے نزدیک بہتر قول وہی پہلا ہے۔ اس لئے کہ اس پر اکثر علماء کا اتفاق ہے جن میں شیخ مفید علیہ الرحمہ بھی ہیں اور انہوں نے اس نظریئے اور موقف کو تمام علماء امامیہ کی طرف منسوب کیا ہے، جیسا کہ کتاب "المقالات" میں اسی چیز کی حکایت کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ: ابلیس خصوصی طور پر جنات میں سے ہے اور فرشتوں میں سے نہ ہے اور نہ تھا، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ

الجنّ "(کہف / ۵۰) سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ اور ائمہ آل محمدؐ سے بھی اسی بارے میں متواتر روایات وارد ہوئی ہیں
اور یہی تمام امامیہ کا مذہب بھی ہے اور معتزلہ اور اہل حدیث کا بھی"۔

اس نظریہ کے دلائل: اول: چونکہ ابلیس جنات میں سے ہے لہذا ضروری ہے کہ فرشتوں میں سے نہ ہو، تو گویا اس کی دو شقیں ہو گئیں:

الف: جنوں میں سے ہے ب: ضروری ہے کہ فرشتوں سے نہ ہو۔

شق اول کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم سورہ کہف / ۵۰ میں فرماتا ہے: "اِلاَّ اِبلِیسَ کَانَ مِنَ الجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ "سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں میں سے تھا، کہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

دوسری شق کی دلیل (ضروری ہے کہ فرشتوں سے نہ ہو) خداوند عالم کا قول ہے: "وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اَھٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِھِمْ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ "(سبا / ۴۰) اور اس دن جب خدا ان سب کو محشور کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے تو منزہ اور پاک ہے تو ہی ہمارا ولی ہے نا کہ وہ بلکہ وہ تو جنات کی پرستش کیا کرتے تھے۔

یہ آیت جن و ملک میں واضح فرق بیان کر رہی ہے۔

بعض اوقات یہ وہم پیدا کیا ہے کہ اللہ تعالی کے اس قول "کَانَ مِنَ الجِنِّ" سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ ابن مسعود کی روایت کے مطابق "خازن جنت" تھا۔ یا "کانَ" کو "صارَ" کے معنی میں لیا جاتا ہے یعنی وہ جن نہیں تھا بلکہ بن گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالی اسی ابلیس ہی کے بارے میں فرماتا ہے: "کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ "(بقرہ / ۳۴) یعنی اس نے انکار اور تکبر کیا اور کافرین سے ہو گیا۔ تو اس قسم کا نظریہ چند وجوہات کی بنا پر غلط ہے۔

۱۔ آیت شریفہ کے ظاہر سے جو تبادر ہوتا ہے یہ اس کے بالکل بر خلاف ہے، اسی طرح "کَانَ" کو "صَارَ" کے معنی میں لینا بھی ظاہر کے خلاف ہے۔

۲۔ اللہ تعالی نے ابلیس کے سجدہ ترک کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ جنات سے تھا اور اس کے خازن جنت ہونے کی وجہ ترک سجدہ نہیں بتائی اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ان لوگوں کا نظریہ باعث تعجب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: "اس کا جن ہونا اس کے ملک ہونے کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ "جن" کا لفظ "اجتنان" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "چھپنا" اور ملائکہ بھی آنکھوں سے چھپی ہوئی مخلوق ہیں۔ لہذا فرشتوں پر جن کے لفظ کا اطلاق صحیح ہے"۔ یہ ٹھیک ہے کہ لغوی لحاظ سے اگرچہ "جن" کا اطلاق فرشتوں پر ہو سکتا ہے لیکن اصطلاحی طور پر اس کا اطلاق ایک ایسی جنس پر ہوتا ہے جو انس و ملک کے مقابل میں ہے، لہذا اس لحاظ سے اس کا اطلاق ملک پر صحیح نہیں ہوگا۔ (خدا نے بھی قرآن مجید میں اور مقامات پر فرشتوں کیلئے لفظ ملک کا استعمال کیا ہے لیکن تذکرہ جنات پر ان کے الگ نام سے ایک سورہ "سورہ جن" کے نام سے نازل فرمائی۔ از مترجم)

دوم: ابلیس کی ذریت اور نسل ہے جیسا کہ خداوند عالم کا فرمان ہے: "اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَ ذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ "(کہف

/ ۵۰) آیا تم میری بجائے ابلیس اور اس کی اولاد کو اولیاء بناتے ہو؟ جبکہ فرشتوں کی اولاد نہیں ہوتی اس لئے کہ ان میں کوئی بھی مؤنث نہیں ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ جَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا" (زخرف / ۱۹) اور ان لوگوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں مؤنث سمجھا ہوا ہے۔

البتہ اس بات پر اعتراض کیا گیا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت مؤنث ہونے کی نفی پر دلالت نہیں کر رہی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مؤنث ہونے کی نفی پر دلالت کر رہی ہے تو بھی اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ "شیاطین میں کوئی مؤنث نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کی اولاد اور ذریت ہے"۔ اسی بنا پر شیخ طوسی کتاب تبیان میں فرماتے ہیں "جو شخص یہ کہتا ہے کہ ابلیس کی ذریت و نسل ہے لیکن فرشتوں کی نہ تو ذریت اور نسل ہے، نہ ہی وہ نکاح کرتے ہیں اور نہ ہی افزائش نسل تو وہ نامعلوم روایات پر تکیہ کرتا ہے"۔

سوم: ملائکہ معصوم ہیں کیونکہ ان کی عصمت پر دلائل موجود ہیں جبکہ ابلیس معصوم نہیں ہے، لہٰذا ان میں سے نہیں ہوگا اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

ابلیس کے فرشتہ ہونے کے دلائل

دلیل اول: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسے ایک سے زیادہ مقامات پر فرشتوں سے مستثنیٰ کیا ہے اور استثناء اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں شامل تھا پھر ان سے نکال دیا گیا ہے۔

البتہ اس دلیل پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ:

اوّل: یہ استثناء متصل نہیں بلکہ استثنائے منقطع کے زمرے میں آتا ہے اور استثنائے منقطع کلام عرب میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی اکثر مقامات پر اس کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً:

الف: "وَاِذْقَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌمِّمَّاتَعْبُدُوْنَ اِلَّاالَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ" (زخرف / ۲۷) جب ابراہیمؑ نے اپنے (منہ بولے) باپ (یعنی چچا آزر) اور اپنی قوم سے کہا میں ہر اس چیز سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو، سوائے اس (خدا) کے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی کرے گا۔

ب: "لَايَسْمَعُوْنَ فِيْهَالَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلَامًا سَلَامًا" (واقعہ / ۲۵) وہ نہ تو کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی گناہ سے آلودہ کوئی دوسری باتیں، سوائے اس کے کہ جسے سنیں گے وہ سلام ہی سلام ہے۔

ج: "يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْالَاتَاْكُلُوْٓااَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآاَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" (نساء / ۲۹) اے ایماندارو! ایک دوسرے کے مال باطل (اور ناجائز) طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ ایسی تجارت ہو جو تمہاری مرضی سے ہو۔

دوّم: اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ استثنائے متصل ہے پھر بھی اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ ان میں داخل ہو، جیسا کہ زمخشری نے اللہ تعالیٰ کے اس قول "اِلَّآ اِبْلِيْسَ" کے بعد تحریر کیا ہے کہ یہ استثنائے متصل ہے، کیونکہ ابلیس جن تھا اور وہ ایک شخص تھا جو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں شامل ہو کر ان کی جزو بن چکا تھا اور "اُسْجُدُوْا" کے حکم میں ان کا شریک تھا، پھر ان میں سے صرف اسے "اِلَّا" کے ساتھ مستثنیٰ کر دیا گیا۔

لیکن پہلی دلیل کو اس لئے رد کر دیا گیا ہے کہ وہ اصل کے خلاف ہے اور کسی دلیل کے بغیر اس کا سہارا نہیں لیا جا سکتا۔ اور ابلیس کے جن ہونے کی جو دلائل بیان کی گئی ہیں وہ اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ یہ سب عمومی دلیلیں ہیں، جبکہ گفتگو ہو رہی ہے کہ "ابلیس فرشتوں میں سے تھا" اور یہاں استثناء منقطع ہے نا کہ متصل یہاں دونوں خلاف اصل ہیں البتہ پہلی زیادہ ہے کیونکہ عام تخصیص زیادہ غالب ہوتی ہے استثناء کو منقطع بنانے سے۔

دوسری دلیل کو اس لئے رد کیا جاتا ہے کہ قلیل پر کثیر کو غلبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب قلیل غیر اہم اور نا قابل ذکر ہو اور اس کا کوئی اعتبار بھی نہ ہو۔ لیکن اگر قلیل اس قدر اہم اور قابل ذکر ہو کہ اس کا تذکرہ خصوصی طور پر ہوتا ہو تو اسے نظر انداز کر کے اس پر کثیر کو غالب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دلیل ثانی: اگر ابلیس ملائکہ میں سے نہ ہوتا تو "اُسجُدُوا" کے حکم میں فرشتوں میں بھی شامل نہ ہوتا۔ اور اس کا سجدے کو ترک کرنا، انکار، تکبر اور معصیت میں بھی شمار نہ ہوتا۔ اور ترک سجدہ پر مذمت، ملامت اور عذاب کا مستحق بھی نہ ٹھہرتا۔ چونکہ یہ تمام امور اسے حاصل ہو گئے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ خطاب اسے بھی شامل ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم تسلیم کریں کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔

البتہ اس دلیل کو بھی دو ناقص فرضوں کے ساتھ رد کیا گیا ہے جو قابل اعتناء نہیں ہیں اور ہمارے نزدیک صحیح موقف وہی ہے جو عترت طاہرہ کی طرف سے بیان ہونے والی احادیث و روایات صحیح طریقے سے ہم تک پہنچی ہیں، مثلاً: ا۔ علی بن ابراہیم قمی کی وہ روایت جو ابھی دوسرے امر یعنی آدمؑ کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کا راز میں بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ تفسیر امامؑ میں یوسف بن محمد بن زیاد اور علی بن محمد بن سیار، دونوں اپنے اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ہاروت و ماروت کے قصہ میں ملائکہ کی عصمت کو ثابت کیا تو ان دونوں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "پھر تو ابلیس فرشتہ نہ ہوا!" امامؑ نے فرمایا: "نہ، بلکہ وہ جنوں میں سے تھا، آیا تم قرآن مجید سے نہیں سنتے کہ اللہ فرماتا ہے: "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ" (کہف / ۵۰) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو! سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ "جن" تھا، جیسا کہ وہ فرماتا ہے: "وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ" (حجر / ۲۷) اور اس سے پہلے ہم نے جنات کو گرم اور جلانے والی آگ سے خلق فرمایا۔

۳۔ عیاشی، جمیل بن دراج سے اور وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: "آیا ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا کوئی اور آسمانی مخلوق تھا؟" امامؑ نے فرمایا: "ملائکہ میں سے تھا اور نہ ہی کوئی دوسری آسمانی مخلوق! بلکہ وہ تھا تو جنات میں سے پر فرشتوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اور فرشتے سمجھتے رہے کہ یہ ان میں سے ہے جبکہ اللہ کو علم تھا کہ ان میں سے نہیں ہے، لہذا جب اللہ نے سجدے کا حکم دیا تو اس کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آگئی"۔

فرشتوں میں سے نہیں تھا، چونکہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا، اس لئے اس نے کہا میں سجدہ نہیں کروں گا، تو جب وہ ان میں سے تھا ہی نہیں تو وہ سجدہ نہ کر کے نافرمانی کا مرتکب کیونکر ہوا؟" چنانچہ ایک مرتبہ جب میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس مرتبہ وہ بھی آپؑ کی خدمت میں موجود تھے تو امام نے بڑے اچھے انداز میں ہمارے سوال کا جواب دیا، راوی کے بقول میں نے عرض کیا: "آپؑ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو ان الفاظ کے ساتھ دعوت دی ہے "یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا" (اے ایماندارو!) تو کیا اس خطاب میں منافقین بھی شامل ہیں؟" فرمایا: "ہاں، بالکل! بلکہ تمام گمراہ لوگ بھی اور ہر وہ شخص جو ظاہری دعوت کا اقرار کرتا ہے۔ اور ابلیس بھی ان لوگوں میں سے ہے جو ظاہری دعوت کا اقرار کر چکے ہیں"۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ابلیس فرشتہ نہیں بلکہ جن تھا اور اگر اس کے خلاف کوئی روایت ملتی ہے یا علمائے امامیہ میں سے کسی کا قول اس کے برعکس مل جاتا ہے تو اس کی تاویل کی جائے گی یا پھر وہ نادر قول ہوگا۔

۵۔ سجود ملائکہ کی کیفیت

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ملائکہ کا آدمؑ کو سجدہ کس انداز میں تھا؟ آیا اسی طریقے پر جس طرح ہم نماز میں سجدہ کرتے ہیں یا کسی اور طرح سے تھا؟"۔ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ جہاں تک علمائے اعلام کی گفتگو اور ان کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے تو وہ اسی طرح سے تھا جس طرح ہم نماز میں کرتے ہیں اور حضرت امام جعفر صادقؑ کے ارشادات سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہے، شبہ در حقیقت اس بات میں ہے کہ "سجدہ دراصل عبادت ہے اور یہ آدمؑ کے حق میں کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟"

تو اس بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آدمؑ کو کیا جانے والا سجدہ، سجدۂ عبادت نہیں تھا! کیونکہ سجدہ عبادت غیر اللہ کیلئے کفر ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ اب اس کے بعد کی صورتحال کے بارے میں اختلاف ہے کہ سجدے کی کیا نوعیت تھی؟ تو اس بارے میں چند اقوال ہیں:

<u>الف</u>: یہ آدمؑ کی عزت و وقار کی وجہ سے ان کیلئے تعظیمی سجدہ تھا کہ ایک تو ان کی شان عظیم ہے اور ساتھ ہی انہیں فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہے۔

یہ قتادہ اور کچھ دوسرے علماء کا قول ہے اور یہی چیز ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام سے بھی مروی ہے اور اسی بناء پر ہمارے علماء کہتے ہیں کہ "انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں" کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آدمؑ کو سجدے کا حکم دیا اور یہی چیز آدمؑ کی تعظیم اور ان کی ملائکہ پر فضیلت کی دلیل ہے۔ چونکہ مفضول کو فاضل پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا ہم نے سمجھ لیا کہ آدمؑ فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب "العقائد" میں اسی عقیدے کو تمام مذہب امامیہ کا عقیدہ بتایا ہے۔ اور اس قول کی بنا پر اسے مذہب امامیہ کا اجماع قرار دیا جائے گا۔ اس مقام پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ تعظیمی سجدے کا دوسرا نام "سجدہ عبادت" ہے ورنہ وہی سابقہ اشکال

در پیش آجائے گا۔

ب: "سجدہ در حقیقت خدا کیلئے تھا اور آدمؑ قبلہ کی مانند تھے" اسے طبری نے جبائی اور ابو القاسم بلخی سے نقل کیا ہے۔ اس پر کئی طرح سے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "صَلَّيْتُ لِلْقِبْلَةِ" (میں نے قبلہ کیلئے نماز پڑھی) نہیں کہا جاتا بلکہ "صَلَّيْتُ اِلَى الْقِبْلَةِ" (میں نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر آدمؑ قبلہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ فرماتا "اُسْجُدُوْا اِلٰى آدَمَ" (آدمؑ کی طرف سجدہ کرو) حالانکہ اس نے فرمایا ہے "اُسْجُدُوْا لِآدَمَ" (آدمؑ کو سجدہ کرو) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمؑ قبلہ نہیں تھے۔

دوسرے یہ کہ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ ان کی عزت و تکریم اور فرشتوں پر فضیلت کی وجہ سے ہے اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ آدمؑ کا مسجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ "ساجدین" سے افضل ہیں، جیسا کہ اس نے اس بات کا ان الفاظ میں اظہار بھی کر دیا تھا کہ: "قَالَ اَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ......" (بنی اسرائیل / ۶۲) اس نے کہا تو نے خود کو دیکھا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا: "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" (اعراف / ۱۲) میں اس سے بہتر ہوں۔ ظاہر سی بات ہے کہ قبلے کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنے سے قبلے کی "ساجد" پر فضیلت نہیں ہوتی، جبکہ پیغمبر اکرمؐ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے تو کیا اس سے لازم آگیا کہ کعبہ، آنحضرتؐ سے افضل ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ جس طرح "صَلَّيْتُ اِلَى الْقِبْلَةِ" کہنا صحیح ہے اسی طرح "صَلَّيْتُ لِلْقِبْلَةِ" کہنا بھی صحیح ہے اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور اس قول کی صحت پر حسان بن ثابت کا امیر المؤمنین علیہ السلام کی مدح و ثناء میں یہ شعر ہے:

اَلَيْسَ اَوَّلُ مَنْ صَلّٰى لِقِبْلَتِكُمْ وَ اَعْرَفُ النَّاسِ بِالْقُرْآنِ وَ السُّنَنِ

کیا علیؑ وہ پہلا شخص نہیں ہے جس نے تمہارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی؟ آیا وہ تمام دوسرے لوگوں سے بڑھ کر قرآن و سنت سے واقف نہیں؟

دوسرے اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ: ابلیس نے حضرت آدمؑ کی عزت و تکریم اور فضیلت کی شکایت ضرور کی، لیکن یہ عزت و تکریم صرف آدمؑ کے مسجود ہونے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کے حصول کے اور بھی بہت سے ذرائع تھے۔

سوم: یہاں پر سجود کا لغوی معنی مراد ہے اور وہ ہے "سر جھکانا اور اظہار فروتنی کرنا" لیکن حضرت فخر الدین رازی نے اس نظریئے کو مسترد کر دیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "سجدہ" شرعی عرف میں پیشانی کو زمین پر رکھنے کا نام ہے لہذا لغوی طور پر بھی اس کا یہی معنی ہونا چاہئے کیونکہ یہاں پر اصل یہ ہے کہ اسے اپنے اصل معنی سے منتقل نہیں کیا گیا۔ بہر حال اس تمام گفتگو کے نقل کرنے کے بعد قارئین کو حقیقت حال کا اچھی طرح علم ہو گیا ہو گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ: "زیادہ قوی قول وہی قول اول ہے"۔

۶۔ شیطان کی تخلیق، اس کا بنی آدم پر تسلط اور مہلت ملنے کی حکمت کیا ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ:

الف: ...... شیطان کو پیدا کیا گیا

ب:......اسے اولاد آدم پر مسلط کیا گیا۔ اور۔

ج:......اسے قیامت تک کیلئے کھلی چھٹی دیدی گئی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شبہے کی بنیاد دنیا میں ابلیس کی استبداد اور رائے ہی کے دن سے پڑ گئی تھی جب سے اس نے "نص" کو ٹھکرا کر اپنی "رائے" کو اپنایا تھا اور "امر" کے مقابلہ میں "ذاتی خواہش" کی پیروی کی تھی اور اس آگ کے ذریعہ تکبر کیا تھا جس سے پیدا ہوا تھا اور مٹی کو حقیر جانا تھا جس سے آدمؑ خلق کے گئے تھے۔ اور اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ فخر الدین رازی نے محمد بن عبد الکریم شہرستانی سے نقل کیا ہے کہ شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" کے اول میں "اناجیل اربعہ" کے شارح "ماری" سے یہ بیان ذکر کیا ہے کہ توریت میں متفرق مقامات پر یہ چیز مذکور ہے کہ ابلیس نے "واقعہ سجدہ" کے بعد ملائکہ کے ساتھ مناظرہ کیا اور ان سے اس قسم کی گفتگو کی: "مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ میرا معبود ہی میرا خالق اور موجد ہے اور وہی تمام مخلوق کا بھی خالق ہے، لیکن مجھے اس کی حکمت پر سات اعتراض ہیں:

"پہلا اعتراض" تخلیق عالم کا کیا سبب ہے؟ خصوصا کفار کے پیدا کرنے کی کیا وجہ ہے جبکہ اسے یہ علم بھی ہے کہ کفار، مخلوق کی تکلیف کا سبب بنیں گے؟

"دوسرا اعتراض" مخلوق کو فرائض کی ادئیگی کے پابند کرنے کا کیا مقصد ہے جبکہ نہ تو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا نقصان؟ جبکہ سارا فائدہ یا نقصان مخلوق ہی کو پہنچتا ہے، اور وہ بندوں کے لئے یہ سب کچھ اس پابندی کے عائد کئے بغیر بھی کر سکنے پر قادر ہے!

"تیسرا اعتراض" کیا یہ بات کچھ کم تھی کہ مجھے اپنی معرفت اور اطاعت کا پابند بنایا پھر مجھے آدمؑ کے سجدے کی کیوں تکلیف دی

"چوتھا اعتراض" جب میں نے سجدہ نہ کر کے اس کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو مجھ پر لعنت کیوں بھیجی اور میرے لئے عذاب کیوں مقرر کیا؟ جبکہ اس سے نہ تو اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی کسی اور کو بلکہ صرف اور صرف میرے لئے ہی بہت بڑا نقصان ہے

"پانچواں اعتراض" جب یہ سب کچھ ہو گیا، پھر اس نے مجھے جنت میں کیوں جانے دیا کہ میں آدمؑ کے دل میں وسوسے ڈالوں؟

"چھٹا اعتراض" جب میں یہ سب کچھ انجام دے چکا پھر اس نے مجھے اولاد آدمؑ پر کیوں مسلط کیا کہ میں انہیں گمراہ کروں اور راہ راست سے بھٹکاؤں؟

"ساتواں اعتراض" پھر جب میں نے اس سے لمبی مدت کی مہلت مانگی تو اس نے مجھے یہ مہلت کیوں دی؟ صاف اور ظاہر سی بات ہے کہ اگر کائنات میں "شر" کا وجود ہی نہ ہو تو وہ "خیر ہی خیر ہے"۔

اناجیل اربعہ کے شارح کا قول ہے کہ "خداوند عالم (۱) نے اپنے جلال و کبریائی کے پردے سے اس سے بات کی اور کہا:

(۱) بعض دیگر روایات میں ہے کہ اللہ تعالی نے ملائکہ کی طرف وحی کی "اسے کہو! تو نے جو پہلے یہ کہا ہے کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میرا معبود اور خالق ہے اور تمام مخلوق کا بھی خالق ہے۔ تو اس بات میں تو جھوٹا ثابت ہوا ہے اور مخلوص بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر تو سچ کہتا کہ میں عالمین کا معبود ہوں تو تو کبھی مجھ پر اعتراض نہ کرتا کیونکہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں میں کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوں اور ساری مخلوق میرے آگے جوابدہ ہے۔

"ابلیس! تو نے مجھے کما حقہ نہیں پہچانا، اگر پہچانا ہوتا تو میرے کسی بھی فعل پر اعتراض نہ کرتا کیونکہ میں وہی اللہ ہوں کہ میرے سوا

کوئی معبود نہیں اور جو کچھ کرتا ہوں اس کے لئے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوں" یہ سب کچھ نقل کرنے کے بعد امام رازی فرماتے ہیں کہ: "سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اولین و آخرین سے مل کر ساری کائنات اکٹھی ہو جائے اور "حُسن و قبح عقلی" کے فیصلے کے تحت بھی ان اعتراضات کا جواب دینا چاہے تو نہیں دے سکتی اور ان شکوک و شبہات سے اسے چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا اور سارے اعتراضات اپنی جگہ پر باقی رہیں گے لیکن جب ہم وہی جواب دیں گے جو خود خداوند متعال نے ارشاد فرمایا ہے تو سارے شبہے زائل ہو جائیں گے اور اعتراضات ختم ہو جائیں گے، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خداوند عالم جس طرح اپنی ذات میں واجب الوجود ہے اسی طرح اپنی صفات میں بھی واجب الوجود ہے اور اپنی فاعلیت میں کسی مؤثر کا محتاج نہیں اور نہ ہی کسی کی ترجیحات پر عمل کرتا ہے، کیونکہ اگر وہ احتیاج پیدا کرے گا تو محتاج ہو گا بے نیاز نہیں ہو گا جبکہ تمام حاجات اسی کی طرف پلٹتی ہیں اور وہ حاجات کو پورا کرنے والا ہے، تمام رغبتوں کی انتہا اسی پر ہے اور وہ ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہے، جب سب لوگوں کا یہ عقیدہ ہے تو پھر اس کے افعال میں کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے اور نہ ہی اس کے خالق ہونے پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے"۔ جبکہ صدرائے شیرازیؒ (المعروف ملا صدرا) نے اپنی کتاب "مفاتیح الغیب" میں پہلے تو ابلیس کے مذکورہ اعتراضات کو ذکر کیا ہے پھر فخر رازی کے جوابات کو تحریر فرمایا جو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ پھر اس کے آخر میں لکھتے ہیں: "قلوب مستقیم رکھنے والوں کے نزدیک ان تمام اعتراضات کے مکمل، مدلل، مبرہن، واضح اور صحیح جواب موجود ہیں۔ اور وہ جواب اصول حقہ عرفانیہ پر مبنی ہیں جن کی بنیاد مقدمات اضطراریہ یقینیہ پر رکھی گئی ہے۔ لیکن ٹیڑھے اور منکر شخص کو اظہر من الشمس دلائل بھی قانع نہیں کر سکتے ...."

شارح کتاب ہذا فرماتے ہیں: "ابلیس لعین نے جو مذکورہ سات اعتراضات کئے ہیں ان میں سے ہر ایک اعتراض کا اللہ تعالی کی طرف سے برحق، مسکت، قانع اور مدلل جواب موجود ہے۔ اور وہ بذات خود ابلیس کا اپنا حال، اس کا کفر پر ڈٹا رہنا اور حق کے ادراک سے اس کے جوہر کا تاریک اور ظلمانی ہونا ہی بذات خود ایک جواب ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اعتراضات سے اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ ذات کردگار پر تنقید کی جائے اور جو ناقص اور جاہل لوگ اس کے پیروکار ہیں انہیں دھوکہ دیا جائے یا ابلیسی لشکر کو ورغلا کر گمراہ کیا جائے۔ سب سے پہلے تو اسے یہی کہا جائے گا کہ تو خدا کی معرفت کے دعوے میں سچا نہیں ہے اور خدا کی ربوبیت کا قائل نہیں ہے۔ اگر سچا ہوتا تو یقیناً اس قسم کے اعتراض نہ کرتا اور اپنے معبود اور رب کے افعال کو ہدف تنقید نہ بناتا"۔

اب ہم ان اعتراضات کے تفصیل کے ساتھ جوابات تحریر کرتے ہیں البتہ یہ ان لوگوں کیلئے ہیں جو حکمت کے ساتھ تعلق رکھتے اور اس کے مستحق ہیں۔

۱۔ پہلا اعتراض اور اس کا جواب

ابلیس کی تخلیق اور اس کے پیدا کرنے کی کیا حکمت اور مقصد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودات عالم کی مطلقاً تمام اشیاء کا مصدر بھی خدا کی ذات ہے اور منتہٰی بھی۔ اس ذات کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ممکن الوجود کو منصۂ شہود پر لے آئے اور ہر جوہر قابل یا اثر قبول کرنے والی چیز کو اپنے چشمۂ فیض سے نوازے۔ اگر کوئی شے اپنے موجود ہونے کی حیثیت سے ظلمانی، شریر اور خبیث جوہر ہو تو اس میں بنانے والے کا قصور نہیں ہو تا بلکہ یہ اس کی اپنی پست حیثیت اور کم ذاتی ہوتی ہے جو نفس کے آخری مرحلے میں نازل ہوتی ہے اور اس کا تعلق اجرام سماویہ سے ہٹ کر اور ان

سے جدا ہو کر ناری جسم سے ہوتا ہے جو زبردست طاقتور ہوتا ہے اور ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر انانیت، استکبار، افتخار اور خضوع و خشوع اور انکسار سے اباء وانکار غالب آجائے اور وہ پالنے والے کے سامنے خم ٹھونک کر آنے کی جسارت کرے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی معرفت اور اطاعت کا کیوں پابند بنایا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ :ایسا کرنے سے

۲۔ دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

یہ مقصود ہے تاکہ نفوس کو شہوات کی قید اور ظلمات کے قید خانے سے آزاد کرایا جائے اور انھیں حیوانیت اور درندگی کی حدود سے نکال کر اور ان کے کفر و معصیت کی میل کچیل اور جہالت و ظلمت کی پلیدی کو نور علم سے دھو دھلا کر اور پاک و پاکیزہ کر کے انسانوں اور فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کیا جائے اور اگر یہ عمومی حکم آگ جیسے جلنے والے نفوس اور پتھر جیسے سخت دلوں میں اثر نہیں کر سکتا تو اس سے اس کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا، اس لئے کہ بارش برسانے کا مقصد غلے کا اگانا، سبزے اور پھلوں کا پیدا کرنا اور ذی روح کو خوراک مہیا کرنا ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا ٹھوس چٹانوں یا ناکارہ اور ویران و اجاڑ اور شورہ زار زمینوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس سے بارش کے برسنے پر کوئی اثر نہیں ہوتا(۱)۔

خداوند عالم کو ہدایت خلق کا نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت، بلکہ وہی ذات ہی تو ہے جس نے "أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ" (طہ / ۵۰) ہر شئے کو وہی کچھ دیا جو اس کی خلقت کیلئے لازم تھا پھر اس کی ہدایت کی، اس میں نہ تو اس کی کوئی ضرورت شامل ہے اور نہ ہی اس نے کسی سے اپنے کرم اور جود و سخا کا عوض مانگا ہے

تیسرا یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا کیا فائدہ تھا اور اس کی کیا مصلحت اور حکمت تھی؟

۳۔ تیسرا اعتراض اور اس کا جواب

تو اس کا جواب یہ ہے کہ :

الف: اس بات کا علم ضروری ہے کہ خالق کائنات کے ہر فعل اور ہر حکم میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے ایک حکمت نہیں بلکہ کئی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ عبث، اتفاقیہ اور بے مقصد کاموں کے انجام دینے سے منزہ و مبرا ہے، البتہ یہ اور بات ہے کہ بہت سے امور میں ہم تفصیل کے ساتھ نہ جانتے ہوں کہ اس امر کی حکمت کیا ہے۔ اگرچہ ہم صرف قانون کلی کے تحت صرف اجمالی طور پر ہی اس مصلحت کو جانتے ہوں۔ اگر کوئی چیز ہم پر کسی وقت مخفی ہو جاتی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ شئے سرے سے ہے ہی نہیں۔

یہ جواب تو اس حد تک کافی ہے۔

ب: سجدے کے ادا کرنے کا حکم تمام ملائکہ کے لئے عمومی تھا اور وہ بھی اس وقت انہی میں گھسا ہوا تھا، لہٰذا ثانوی طور پر یہ حکم اسے بھی شامل ہو گیا، لیکن جب اس نے سرکشی کی، نافرمانی پر اتر آیا، تکبر کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اس حکم میں شامل سمجھنے کے بعد انکار کر دیا تو اس وقت یہی ملعون اور رجیم ہو گیا۔

ج: اوامر الٰہی اور تکالیف شرعی اس لئے ہوتی ہیں تاکہ نفوس کے جوہر کھلیں اور باطن کی چیزیں کھل کر باہر آجائیں اور خیر و

(۱) جیسا کہ شعر ہے:

كَقَطْرِ الْمَاءِ فِي الْأَصْدَافِ دُرٌّ وَ فِيْ بَطْنِ الْأَفَاعِيْ صَارَ سَمًّا

جیسے بارش کے پانی کے قطرے ہوتے ہیں جو صدف میں تو موتی ہوتے ہیں اور سانپ کے پیٹ میں زہر کے قطرے بن جاتے ہیں۔

شر اور سعادت و شقاوت کے پردے چاک ہوں تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور دلیل بھی قائم ہو جائے "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "(انفال / ۴۲) جو تباہ برباد ہو تو وہ بھی دلیل کے ذریعہ برباد ہو اور جو زندہ و پائندہ رہنا چاہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ و پائندہ رہے۔

چوتھا اعتراض یہ تھا کہ کفار و منافقین کو کیوں عذاب ملے گا؟ انہیں کیوں سزا دی جائے گی؟ اور انہیں رحمت و کرامت سے کیوں دور کیا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخروی سزاؤں کا سبب اس کا غضب، انتقام اور ازالہ غیظ نہیں ہے

۴۔ چوتھا اعتراض اور اس کا جواب

کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں بلند و بالاتر ہے کہ کسی کو اس انداز میں سزائیں دے۔ بلکہ یہ نفس کے داخلی اور باطنی اسباب و احوال ہوتے ہیں جو اس کی خواہشات کی پیروی کے نتیجے میں اسے ہاویہ اور سقوط کی منزلوں تک لے جاتے ہیں اور اسے جہنم کے آخری طبقوں تک جا پہنچاتے اور وہاں سانپ اور بچھوؤں کا ہم نشین بنا دیتے ہیں۔

اس کی دنیوی مثال یوں سمجھئے جیسے انسان نفس کا کہنا مان کر ایسی ایسی غذائیں استعمال کرتا ہے کہ ان کے نتیجہ میں مختلف النوع بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور جسمانی دکھ درد میں مبتلا اور چیخ و پکار کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اس میں قصور کسی اور کا نہیں بلکہ اس کا اپنا ہوتا ہے اگر وہ احتیاط سے کام لیتا اور نفس کا کہنا نہ مانتا تو یہ دن دیکھنے اسے نصیب نہ ہوتے۔ اسی طرح کی کیفیت ہے اخروی عذاب کی جدائی اور دردناک ہوتا ہے۔ اور آیات الٰہی سے منہ موڑنے والے منکرین حق کیلئے تو ایسی "نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ "(ھمزہ / ۷) اللہ کی بھڑکنے والی آگ ہو گی جو سینوں تک سوار ہو جائے گی۔

البتہ اس مقام پر جو آیات و احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مجرم کو بعض ایسی جسمانی سزائیں ملتی ہیں جن کا تعلق خارج سے ہوتا ہے تو بھی در حقیقت ان کا منبع و مرکز اور محلِ صدور باطنی امور اور نفسانی ہیئت ہوتی ہے، یہ سزائیں وہاں سے اٹھتی ہیں اور ظاہر میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں اور آگ، سانپ، بچھو اور لوہے کے ہتھوڑے ایسی صورتیں بدل لیتی ہیں۔ اسی طرح آخرت میں ان کے گناہ، جسمانی صورت اختیار کر لیں گے، جیسا کہ "جسمانی معاد" اور "تجسم اعمال" کی مباحث، کیفیت اور اس پر بہت سی آیات کی دلالت شاہد ہے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ "(توبہ / ۴۹) یقیناً جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ یا جیسے فرماتا ہے: "وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ "(شعراء / ۹۱) جہنم گمراہ لوگوں کیلئے ظاہر کر دی جائے گی۔ اور فرماتا ہے: "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ "(تکاثر / ۵ تا ۷) خبردار! اگر تم آخرت کا علم الیقین رکھتے ہو تو تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے۔ پھر اس کو عین الیقین کے ساتھ مشاہدہ کرو گے۔ اور فرماتا ہے: "......اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ وَ حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ "(العادیات / ۹۔۱۰) اس دن جو بھی قبروں میں ہیں سب زندہ ہو جائیں گے۔ اور جو کچھ سینوں کے اندر ہے سب ظاہر اور آشکار ہو جائے گا۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کسی مجرم کو باہر سے سزا ملتی ہے تو اس میں بھی بڑی مصلحت ہے۔ کیونکہ سزا کا خوف اکثر افراد میں فائدہ مند رہتا ہے۔........اور پھر یہ کہ اس قسم کی سزائیں اگرچہ سزا پانے والے کیلئے شر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن

اس کے اکثر افراد نوع کیلئے کئی گنا خیر ہوتی ہیں۔ جس طرح بدن کے کسی عضو کے خراب ہونے پر اسے کاٹ دیا جاتا ہے تاکہ باقی جسم اور دیگر اعضاء اس سے محفوظ رہیں۔

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ ابلیس کو بہشت کے اندر آدمؑ تک رسائی کا موقع کیوں دیا؟ کیونکہ اس طرح سے وہ آدمؑ تک پہنچا، انہیں بہلا پھسلا کر درخت سے کچھ کھانے پر آمادہ کر لیا اور وہ اس درخت سے کھانے کے نتیجہ میں بہشت سے باہر آ گئے۔

۵۔ پانچواں اعتراض اور اس کا جواب

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اس میں بھی بہت بڑی حکمت اور ایک عظیم فائدہ تھا، کیونکہ اگر حضرت آدمؑ جنت میں ہمیشہ باقی رہتے تو وہ صرف اکیلے ہی وہاں پر رہتے اور روز اول کی طرح صرف خود ہی ہوتے ان میں تکامل اور ارتقاء نہ ہوتا اور نہ ہی ایک اور فطرت سے آشنا ہوتے۔ لیکن اب جبکہ زمین پر اتار دیئے گئے تو ان کی صلب سے بے حد و حساب ایسی اولاد پیدا ہوئی جو قیامت تک خدا کی عبادت و اطاعت میں مصروف ہے۔ اور اس اولاد میں سے بہت سے افراد ہر دور میں علم و عبادت کی قوت سے بہشت کے درجات کیلئے ترقی کے زینے طے کرتے آرہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور ارفع، اعلیٰ، احل، اجل اور اعظم حکمت، مصلحت اور فائدہ کیا ہوگا کہ آپ ہی کی نسل سے انبیاء، اولیاء اور ائمہ اطہار پیدا ہوئے، جن میں سید المرسلینؐ اور ان کی معصوم اولادؑ بھی شامل ہے۔ (ان سب پر اللہ کا درود و سلام ہو)۔ اور اگر ابلیس کے ساتھ حضرت آدمؑ کے زمین پر نزول کی وجہ سے صرف مدت دنیا کی ابتدا اور آنجنابؑ کا صفی اللہ کے درجہ تک پہنچنا ہی ایک بڑی حکمت اور عظیم چیز ہے۔

چھٹا اعتراض یہ ہے کہ ابلیس اولاد آدمؑ پر مسلط کر دیا گیا ہے کہ انہیں گمراہ کرے، بے راہروی پر چلائے اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے لیکن کوئی انسان اسے دیکھ نہیں پاتا، کس لئے؟

۶۔ چھٹا اعتراض اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ: افراد بشر کے نفوس پہلی فطرت میں بالقوہ طور پر ناقص ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جو نورانی ہوتے ہیں، ان میں شرافت پائی جاتی ہے اور وہ بالقوہ طور پر مقدس امور اور بڑے عظیم انداز میں آخرت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ایک وہ بھی ہوتے ہیں جن کے جوہر نہایت ہی خسیس اور پست اور ظلمانی ہوتے ہیں، ان میں شرارت پائی جاتی ہے، جسمانیت اور مادیات کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بڑے غضب کے شہوت ران اور غیظ و غضب کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

اگر اولاد آدمؑ گمراہی کا شکار اور اطاعت نفس میں مبتلا نہ ہوتی تو یہ خدا کی حکمت اور مصلحت کے منافی ہوتا۔ کیونکہ کائنات میں صرف ایک ہی طرح کی مخلوق ہوتی جو بالکل ہی شریف، سیدھی، سادہ اور بے ضرر ہوتی۔ اگر زمین پر شرارتی، گمراہ کن اور جھگڑالو لوگ نہ ہوتے تو دنیا غیر آباد، بے رونق، بے مزہ اور بے کیف ہوتی۔

کیا آپ نے یہ حدیث قدسی ملاحظہ نہیں فرمایا فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "میں نے آدم کی نافرمانی کو دنیا جہان کی آبادی کا سبب قرار دیا ہے"۔ نیز اسی طرح کی ایک اور حدیث قدسی بھی ہے کہ: "اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہٹا کر ایک گناہگار ٹولے کو لے آتا"۔

آبادی کا سبب قرار دیا ہے"۔ نیز اسی طرح کی ایک اور حدیث قدسی بھی ہے کہ :"اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہٹا کر ایک گناہگار ٹولے کو لے آتا"۔

۷۔ ساتواں اعتراض اور اس کا جواب ساتواں اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو گمراہی کیلئے وقت معلوم تک کی مہلت کس لئے دی؟

تو اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کیونکہ اس کی وقت معلوم تک زندگی نوع بشر کی زندگی کے تابع ہے۔ یعنی جب تک انسان ہیں ابلیس کی گمراہی بھی ساتھ رہے گی اور اسے رہنا بھی چاہئے تاکہ مذکورہ بالا نتائج اور فوائد حاصل ہوں۔

یہ تھی اعتراضات کی نوعیت اور ان کے جوابات کی کیفیت جو ہمیں بہتر اور مناسب معلوم تھا ذکر کر دیا ہے البتہ ان میں سے بعض معروضات تامل اور اشکال سے خالی بھی نہیں ہیں، غور کیجئے گا۔

بارھویں فصل

حضرت آدمؑ کا جنت میں ٹھکانہ

ثُمَّ اَسْكَنَ آدَمَ دَارًا اَرْغَدَ فِيْهَا عِيْشَتَهٗ وَ اٰمَنَ فِيْهَا مَحَلَّتَهٗ وَ حَذَّرَهٗ اِبْلِيْسَ وَ عَدَاوَتَهٗ فَاغْتَرَّهٗ عَدُوُّهٗ نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ وَ مُرَافَقَةِ الْاَبْرَارِ فَبَاعَ الْيَقِيْنَ بِشَكِّهٖ وَ الْعَزِيْمَةَ بِوَهْنِهٖ وَاسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ وَجَلاً وَ بِالاغْتِرَارِ نَدَمًا.

پھر اللہ نے آدمؑ کو ایسے گھر میں ٹھہرایا جہاں ان کی زندگی کو خوشگوار رکھا اور مقام سکونت کو پرامن رکھا انہیں شیطان اور اس کی عداوت سے بھی ہوشیار کر دیا۔ لیکن ان کے دشمنوں نے ان کے جنت میں ٹھہرنے اور نیکوکاروں میں مل جل کر رہنے پر حسد کیا اور آخر کار انہیں فریب دے دیا۔ آدمؑ نے یقین کو شک کے اور ارادے کے استحکام کو کمزوری کے ہاتھوں بیچ ڈالا، مسرت کو خوف سے بدل لیا اور عزت کی زندگی کو ندامت سے۔

تشریح "رَغَدٌ" کے معنی ہیں ایسا منافع جو وسیع بھی ہو اور کثیر بھی اور اس کے حصول میں محنت بھی نہ کرنی پڑے۔ ابن درید کہتے ہیں "رَغَدٌ" سے مراد زندگی کی وسعت ہے۔ "عِيْشَةٌ" عین کے کسرہ کے ساتھ "عَيْش" (عین کے فتحہ کے ساتھ) کی مانند ہے، عیش کے معنی ہیں زندگی اور "عِيْشَةٌ" کے معنی ہیں جس سے زندگی بسر کی جائے یعنی رزق و روزی، کھانا پینا وغیرہ۔ "اِغْتَرَّ"، "غِرَّةٌ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "غفلت"۔ "نَفَاسَةٌ" (بروزن کَرَامَةٌ) لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے ہم معنی ہیں۔ "مَقَام" میم کے فتحہ کے ساتھ اسم مکان ہے "قَامَ يَقُوْمُ" سے جس کا معنی ہے کھڑا ہونے کی جگہ اور اگر "مُقَام" میم کے رفع کے ساتھ پڑھا جائے تو بھی "اَقَامَ يُقِيْمُ" کا اسم مکان ہوگا اور دونوں صحیح ہیں۔ "عَزِيْمَةٌ" کے معنی ہیں جدو جہد۔ "جَذَل" جیم اور ذال کے فتحہ کے ساتھ بمعنی خوشی کے ہے۔ اور "اِعْتَزَّ" کے معنی ہیں اس نے اپنے آپ کو عزیز جانا۔

ایک ادبی نکتہ

یہاں پر کلام کے اول میں لفظ "ثُمَّ" آیا ہے جو حرف عطف ہے اور تعقیب کا فائدہ دیتا ہے یعنی "پھر" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا امامؑ کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ کو سجود ملائکہ کے بعد بہشت میں ٹھہرایا گیا۔ اور یہ بات سورہ بقرہ کی ایک آیت شریفہ میں مذکور ترتیب ذکری کے بھی مطابق ہے، جیساکہ ارشاد ہوتا ہے: "وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ" (بقرہ / ۳۴) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو! پھر ساتھ ہی فرماتا ہے: "وَ قُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ" (بقرہ / ۳۵) اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں جا ٹھہرو۔

لیکن بعض روایات اور بعض آیات کے ظاہر اور تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے (۱) آدمؑ کو ملائکہ نے اس وقت سجدہ کیا جب وہ جنت میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت شریفہ اور قول امیر المؤمنینؑ میں "سکونت" سے مراد ایسا قیام ہے کہ جس میں سکون اور قرار ہو۔ اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ حضرت آدمؑ اس سے پہلے بھی جنت میں رہ چکے ہوں اور فرشتوں نے اس وقت سجدہ کیا ہو جب آپ وہاں پر تشریف فرما ہوں۔

"وَ حَذَرَةَ اِبْلِيْسَ" میں لفظ ابلیس، منصوب بنزع خافض ہے جس کا اصل ہے "حَذَرَةَ مِنْ اِبْلِيْسَ" اور لفظ "نَفَاسَةً" مفعول لہ ہے، "بِدَارِ الْمَقَامِ" میں "با" سببیت کیلئے ہے "بِشَكِّهِ"، "بِالْجَذَلِ" اور "بِالاِعْتِزَازِ" میں "با" مقابلہ کیلئے ہے البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "مِنْ" کے معنی میں ہو۔ غرض آمدم بر سر مطلب۔

(پھر) جب اللہ نے ملائکہ کو آدمؑ کے سجدے کا حکم دیا تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو رجیم بنا کر اپنی درگاہ سے نکال دیا تو (آدمؑ کو ایسے گھر میں ٹھہرایا جہاں ان کی زندگی خوشگوار رکھی) اور انہیں ایک وسیع زندگی عطا کی جیساکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "وَ قُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا" (بقرہ / ۳۵) اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں جا ٹھہرو اور (اللہ کی نعمتوں سے) جو چاہو مزے سے کھاؤ۔

(اور ان کے محل سکونت کو وہاں پرامن رکھا) محل سکونت کی طرف امن کی نسبت مجاز عقلی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ کو آفات سے امن و سکون قرار دیا اور صدمات و ناخوشگوار صورتحال سے محفوظ رکھا۔ اور یہ جنت کی صفتیں ہیں کیونکہ جو بھی جنت میں جائے گا امن کے مقام پر جا پہنچے گا۔ قرآن مجید میں ہے: "اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ" (حجر / ۴۶) (خدا کے فرشتے ان سے کہیں گے) امن اور سلامتی کے ساتھ بہشت کے باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

کونسی جنت؟

یہاں تک تو یہ بات درست ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جنت میں اللہ نے آدمؑ کو ٹھہرایا آیا یہ دنیوی جنت تھی؟ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جس کو امام رازی نے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں: "لوگوں کا اس بات میں اختلاف ہے کہ "جس

(۱) قرآن مجید میں ہے، شیطان سے اللہ نے فرمایا "فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ" (حجر / ۳۵۔ ص / ۷۷) ان فرشتوں کی صف سے نکل جا کہ تو ہماری درگاہ سے راندہ گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے "قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ" (اعراف / ۱۳)

بہشت کا اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے آیا یہ زمین میں ہے یا آسمان میں؟ اور اگر آسمان میں ہے تو کیا وہ "دار الثواب" ہے یا "جنت الخلد" ہے یا کوئی اور جنت؟" چنانچہ:

الف: ابو القاسم بلخی اور ابو مسلم اصفہانی کہتے ہیں یہ جنت زمین پر تھی اور لفظ "اہباط" یعنی اتارنے کو ایک اور معنی پر حمل کیا ہے یعنی اسے "انتقال" کے معنی میں لیا ہے، یعنی ایک حصہ سے دوسرے حصے میں منتقل کر دینا (دوسرے لفظوں میں جلاوطنی)، جیسا کہ ارشاد رب ہے: "اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا" (بقرہ / ۶۱) (موسیٰ کے ماننے والوں سے کہا گیا) شہر میں منتقل ہو جاؤ۔ اپنے اس موقف پر انہوں نے چند دلائل پیش کئے ہیں:

دلیل اول: اگر یہ جنت "دار الثواب" ہوتی تو یقیناً وہ دار الخلد ہوتی اور اگر آدمؑ جنت الخلد میں ہوتے تو انہیں ابلیس کی طرف سے یہ فریب نہ دیا جاتا کہ: "هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡكٍ لَّا يَبۡلٰى" (طٰہٰ / ۱۲۰)...... آدمؑ! آیا چاہتے ہو کہ تمہیں جاودانی عمر کے درخت اور لافانی ملک کی طرف راہنمائی کروں؟۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ کا یہ قول صحیح ہوتا: "مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنۡ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَيۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِيۡنَ" (اعراف / ۲۰) تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا لیکن صرف اس لئے کہ (اگر اس سے کھالو گے تو) فرشتے بن جاؤ گے یا ہمیشہ کیلئے (بہشت میں) رہو گے۔

دلیل دوم: جو ایک دفعہ جنت میں پہنچ جائے وہ اس سے باہر نہیں نکلے گا، خدا فرماتا ہے: "وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنۡهَا" (مائدہ / ۳۷) وہ اس سے نکل نہیں پائیں گے۔

دلیل سوم: جب ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا تو ملعون قرار پایا اور غضب الٰہی کی وجہ سے اس کی جنت الخلد تک رسائی ناممکن ہو گئی تھی۔

دلیل چہارم: جنت جو "دار الثواب" ہے اس کی نعمتیں لازوال اور غیر فانی ہیں، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا" (رعد / ۳۵) اس کی خوراک دائمی ہے اور اس کا سایہ پائیدار ہے۔ نیز فرماتا ہے: "وَ اَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا .... عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ" (ھود / ۱۰۸) لیکن جو نیک بخت اور سعادتمند لوگ ہیں وہ جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں ہمیشہ جنت میں رہیں گے، مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے۔ یہ ختم نہ ہونے والی بخشش ہے۔

تو یہ جنت کہ جس میں آدمؑ داخل ہوئے غیر فانی ہوتی جبکہ خدا فرماتا ہے کہ: "كُلُّ شَىۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ" (قصص / ۸۸) خدا کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ ان فانی اشیاء میں ایک جنت ہے، اگر فانی نہ ہوتی تو اس سے آدمؑ باہر نہ نکالے جاتے اور اس کی راحتیں ان کیلئے ختم نہ ہوتیں۔

پانچویں دلیل: یہ بات خدا کی حکمت اور مصلحت کے بالکل خلاف ہے کہ اپنی مخلوق کی ابتدا ایسی جنت سے کرے جو دائمی ہے اور اس میں فرض کی ادائیگی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ عمل کرنے والوں کو جزا انہیں نہیں دیتا جنہوں نے کوئی عمل ہی نہ کیا ہو۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بے کار پیدا نہیں کیا اور نہ ہی انہیں کسی تکلیف اور فرض کی پابندی کے اختیار کرنے کے بغیر چھوڑ دیا ہے بلکہ ان کیلئے ترغیب و تشویق، خوف و ڈر اور وعدہ وعید بھی مقرر فرمائے ہیں۔

جو دائمی ہے اور اس میں فرض کی ادائیگی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ عمل کرنے والوں کو جزا نہیں نہیں دیتا جنہوں نے کوئی عمل ہی نہ کیا ہو۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بے کار پیدا نہیں کیا اور نہ ہی انہیں کسی تکلیف اور فرض کی پابندی کے اختیار کرنے کے بغیر چھوڑ دیا ہے، بلکہ ان کیلئے ترغیب و تشویق، خوف و ڈر اور وعدہ وعید بھی مقرر فرمائے ہیں۔

چھٹی دلیل: اس بات میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو زمین ہی سے اور زمین ہی پر پیدا کیا، اور اس ساری داستان میں کہیں پر بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ انہیں خلق کرنے کے بعد آسمان کی طرف منتقل کیا گیا ہو۔ اگر انہیں وہاں منتقل کر دیا جاتا تو اس ذکر کو بطریق اولیٰ اور شایان شان طریقہ سے کیا جاتا۔ اس لئے کہ آدمؑ کو زمین سے آسمان کی طرف لے جایا جانا ایک بہت بڑی نعمت ہوتی، لہٰذا اس بات کا ذکر نہ کرنا دلیل ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اور جس جنت کے بارے میں اللہ نے آدمؑ سے فرمایا" اسكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ "(بقرہ / ۳۵) وہ جنت الخلد کے علاوہ کوئی دوسری جنت ہے۔

ب: جبائی کہتے ہیں کہ وہ جنت ساتویں آسمان پر ہے، اور اس کی دلیل خداوند عالم کا یہ قول ہے "اِهْبِطُوْا مِنْهَا" یہاں سے اتر جاؤ!۔ اور یہ "اترنا" دو مرحلوں میں تھا۔ پہلے مرحلہ میں ساتویں آسمان سے پہلے آسمان تک اور دوسرے مرحلے میں پہلے آسمان سے زمین تک۔

ج: ہمارے جمہور علماء کہتے ہیں کہ وہ جنت "دار الثواب" تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ "اَلْجَنَّةَ" پر داخل ہونے والا "الف لام" "عموم" کا فائدہ نہیں دیتا۔ کیونکہ تمام جنتوں میں سکونت تو محال ہے لہٰذا اسی الف لام کے ذریعہ اسے "معہود سابق" کی طرف لوٹایا جائے گا اور مسلمانوں کے درمیان معہود و معلوم بہشت وہی "دار الثواب" ہی ہے، لہٰذا اسے اسی طرف لوٹایا جائے گا۔

د: تمام صورتیں ممکن ہیں اور تمام نقلی دلائل ضعیف اور ایک دوسرے سے متعارض و متصادم ہیں، لہٰذا توقف اختیار کرنا اور کوئی قطعی رائے نہ دینا واجب ہے۔ واللہ اعلم۔

قول شارحؒ: یہ تھا تمام آراء کا خلاصہ لیکن ہمارے نزدیک پہلا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس کے دلائل بہت قوی ہیں، اگرچہ ان دلائل میں نظر ثانی کی گنجائش ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ اخبار و احادیث عترت طاہرہؑ کیا کہتی ہیں؟ چنانچہ:

کافی اور علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا: "وہ بہشت دنیوی تھی، جہاں سورج اور چاند طلوع کرتے تھے۔ اگر جنت الخلد ہوتی تو وہاں سے کبھی باہر نہ نکلتے"۔ اسی طرح کافی اور علل الشرائع کی مانند ایک اور روایت علی بن ابراہیم قمیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کی ہے۔ بہر صورت، حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں (اور اللہ نے انہیں شیطان اور اس کی عداوت سے بھی خبردار کر دیا تھا) اور یہ اشارہ ہے سورہ طٰہٰ میں حضرت باری تعالیٰ کے اس قول کی طرف: "وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوْا ...... مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى" (طٰہٰ / ۱۱۶۔۱۱۷) اور جس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا، آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا اور سجدہ نہ کیا، ہم نے کہا: اے آدمؑ! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے!

کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں جنت سے باہر نکلوادے کیونکہ اس طرح سے تو تم زحمت اور مشقت میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن شیطان نے ان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور کہا" ...... یٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى"(طٰہٰ / ۱۲۰)...... اے آدم! کیا میں تجھے تیری عمر جاودانی کے درخت اور لافانی ملک کی طرف راہنمائی کروں؟(لیکن ان کے دشمن نے ان کے جنت میں ٹھہرنے اور نیکوکاروں) اور روحانی مخلوق اور فرشتوں (میں مل کر رہنے پر حسد کیا) جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ: "فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَ عَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی"(طٰہٰ / ۱۲۱) آخر کار ان دونوں نے اس میں سے کھالیا(جس کے نتیجے میں ان کا بہشتی لباس ان سے اتر گیا) اور ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور دونوں بہشت کے پتے اپنے اوپر لپیٹنے لگے اور (آخر کار) آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور اس کے انعامات سے محروم ہو گیا۔

رہی حسد کی کیفیت تو اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ کے صفحات میں آئے گا۔(پس آدمؑ نے یقین کو شک کے ہاتھوں بیچ ڈالا) کہتے ہیں کہ "یقین کو شک کے بدلے بیچنے" کی مثال عربوں میں قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ اور یہ اس شخص کیلئے بولی جاتی ہے جو غیر مفید کام کرے اور کارآمد کاموں کو چھوڑ دے۔ حضرت امیرؑ نے یہاں پر بھی وہی ضرب المثل بیان فرمائی ہے اس سے آپؑ کا مقصد یہ کہنا نہیں تھا کہ "آدمؑ نے امر الٰہی میں شک کیا"۔

البتہ ایک اور بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ کلام امیر المؤمنینؑ کو اس کے ظاہر پر ہی جاری کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یقین سے مراد ابلیس کی عداوت کا یقین ہو اور شک سے مراد اس کی عداوت میں شک ہو اور اس کی بیع سے مراد اس کے ساتھ تبدیلی ہو وہ یوں کہ جب ابلیس نے سجدہ سے اباؤ انکار کیا اور اپنی فضیلت وانانیت کا اظہار کیا اور راندہ درگاہ قرار پایا تو آدمؑ کو اس کی عداوت کا یقین ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دشمنی سے بھی مطلع کر دیا تھا اور فرمادیا تھا کہ: "فَقُلْنَا يٰاٰدَمُ .... مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی"(طٰہٰ / ۱۱۷) ہم نے کہا اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوادے کیونکہ اس طرح سے تم زحمت ومشقت میں پڑ جاؤ گے۔ لیکن جب شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا" وَ قَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ"(اعراف / ۲۱) اور ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، انسانوں کے اس پہلے جوڑے نے اس سے پہلے کبھی کسی کو جھوٹی قسمیں کھاتا ہوا نہیں دیکھا تھا، لہذا اس کی قسم پر اعتبار کر لیا اور اس کی دشمنی کے بارے میں شک کرنے لگے۔ اور اس نظریئے کا استنباط عیون الاخبار اور الاحتجاج کی روایت سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون سے بیان فرمائی تھی۔ انشاء اللہ آگے چل کر اسے ذکر کیا جائے گا، جیسا کہ بعض لوگوں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ یہ شان رسالت کے منافی ہے، ایسی بات نہیں ہے اس سے رسالت کے مرتبہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ یہ بات درخت کے کھانے سے زیادہ بڑی نہیں ہے۔ اس کی مزید تحقیق انشاء اللہ آگے بیان ہو گی۔

آدمؑ کا عہد

(اور) حضرت آدمؑ نے (ارادے کے استحکام کو کمزوری کے ہاتھوں) بیچ ڈالا۔ ارادے کا استحکام یہ تھا کہ درخت کے نزدیک

نہیں جائیں گے اور اس سے کچھ نہیں کھائیں گے، اور کمزوری یہ دکھائی کہ اس عزم کو بھول گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (طٰہٰ / ۱۲۵) اور ہم نے آدمؑ سے پہلے پہل عہد لے لیا تھا لیکن وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں عزم و استقامت نہ پائی۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ: "عزم سے مراد ایسا پختہ ارادہ جو حضرت آدمؑ نے کر لیا تھا کہ درخت سے کچھ نہیں کھائیں گے اور اپنے اندر اس قدر پختگی پیدا کریں گے کہ شیطان کو اس کی آرزوؤں میں ناکام بنا دیں گے۔..............

علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں: "ہم نے اسے حکم دیا اور اسے تاکید کر دی تھی کہ نہ تو درخت کے پاس جائے گا اور نہ ہی اس سے کچھ کھائے گا۔ لیکن آدمؑ نے اس بات کو ترک کر دیا"۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں کہ: "ہم نے اس کی طرف سے پختہ عہد نہ دیکھا"۔ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں "فَنَسٰی" "نسیان سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "بھول" اور "لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" کے معنی ہیں "ہم نے گناہ کے ارتکاب پر اس کا عزم نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ ایسا کرنا چاہتا تھا" یہ قول ابن زید اور دوسرے لوگوں کا ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں: "جس بات کا ہم نے اسے حکم دیا تھا اس سے اس کی حفاظت نہیں دیکھی" یہ عطیہ کا قول ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ عزم کے معنی صبر کے ہیں، جبکہ شارح بحرانی نے مذکورہ تمام اقوال کا خلاصہ صرف ایک جملے میں بیان کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس کے معنی ہیں: "اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو حکم دیا تھا اس کی حفاظت کی قوت آدمؑ میں نہیں تھی"۔

کافی میں علی ابن ابراہیم سے اسناد کے ساتھ حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت ہے۔ آپؑ نے فرمایا: "اللہ نے آدمؑ سے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ درخت کے قریب نہیں جائیں گے لیکن جب وہ وقت پہنچ گیا جو اللہ کے علم میں تھا کہ اس وقت وہ اس درخت سے کھائیں گے تو آدم اس عہد کو بھول گئے اس لئے خدا فرماتا ہے "وَلَقَدْ عَهِدْنَا......"

اسی طرح کافی ہی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: "وَ لَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی آدَمَ مِنْ قَبْلُ......" کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "اس عہد سے مراد حضرات محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کی ذریت سے ہونے والے آئمہ علیہم السلام کے بارے میں کچھ کلمات تھے جنہیں آدمؑ نے فراموش کر دیا ...."۔

شارحؒ کہتے ہیں: روایات میں جو ذکر ہوا ہے اور آگے چل کر بھی کچھ بتایا جائے گا کہ ان کلمات سے مراد حضرت پیغمبر اکرمؐ اور ان کی معصوم آلؑ کی فضیلت تھی جس کا اقرار آدمؑ سے لیا گیا، اور انہوں نے ان کی شرافت کا اعتراف بھی کیا تھا ساتھ میں یہ عہد بھی کیا تھا کہ ان کی شان و منزلت کی تمنا بھی نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے ان کلمات کو فراموش کر دیا، ان کی جاہ و منزلت کی تمنا کرنے پر اتر آئے، انجام کار اللہ نے انہیں بہشت سے نکال دیا۔ (اور آدمؑ نے مسرت کو خوف سے بدل لیا اور عزت کی زندگی کو ندامت میں تبدیل کر دیا) وہ چاہتے تھے کہ درخت سے کچھ کھا کر عزت کی زندگی حاصل کر لیں گے لیکن انہیں ندامت اور ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا اسی لئے توبہ کیلئے انہوں نے کہا"......رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ" (اعراف / ۲۳) ان دونوں (آدم وحوا) نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ

چند ضروری باتیں

۱۔ابلیس کی آدمؑ تک رسائی کیونکر ممکن ہوئی ؟

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت آدمؑ بہشت میں تھے اور ابلیس وہاں سے باہر تو وہ حضرت آدمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالنے میں کیونکر کامیاب ہوا ؟ جواباً عرض ہے کہ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

اول : قصاص ،ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب ابلیس نے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو خازنین جنت نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ تو وہ "سانپ" کے پاس آیا ، سانپ اس وقت چوپایہ تھا جس کی اونٹ کی مانند چار ٹانگیں تھیں اور وہ اس وقت تمام چوپایوں سے زیادہ خوبصورت تھا ، البتہ ابلیس پہلے دوسرے تمام جانوروں کے پاس بھی گیا لیکن صرف سانپ نے حامی بھر لی اور باقی جانوروں نے اسے دھتکار دیا ، چنانچہ اس نے ابلیس کو نگل لیا اور خازنین جنت کی نظروں سے بچ بچا کر اسے جنت کے اندر لے گیا جب جنت کے اندر پہنچ گئے تو ابلیس اس کے منہ سے باہر آگیا اور وسوسے ڈالنے میں مصروف ہو گیا ، جس کے نتیجہ میں سانپ پر لعنت کی پھٹکار پڑی اور اس کی ٹانگیں گر پڑیں اور وہ پیٹ کے بل چلنے لگا ، اس کی روزی مٹی قرار دی گئی اور اولاد آدمؑ کا دشمن قرار پایا۔

دوم : وہ جنت میں ایک چوپائے کی صورت میں داخل ہوا۔

سوم : بعض علمائے اصول کہتے ہیں کہ : "ہو سکتا ہے کہ آدمؑ اور حوا جنت سے نکل کر اس کے دروازے تک آجایا کرتے ہوں اور ابلیس ان کے نزدیک جا کر ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہو"۔

چہارم : ابلیس زمین پر رہ کر بہشت میں ان کے دلوں تک وسوسے پہنچاتا رہا۔

شارح فرماتے ہیں : قول اول زیادہ بہتر ہے جبکہ قول چہارم نا قابل قبول ، کیونکہ وسوسہ اس مخفی کلام کو کہتے ہیں جو دلوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور اس قسم کے مخفی کلام کا دور سے دلوں تک پہنچانا ناممکن ہوتا ہے۔

جبکہ دوسرے اور تیسرے قول کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی ، جبکہ ہماری روایات میں یہ بات موجود ہے کہ "ابلیس نے سانپ کے ذریعہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا ، اور اسی قول کو مفسر کاشانی (محسن فیضؒ) نے تفسیر صافی اور محدث جزائریؒ (سید نعمت اللہ جزائریؒ) نے اپنی کتاب انوار نعمانیہ میں یوں ذکر کیا ہے : جب شیطان کو جنت سے نکال دیا گیا تو وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا لہٰذا وہ بہشت کی دیوار کے پاس آیا اور ایک دیوار پر سانپ کو دیکھا۔ اس نے اس سے کہا "تو مجھے بہشت کے اندر لے چل میں تمہیں اسم اعظم بتاؤں گا"۔ سانپ نے جواب دیا : "ملائکہ جنت کی حفاظت کر رہے ہیں وہ تجھے دیکھ لیں گے" اس نے کہا : "مجھے اپنے منہ میں چھپا لو اور منہ کو بند کئے رکھو جب تک کہ میں بہشت میں پہنچ جاؤں گا"۔ چنانچہ سانپ نے ایسا ہی کیا اور اسی بات کا نتیجہ ہے کہ زہر سانپ کے دانتوں اور منہ میں قرار پائی۔ کیونکہ ابلیس لعین اسی جگہ بیٹھا رہا۔

بہر حال جب ابلیس اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا تو سانپ نے اس سے "اسم اعظم" مانگا ! اس نے جواب دیا : "اگر میں جانتا ہوتا تو تیرا محتاج ہوتا اور تیری منتیں کرتا ؟" اب وہ آدمؑ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا : "تمہارے رب نے اس درخت سے اس لئے روکا

ہے کہ تم فرشتے نہیں ہو، اگر تم اس سے کھالو گے تو غیب کو جاننے لگ جاؤ گے اور خدا کے مخصوص قدرت مند لوگوں میں تمہارا شمار ہونے لگے گا"۔ یا "تم بہشت میں ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو گے، تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی"۔ اور اس نے قسم کھائی کہ "میں تمہارا خیر خواہ ہوں"۔ اور ابلیس سانپ کے دونوں جبڑوں کے درمیان تھا اور آدم سمجھ رہے تھے کہ سانپ ان سے مخاطب ہے حالانکہ بول ابلیس رہا تھا۔ اس پر حضرت آدمؑ نے اس (سانپ) سے کہا: "یہ ابلیس کا فریب ہے، ہمارا رب ہمارے ساتھ کیونکر خیانت کر سکتا ہے؟ یا تم قسم کھا کر رب کی کیونکر تعظیم بجالا سکتے ہو؟ جبکہ تم ہی نے تو خیانت کو رب کی طرف نسبت دی، اور خدا کے بارے میں بد گمانی رکھتے ہو حالانکہ وہ اکرم الاکرمین ہے۔ یا میں وہاں تک پہنچنے کے بارے میں کیونکر سوچ سکتا ہوں جہاں سے میرے پروردگار نے مجھے روکا ہے۔ اور اس کے حکم کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکتا ہوں؟"

جب ابلیس حضرت آدمؑ سے مایوس ہو گیا تو سیدھا حضرت حوا کے پاس پہنچا اور وہی سابقہ انداز اختیار کر کے ان سے یوں مخاطب ہوا: "حوا! جانتی بھی ہو، اللہ تعالیٰ نے جس درخت کو پہلے تم پر حرام قرار دے دیا تھا، اب تم پر اسے حلال کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے تمہاری بہترین اطاعت اور اس کی توقیر و تعظیم کو بہترین انداز میں بجالانے کو قبول فرمالیا ہے، اسی لئے یہ درخت بھی تم پر حلال کر دیا ہے۔ جو فرشتے اس درخت کی حفاظت پر مقرر ہیں ان کے پاس جو حفاظتی ہتھیار ہیں، ان کے ذریعہ سے وہ بہشت کے دوسرے جانوروں کو ان سے دور رکھتے ہیں لیکن تمہیں وہ کچھ نہیں کہیں گے ...... پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اگر تم آدم سے پہلے اس درخت سے کھالو گی تو اس پر تمہیں مکمل طور پر قابو حاصل ہو جائے گا اور تم اس پر حکم چلاتی رہو گی اور وہ تمہارا فرمانبردار رہے گا"۔

یہ سن کر بی بی حوا نے کہا: "میں ابھی اس کا تجربہ کرتی ہوں"۔ چنانچہ جب وہ اس درخت کے پاس گئیں تو فرشتوں نے اپنے حفاظتی ہتھیاروں کے ذریعہ اسے روکنا چاہا، مگر اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ: "تم اپنے ہتھیاروں کے ذریعے ان کو روکتے ہو جن کے پاس روکنے والی عقل نہیں ہوتی، لیکن جنہیں میں نے عقل اور اختیار دیا ہے اور وہ اپنے اچھے برے کی تمیز بھی رکھتے ہیں تو انہیں اپنی عقل کے حوالے کر دو، کیونکہ میں نے عقل کو حجت قرار دیا ہے۔ اگر وہ میری اطاعت کرے گی تو میرے ثواب و جزا کی مستحق ہو گی اور اگر نہیں تو نہیں.............. اسے اپنے حال پر چھوڑ دو"۔

چنانچہ جب فرشتوں نے یہ امر الٰہی سنا تو ایک طرف ہو گئے۔ حضرت حوا نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ہر قسم کی رکاوٹ ہٹادی ہے اور اسے حرام کرنے کے بعد حلال کر دیا ہے۔ اور پھر کہنے لگیں: "سانپ نے سچ کہا تھا"۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا تھا کہ ان سے باتیں کرنے والا وہی ہے۔ غرض انہوں نے بغیر کسی قسم کی رکاوٹ کے اس درخت کا پھل لیا اور آدمؑ کے پاس آکر کہنے لگیں: "درخت ہمارے لئے مباح ہو گیا ہے، میں نے اس کا پھل بھی لیا ہے اس پر مجھے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا"۔

یہ سن کر حضرت آدمؑ ان کی باتوں میں آگئے اور ان کے ساتھ درخت کی طرف چل دئے۔ خطا کی طرف اٹھنے والا یہ پہلا قدم تھا۔ چنانچہ جونہی ان دونوں نے اپنے ہاتھ درخت کی طرف بڑھائے تو ان کے بدن پر موجود ہر قسم کا لباس اور دیگر سامان آرائش خود بخود اتر گیا اور وہ برہنہ ہو گئے، چنانچہ انہوں نے اپنی شرمگاہ کو چھپانے کیلئے انجیر کے پتوں کا سہارا لیا لیکن بے سود وہ بھی اتر گئے۔ آخر کار حضرت آدمؑ نے اپنا ایک ہاتھ شرمگاہ پر اور ایک سر پر رکھا، جیسا کہ لباس سے عاری لوگ کرتے ہیں۔ اخبار و روایات سے معلوم ہوتا

ہے کہ وضو کے وجوب کا سبب بھی یہی چیز بنی ہے۔ جسے صدوقؒ نے اپنی کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" میں ذکر کیا ہے۔ اور رسول خداؐ نے یہودی کے وضو کے بارے میں سوال کے جواب میں وضو میں اعضاء کے دھونے اور مسح کرنے کی علت بیان فرمائی ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہیں جن کا ذکر طوالت کا موجب ہوگا۔

۲۔ شجرہ ممنوعہ سے کونسا درخت مراد ہے

شجرہ ممنوعہ کے بارے میں مختلف اقوال اور روایات ہیں جن کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ بعض روایات کہتی ہیں کہ اس سے مراد :

ا: شجرہ حسد سے ہے، بعض کہتے ہیں کہ

ب: شجرہ کافور ہے، بعض کہتے ہیں کہ

ج: شجرہ گندم ہے۔ لیکن تفسیر امامؑ میں ہے کہ اس سے مراد :

د: شجرہ علم محمدؐ و آل محمدؐ ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دوسری تمام مخلوق پر ترجیح دی ہے اور اس کے امر و نہی تک رسائی صرف انہی بزرگوار ہستیوں کی ہوتی ہے۔ جس کا ایک نمونہ یوں سمجھئے کہ جب حضرت رسول خداؐ، امیر المؤمنینؑ، سیدہ طاہرہ اور حسنین شریفین علیہم السلام نے اپنا کھانا راہ خدا میں مسکین، یتیم اور اسیر کو دیدیا تو ان سے بھوک پیاس اور رنج والم کا احساس جاتا رہا۔ اور یہ ایک ایسا شجر ہے کہ دوسرے تمام اشجار سے ممتاز و منفرد ہے۔ اس لئے کہ دوسرے اشجار میں سے ہر ایک شجر ایک خاص نوعیت کے ثمر کا حامل ہے لیکن یہ شجرہ گندم، انگور، انجیر، عناب اور دوسرے کئی پھل میووں کا حامل ہے، اسی لئے جب اس کا تذکرہ آتا ہے تو اس کا ذکر کرنے والوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ گندم کا درخت ہے، کوئی کہتا ہے انگور ہے اور کوئی کہتا ہے کہ عناب وغیرہ، یہ وہ درخت ہے جس سے باذن خداوندی فیض حاصل کرنے والے کو اولین و آخرین کا علم عطا کیا جاتا ہے اور جو اذن اللہ کے بغیر حاصل کرنے کی کوشش کرے اپنے عزائم میں ناکام رہتا اور رب کا نافرمان گردانا جاتا ہے۔

عیون اخبار الرضا میں ہے کہ عبد السلام بن صالح ہروی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضاؑ کی خدمت میں عرض کیا :

"یابن رسول اللہؐ! مجھے اس درخت کے بارے میں بتایئے جس سے آدمؑ اور حوا نے کھایا تھا وہ کیا تھا؟ کیونکہ اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ گندم کا درخت تھا، کوئی کہتا ہے انگور کا اور کوئی کہتا ہے کہ حسد کا درخت تھا" امامؑ نے فرمایا: "سب ٹھیک کہتے ہیں" میں نے کہا: "ان کے اختلاف کی کیا وجہ ہے؟" آپؑ نے فرمایا: "اے ابو الصلت! شجرہ بہشت بہت سی انواع کا حامل ہوتا ہے، وہ گندم کا درخت، لیکن یہاں کے پودوں کی مانند نہیں تھا۔ بلکہ ایک درخت تھا جس پر انگور بھی لگتے تھے، جب آدمؑ کو اللہ نے فرشتوں کے سجدے کے ذریعہ عزت عطا فرمائی اور بہشت میں ٹھہرایا تو آدمؑ نے دل ہی دل میں کہا" آیا اللہ نے مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی انسان پیدا کیا ہے؟" اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کے حال کا علم ہوگیا تو انہیں فرمایا" آدمؑ! ذرا اپنا سر اوپر اٹھاؤ اور میرے عرش کے کنارے پر نگاہ کرو!" جب انہوں نے اپنا سر اٹھایا تو عرش کے کنارے لکھا دیکھا" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبِ

اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ وَزَوْجَتُهٗ فَاطِمَةُ سَيِّدَةُ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ"یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور علیؑ بن ابی طالب امیر المؤمنین ہیں ان کی زوجہ فاطمہؑ عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں اور حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں"۔

اس پر آدمؑ نے پوچھا: "خدایا! یہ کون لوگ ہیں؟" اللہ نے فرمایا: "یہ تمہاری اولاد میں سے ہیں لیکن تم سے اور میری تمام مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تمہیں پیدا کرتا اور نہ ہی جنت و دوزخ اور زمین و آسمان کو۔ آدمؑ! خبردار کہ ان کی طرف حسد کی آنکھ کے ساتھ دیکھا!! ورنہ تجھے اپنے قرب سے دور کر دوں گا"

لیکن حضرت آدمؑ نے ن کی طرف حسد کی آنکھ کے ساتھ دیکھا اور ان کی قدر و منزلت کی تمنا کی، انجام کار شیطان نے اپنا کام کر دکھایا اور شجرہ ممنوعہ سے انہیں کھانے پر آمادہ کر لیا۔ اسی طرح حضرت بی بی حوا نے جناب فاطمہ زہراؑ کی طرف حسد کی نظر سے دیکھا اور آدمؑ کی طرح انہوں نے بھی پھل کو نوش جان فرمالیا، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں اپنے قرب و جوار سے ہٹا کر زمین کے دور دراز حصے کی طرف بھیج دیا"۔

شجرہ ممنوعہ کی عرفانی تفسیر

بعض عارفین (یعنی علامہ محسن فیض کاشانیؒ) یوں تفسیر کرتے ہیں کہ: "جس طرح انسان کی جسمانی غذا کیلئے پھل میوے اور غلہ اناج وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح اس کی روحانی غذا کیلئے علوم و معارف جیسی غذا کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح کی جسمانی غذا کیلئے درختوں اور پودوں کا ہونا ضروری ہے جو پھل دے سکیں اسی طرح روحانی غذا کیلئے بھی پھل دار درختوں اور پودوں کا ہونا ضروری ہے۔

پھر انسانوں کی مختلف قسمیں ہیں، کچھ تو وہ ہیں جن کی روح کا بدن پر حکم غالب ہوتا ہے اور بعض اس کے برعکس ہیں۔ اسی طرح ان کے باہمی درجات بھی ہیں جن میں بعض کو دوسرے بعض پر فضیلت حاصل ہے اور جو کچھ نچلے درجے والے والوں کیلئے ہوتا ہے وہی کچھ بلند درجے والوں کیلئے بھی ہوتا ہے لیکن اس سے اور بھی کئی اضافی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح عالم جسمانی میں ہر ایک پھل کی بھی بعینہٖ اسی طرح اپنی ایک مناسبت ہے جس طرح عالم روحانی میں ہر روحانی پھل کی اپنی خاص مناسبت ہوتی ہے۔ اسی لئے "شجرہ" کی تفسیر کبھی تو "پھلوں کے درخت" سے کی جاتی ہے اور کبھی "علوم کے شجرہ" سے۔ اور علوم آل محمدؑ کا شجرہ ہونا اس کی کامل محبوبیت کی طرف اشارہ ہے جو ان تمام انسانی کمالات کیلئے ثمر آور ہوتا ہے، جو توحید محمدیؐ کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔ اور وہ "فنا فی اللہ اور بقا باللہ" ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور جس کی طرف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے "لِيْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِيْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ" (میرا پروردگار عالم کے ساتھ ایک ایسا وقت مقرر ہے جس میں نہ تو کوئی ملک مقرب مداخلت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نبی مرسل) اس لئے کہ اس وقت میں تمام معرفتوں کے پھل حاصل ہوتے ہیں۔ اور شجرہ کا فور ایسے یقین کی خنکی کی طرف اشارہ ہے جو اطمینان کامل کے باعث ہوتا ہے اور خلق عظیم

کے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے، جو ہمارے پیغمبر کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی اور آپؐ کے اہل بیت اطہار علیہم السلام اسی اطمینان کامل اور خلق عظیم کے وارث و جانشین تھے۔

مذکورہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جو لوگ اس درخت کی تاویل "خواہشات وطبیعت کے درخت" سے کرتے ہیں وہ بھی غلط نہیں کہتے کیونکہ اس درخت کا قرب، طبعی خواہشات ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور یہی مقصد ہے ان روایات کا جو یہ بتاتی ہیں کہ اس سے مراد "شجرہ حسد" ہے۔ اس لئے کہ حسد بھی تو مذکورہ خواہشات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے"۔

غرض کہ اس روایت اور اس سے پہلے بیان ہونے والی روایات سے یہ نتیجہ نکلا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جس طرح عالم ظاہر کے درخت کے پھل کو کھایا تھا اسی طرح عالم باطن و حقیقت میں اس درخت سے تناول فرمایا تھا جو محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام سے مخصوص تھا اور جسے اللہ نے اپنے دست قدرت سے لگایا تھا، لہذا ارتکاب خطا کی تفسیر و تاویل ظاہر و باطن میں برابر ہو گئی کہ جو آدمؑ کے زمین پر ہبوط کا سبب بنی۔

بعض اخبار و روایات میں یہ بھی ہے کہ یہی چیز غسل جنابت کے وجوب کا سبب بنی اور میراث میں مرد کے حصے کو عورتوں سے دوگنا قرار دینے کا موجب بنی۔ جیسا کہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" میں ایک روایت نقل کی ہے کہ: "ایک یہودی سرکار رسالتمابؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے کچھ سوالات کئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا:

___: اللہ تعالیٰ نے انسان کو جنابت سے غسل کا حکم تو دیا ہے لیکن پیشاب پاخانے سے غسل کا حکم نہیں دیا، اس کی کیا وجہ ہے؟

___: جب حضرت آدمؑ نے درخت سے کھا لیا تو غذا ان کے بالوں، رگوں اور چمڑے میں چلنے پھرنے لگ گئی اور پوری طرح اثر انداز ہو گئی لہذا جب انسان اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کرتا ہے تو پانی ہر اس مذکورہ جگہ سے حاصل ہو کر باہر نکلتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اولاد آدمؑ پر قیامت تک کیلئے غسل فرض قرار دے دیا۔ جبکہ پیشاب انسان کے مشروبات کا اور پاخانہ اس کے طعام و ماکولات کا فضلہ ہوتا ہے، اور اس کیلئے صرف وضو ہی کافی ہوتا ہے"۔

___: بے شک آپؐ نے درست فرمایا۔

اسی طرح عیون الاخبار میں ایک روایت حضرت امام رضاؑ سے منقول ہے کہ: ایک شامی نے حضرت امیر المؤمنینؑ سے سوال کیا:

___: عورت کی میراث سے مرد کی میراث دوگنا کیوں ہوتی ہے؟

___: اس لئے کہ درخت پر جو بالی (خوشہ کی صورت میں) تھی اس پر صرف تین دانے لگے ہوئے تھے اور حضرت حوا نے جلدی سے ایک دانے کو خود کھا لیا اور دو دانے حضرت آدمؑ کی خدمت بابرکت میں پیش کئے، اور ان جناب نے وہ تناول فرما لئے۔ اسی لئے "لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" (مرد کیلئے عورتوں کا دوگنا حصہ) قرار پایا۔

عصمت انبیاء کی تفصیلی بحث

عصمت کی تعریف

عصمت انبیاء کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، قبل اس کے کہ ہم ان اقوال کو نقل اور ان پر تبصرہ کریں، "عصمت" کے معنی کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ "عصمت" لغت میں "عَصَمَ يَعْصِمُ، ضَرَبَ يَضْرِبُ" کے باب اور وزن سے ہے اور مصدر ہے، جس کا لغوی معنی "حفاظت کرنا اور بچانا" ہے اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں: "مَلَكَةُ اجْتِنَابِ الْمَعَاصِي مَعَ التَّمَكُّنِ مِنْهَا" گناہوں کے ارتکاب پر قدرت رکھنے کے باوجود ان سے اجتناب کے ملکہ کو عصمت کہتے ہیں۔ جبکہ اس کی ایک اور تعریف یوں کی گئی ہے: "مَلَكَةٌ تَمْنَعُ الْفُجُورَ وَ يَحْصُلُ بِهَا الْعِلْمُ بِمَعَايِبِ الْمَعَاصِي وَ مَنَاقِبِ الطَّاعَاتِ" یعنی عصمت ایک ایسا ملکہ ہے جو گناہوں کے ارتکاب سے روکتا ہے اور اسی کے ذریعے خدا کی نافرمانی کے معیوب اور اطاعت کے محبوب ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

امام راغب کہتے ہیں: "عصمت، وہ فیض الہی ہے جس کے ذریعہ انسان خیر کو اپنانے اور برائیوں سے اجتناب کرنے کیلئے تقویت حاصل کرتا ہے۔ اور وہ فیض خواہ غیر محسوس ہی سہی اس کیلئے گناہوں سے رکاوٹ کی مانند ہو جاتا ہے"۔

علامہ، باب حادی عشر میں فرماتے ہیں: "عصمت خدا کا وہ مخفی لطف ہے جو اللہ تعالیٰ مکلفین کے ساتھ فرماتا ہے۔ اس طرح کہ قدرت رکھنے کے باوجود وہ اطاعت کو ترک نہ کریں اور معصیت کا ارتکاب نہ کریں"۔

علامہ سید مرتضیٰ (علم الہدیٰ) کتاب "الدُّرَرُ و الغُرَر" میں فرماتے ہیں کہ: "عصمت، خدا کا وہ لطف ہے جو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اور بندہ فعل قبیح سے رکنے کیلئے اسے اختیار کرتا ہے"۔ اسی بنا پر جب یہ کہا جائے کہ "یہ بندہ معصوم ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے فعل قبیح سے بچنے کیلئے خدا کے اسی لطف کو اختیار کیا ہے......"

مندرجہ بالا تعریفات اور تصریحات سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ عصمت ایک ایسا ملکہ ہے جو "معصوم" کو گناہوں کے ارتکاب سے روکتا ہے اور فرمانبرداری کے بجالانے پر آمادہ کرتا ہے۔ البتہ یہ معصوم کا اختیاری فعل ہوتا ہے مجبوری کے تحت ایسا نہیں کرتا تو جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ معصوم اجتناب معاصی اور ارتکاب اطاعات پر مجبور ہے، غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح سے وہ مدح و ستائش کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔

انبیاءؑ کی عصمت کے بارے میں مختلف اقوال

جب آپ کو عصمت کی تعریف کا علم ہو گیا تو اب ہم یہاں پر یہ بتائیں گے کہ عصمت انبیاءؑ کے بارے میں بھی لوگوں کے درمیان اختلاف ہے اور ہر ایک اپنے دلائل کے مطابق انبیاء کی عصمت کے بارے میں عقیدہ رکھتا ہے۔ مثلاً امام رازی فرماتے ہیں:

"اس بارے میں پیدا ہونے والا اختلاف چار قسموں پر مشتمل ہے۔ وہ

الف: جو اعتقادات کے بارے میں ہوتا ہے

ب: جو تبلیغ کے بارے میں ہوتا ہے

ج: جو احکام و فتاویٰ میں ہوتا ہے

د: جو انبیاء کے افعال اور ان کی سیرت کے بارے میں ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں (نعوذ باللہ) کفر اور گمراہی کا عقیدہ اکثر امت کے نزدیک ناجائز ہے، جبکہ خوارج میں سے "فضلیہ" ٹولے کا عقیدہ ہے کہ "ان سے بعض اوقات گناہ صادر ہوئے ہیں" اور گناہ ان کے نزدیک کفر اور شرک ہوتا ہے۔ لہذا وہ انبیاء کے کفر کے قائل ہیں لیکن امامیہ کا عقیدہ ان کے بالکل برعکس ہے، اگر ان کی طرف سے کوئی ایسے کلمات مل جائیں جو بظاہر کفر پر دلالت کرتے ہوں تو انہیں تقیہ پر محمول کیا جائے گا۔

رہا تبلیغ کے بارے میں ان کا اختلاف تو اس سلسلے میں پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام انبیاء تبلیغ سے متعلقہ امور میں جھوٹ اور تحریف سے معصوم ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انبیاءؑ پر سے وثوق ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ ان سے کوئی گناہ نہ تو عمداً سرزد ہوتا ہے اور نہ ہی سہواً۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہیں (جو بہت ہی اقلیت میں ہیں) جو کہتے ہیں کہ ان سے گناہ سہواً سرزد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے احترازنا ممکن ہے۔

احکام اور فتاویٰ کے بارے میں تمام امت کا اس بات پر اجتماع ہے کے عموماً ان سے خطا سرزد نہیں ہو سکتی البتہ سہو کے بارے میں کچھ لوگ جائز سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اس کا بھی انکار کرتے ہیں۔

البتہ چوتھی اور آخری قسم یعنی انبیاء علیہم السلام کے افعال اور سیرت کے بارے میں امت کے درمیان اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی پانچ قسمیں ہیں :

اول :ان لوگوں کا قول ہے جو انبیاء کیلئے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو جائز سمجھتے ہیں، اور اس کے قائل "حشویہ" ہیں۔

دوم :ان لوگوں کا قول ہے جو انبیاء کیلئے عمداً گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو جائز نہیں سمجھتے اور البتہ گناہ صغیرہ کے عمداً ارتکاب کو جائز سمجھتے ہیں، سوائے ایسے کاموں کے جس سے نفرت کی جاتی ہے۔ مثلاً دروغ بیانی اور ڈنڈی مارنا وغیرہ۔ اور اس قول کے قائل "معتزلہ" ہیں۔

سوم :ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاءؑ کیلئے عمداً گناہ صغیرہ و کبیرہ کا انجام دینا جائز نہیں۔ اور یہ قول "جبائی" کا ہے

چہارم :انبیاء صرف سہو اور غلط فہمی کی بنا پر گناہان کبیرہ ہی سرزد ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس کے بھی جوابدہ ہوں گے، اگرچہ یہ ان کی امت کی طرف سے ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ ان کی معرفت زیادہ قوی اور ان کے دلائل حد سے زیادہ ہیں۔ اور جتنا وہ اپنے آپ کو بچانے پر قادر ہوتے ہیں اتنا کوئی اور نہیں!

پنجم :ان سے کسی قسم کا گناہ سرزد نہیں ہوتا صغیرہ نہ ہی کبیرہ، جان بوجھ کر اور نہ ہی سہو و نسیان کی بنا پر۔ تاویل کی صورت میں اور نہ ہی غلط فہمی کی وجہ سے۔ اور یہ روافض (شیعوں) کا قول ہے۔

عصمت کب ملتی ہے ؟

اس بارے میں کہ انبیاءؑ کو عصمت کب عطا ہوتی ہے ؟ تین اقوال ہیں :

ا۔ وقت ولادت ہی سے معصوم ہوتے ہیں۔ یہ روافض (شیعوں) کا قول ہے۔

ب۔ انہیں بالغ ہونے کے ساتھ ہی عصمت عطا ہو جاتی ہے لیکن نبوت سے پہلے بھی ایسا کوئی کام نہیں کرتے جو کفر یا گناہ کبیرہ ہوتا ہو۔ یہ اکثر معتزلہ کا قول ہے۔

ج۔ عصمت، نبوت کے ساتھ ہی عطا ہوتی ہے لیکن نبوت سے پہلے ان سے گناہ کا ارتکاب جائز ہوتا ہے۔ اور یہ ہمارے اکثر علماء اور معتزلہ میں سے ابو ہذیل اور ابو علی کا قول ہے"۔

ایک بار پھر ہم آپ کو یہ یاد دلا دیں کہ مندرجہ بالا تمام گفتگو امام فخر الدین رازی کی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ، انبیاء علیہم السلام کیلئے معصیت اور کفر کو کبھی اور کسی وقت جائز قرار نہیں دیتے۔ البتہ موصوف نے ابتداء میں جو یہ فرمایا ہے کہ شیعوں کے نزدیک یہ ہے کہ "اگر انبیاء کبھی اظہار کفر کرتے ہیں تو یہ تقیہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ سراسر جھوٹ اور افتراء ہے۔ اور یہی وہ بہتان ہے جسے "صاحب مواقف" نے ذکر کیا ہے۔

یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ شیعہ کب انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کیلئے کفر کے اظہار کو کیونکر جائز سمجھ سکتے ہیں جبکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفوس قدسیہ اور قوت ربانیہ سے تائید و تسدید کی ہے۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یہ ان پر بہتان عظیم اور تہمت آشکار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ البتہ امام رازی نے جو یہ کہا ہے کہ "انبیاء کیلئے معصیت کو مطلقاً جائز نہیں سمجھتے" تو ان کی یہ بات حق ہے۔ اور اس پر ان کے عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں جنہیں انہوں نے اپنی کلام اور تفسیر کی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

شیعوں کے نزدیک عصمت انبیاءؑ کے دلائل

عصمت انبیاءؑ کے بارے میں شیعوں کے کئی دلائل ہیں،

دلیل اول : پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع واجب ہے اس لئے کہ نص قرآنی کے مطابق آپؐ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ لوگوں سے کہیں "اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ" (آل عمران / ۳۱) اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اگر آپؐ (نعوذ باللہ) عاصی ہوتے تو معصیت میں بھی آپؐ کی اطاعت واجب تھی، اس طرح سے حرام اور وجوب کو یکجا کرنے کی صورت پیدا ہو جاتی جو کہ محال ہے لہذا پیغمبرؐ معصوم ٹھہرے۔ جب یہ بات پیغمبر گرامی کے بارے میں ثابت ہے تو باقی انبیاء کے بارے میں بھی ثابت ہوگی، اس لئے کہ نبوت میں سب یکساں ہیں۔

دلیل دوم : اگر آپؐ معصیت کا کوئی اقدام کرتے تو نہی عن المنکر کے باب کے تحت اس اقدام پر آپؐ کو جھڑکنا واجب ہو جاتا۔ حالانکہ آپؐ کو جھڑکنا اور اذیت پہنچانا حکم الٰہی کے مطابق حرام ہے کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَ

رسولہٗ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا و الآخرۃ و أعدّ لھم عذابا مھینا" (احزاب / ۵۷) یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ انہیں دنیا و آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا (ان پر لعنت کرتا) ہے اور ان کیلئے خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

دلیل سوم: ایک نبی کہ اللہ نے جس کے درجات بلند کئے ہوں، اسے اپنی وحی کا امین بنایا ہو، اپنے بندوں اور شہروں پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہو، وہ اپنے رب کی یہ آواز بھی سن رہا ہو کہ "ایسا کام نہ کرو" لیکن وہ اپنی لذات کو احکام الٰہی پر ترجیح دے، اپنے رب کی نہی کی طرف کان بھی نہ لگائے اور اس کے وعید کرنے پر باز نہ آئے تو عقلی طور پر یہ بات کس قدر قبیح ہو گی؟ اور یہ ایک ایسا قبح ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔

دلیل چہارم: اگر انبیاء معصوم نہ ہوں تو ان کی بعثت کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہو گا۔ لازم باطل ہے لہذا ملزوم بھی باطل ہو گا۔

اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ اگر ہم یہ بات جائز قرار دیں کہ ان سے معصیت سرزد ہو سکتی ہے تو پھر یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ ان کی بات قابل وثوق اور اطمینان نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کیلئے جھوٹ بولنا بھی جائز ہو گا، چونکہ وثوق حاصل نہیں ہو گا اس لئے ان کی اطاعت بھی لازم نہیں ہو گی۔ نہ تو اوامر میں اور نہ ہی نواہی میں، جس سے بعثت کا مقصد فوت ہو جائے گا اور یہ محال ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو اپنے مقامات پر مذکور ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

البتہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاءؑ کا معصوم ہونا ضروری ہے اور عصمت کا بعثت کے بعد ہونا ضروری ہے، جیسا کہ "اشاعرہ" اور بعض "معتزلہ" کا عقیدہ ہے۔ اور اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ وہ بعثت سے پہلے بھی معصوم ہوں جس طرح کہ شیعہ اس کے معتقد ہیں۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ جن دلائل کی بنا پر بعثت کے بعد عصمت ضروری ہے، وہی دلائل بعثت سے پہلے کیلئے بھی ہیں۔ اس لئے کہ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ انسانی طبیعتیں اور بشری قلوب اس شخص سے متنفر ہو جاتی ہیں جس کی زندگی میں مختلف قسم کی معصیتیں اور بڑے بڑے گناہ سرزد ہو چکے ہوں اور دل ایسے لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کیلئے آمادہ نہیں ہوتے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جو عالم شخص اپنے بچپن اور لڑکپن کے ایام میں تحصیل علم سے پہلے گناہوں کی پرواہ نہ کرتا ہو اور افعال و اقوال پر اسے قابو نہ ہو تو پیدا ہو کر چاہے وہ کتنا ہی صاحب علم و کمال ہو جائے دل میں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔

مخالفین شیعہ کے عصمت انبیاء کے خلاف دلائل

مذکورہ بالا تمہید کے بعد آپ یوں سمجھئے کہ قرآن مجید اور اخبار و روایات میں جو ایسی باتیں موجود ہیں جن سے یہ وہم ہوتا ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور ممکن ہے اور دشمن جن کو اپنے موقف کے ثبوت کیلئے دلائل بنا کر پیش کرتا ہے تو ایسی باتوں کو ترک اولیٰ پر ہی محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ ادھر تو یہ باتیں ہیں اور ادھر عصمت انبیاء کی عقلی اور نقلی دلیلیں موجود ہیں، لہذا دونوں طرح کی دلیلوں

کو جمع کر کے یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ انبیاء سے گناہانِ کبیرہ نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ کا ارتکاب ممکن ہے۔اس کیلئے اپنے اپنے موقع ومحل پر دلائل دیئے جا چکے ہیں۔، اس بارے میں آپ کو سید مرتضٰی علم الہدیٰ کی کتاب "تنزیہ الانبیاء" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب کا مطالعہ فرمائیں۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم یہاں پر ان میں سے کچھ درج کرتے۔البتہ موضوع کی مناسبت سے ہم حضرت آدمؑ کے بارے میں مخالفین عصمت کے دلائل کا ذکر کرنے کے بعد ان کے جوابات کو بھی حیطۂ تحریر میں لے آئیں گے۔چنانچہ مخالفین نے حضرت آدمؑ کے بارے میں جن دلائل کا ذکر کیا ہے وہ سات ہیں :

پہلی دلیل : مخالفین عصمت آدم کی پہلی دلیل یہ ہے کہ وہ "عاصی" (گنہگار) تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "وَ عَصیٰ آدَمُ رَبَّہٗ فَغَویٰ" (طٰہٰ / ۱۲۱) آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس وہ گمراہ ہوگئے۔اور "عاصی" گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر سخت تنبیہ کی ہے، ارشاد ہوتا ہے : "وَ مَنْ یُّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ ......" (جن / ۲۳) جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کیلئے جہنم کی آگ ہے ....۔

دوسری دلیل : یہ ہے کہ وہ "غاوی" (گمراہ) تھے، کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ : "وَ عَصیٰ آدَمُ رَبَّہٗ فَغَویٰ" (طٰہٰ / ۱۲۱) آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس وہ گمراہ ہوگئے۔اور گمراہی، رشد (ہدایت) کی ضد ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے : "قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ" (بقرہ / ۲۵۶) گمراہی سے ہدایت، واضح ہو گئی۔

تیسری دلیل : یہ ہے کہ وہ "تائب" (توبہ کرنے والے) تھے، جیسا کہ خدا فرماتا ہے : "ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ" (طٰہٰ / ۱۲۲) اس کے بعد اس کے رب نے اسے برگزیدہ بنادیا اور اس کی توبہ قبول کرلی۔جبکہ توبہ گناہ سے کی جاتی ہے۔

چوتھی دلیل : جس چیز سے انہیں روکا گیا، اسی کا انہوں نے ارتکاب کیا، اور اللہ نے انہیں جھڑک دیا اور فرمایا : "اَلَمْ اَنْھَکُمَا عَنْ تِلْکُمَا الشَّجَرَۃِ" (اعراف / ۲۲) آیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہیں روکا تھا؟۔اسی طرح ایک اور آیت ہے : "وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ" (بقرہ / ۳۵۔اعراف / ۱۹) اس درخت کے قریب مت جانا۔اور نہی عن المنکر کا ارتکاب کرنے والا، گناہگار ہوتا ہے۔

پانچویں دلیل : وہ "ظالم" ہیں، کیونکہ قرآن کہتا ہے : "فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" (اعراف / ۱۹) ورنہ تم دونوں ظالم ہو جاؤ گے۔اسی طرح قرآن ہی میں ان کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" (اعراف / ۲۳) پروردگارا! ہم نے اپنی نفسوں پر ظلم کیا ہے۔واضح ترین بات ہے کہ ظلم، گناہ ہے۔

چھٹی دلیل : حضرت آدمؑ خود اعتراف کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مغفرت ان کے شامل حال نہ ہوئی تو وہ خسارہ اٹھانے والے ہوں گے، جیسا کہ قرآن مجید نے ان کی زبانی یوں ذکر کیا ہے : "وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ" (اعراف / ۲۳) اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ظاہر سی بات ہے کہ "خسران" گناہ کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتا ہے۔

ساتویں دلیل: یہ ہے کہ انہیں شیطان کی اطاعت، شیطانی وسوسوں کی قبولیت اور لغزش کے نتیجہ میں جنت سے نکالا گیا، اور یہی چیز ان کے گناہ کی دلیل ہے۔

ان دلائل کا جواب

پہلی دلیل کہ حضرت آدمؑ "عاصی" تھے۔ کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ عاصی تھے، لیکن یہ بات کہ "ہر عاصی، گناہ کبیرہ کا مرتکب سمجھا جائے گا" یہ تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ معصیت، عبارت ہے امر کی مخالفت سے اور امر واجب بھی ہوتا ہے اور مندوب بھی، جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ "اَشَرْتُ عَلَيْهِ فِيْ اَمْرِ وُلْدِهٖ فِيْ كَذَا فَعَصَانِيْ "یعنی میں نے اسے اس کی اولاد کے بارے میں اس طرح کا اشارہ کیا لیکن اس نے میری نافرمانی کی۔ بلکہ معصیت کا اطلاق تو امر ارشادی کی مخالفت پر بھی کیا جاتا ہے، جیسا کہ عرب کہتے ہیں "اَمَرْتُهٗ بِشُرْبِ الدَّوَآءِ فَعَصَانِيْ "میں نے اسے دوا پینے کا حکم دیا لیکن اس نے میری نافرمانی کی۔ یا جیسا کہ عمرو بن عاص معاویہ سے کہتا ہے؛

اَمَرْتُكَ اَمْرًا جَازِمًا فَعَصَيْتَنِيْ وَ كَانَ مِنَ التَّوْفِيْقِ قَتْلُ ابْنِ هَاشِمٍ

میں نے تمہیں ایک لازمی بات کا حکم دیا لیکن تم نے میری نافرمانی کی.......................................

اسی طرح ابن مہلب امیر خراسان سے ابن منذر کہتا ہے؛

اَمَرْتُكَ اَمْرًا جَازِمًا فَعَصَيْتَنِيْ فَاَصْبَحْتَ مَسْلُوْبَ الْاِمَارَةِ نَادِمًا

میں نے تمہیں ایک حتمی امر کا حکم دیا لیکن تم نے میری نافرمانی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم سے حکومت بھی چھن گئی اور تم نادم و پشیمان بھی ہو گئے ہو۔

اس تمہید کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے فعل پر "عصیان" کے لفظ کا اطلاق تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں "واجب کا تارک" نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہم انہیں زیادہ سے زیادہ "ترک اولیٰ کا مرتکب" قرار دے سکتے ہیں جس کا شمار "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" (نیک لوگوں کی نیکیاں، مقربین کیلئے گناہ کی حیثیت رکھتی ہیں) کے زمرے میں آتا ہے۔

اسی طرح استدلال کے دوران جو یہ بات بتائی گئی ہے کہ "عاصی کیلئے عذاب کی تنبیہ ان الفاظ میں ہے کہ "جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس کیلئے جہنم کی آگ ہے" (جن / ۲۳) تو عرض ہے کہ یقیناً آیت میں "مَنْ" (جو بھی) کے لفظ سے عموم کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، لیکن یہ حکم ان لوگوں کیلئے مخصوص ہے جو واجب اوامر کی خلاف ورزی کرتے ہیں نا کہ مطلق اوامر کی۔ کیونکہ واضح سی بات ہے کہ مندوب کے ترک پر سزا اور عقاب نہیں ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کہ یہاں پر امر، الزامی نہیں ہے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم امر کو الزامی تسلیم کریں تو پھر اس آیت کی رو سے حضرت آدمؑ عذاب کے مستحق قرار پائیں گے جس میں فرماتا ہے: وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ ...... "تو کون شخص ہے جو اس قسم کی جرات و جسارت کر کے یہ کہے کہ "انبیاء عذاب کے حقدار ہوتے ہیں" حالانکہ انبیاء کرام علیہم السلام تو ہدایت کے پرچم اور عروۃ الوثقیٰ ہیں جن کے ذریعہ عالم انسانیت راہنمائی حاصل کر کے ثواب اور بہشت کا

حقدار قرار پاتا ہے۔ لہذا انبیاء کے بارے میں استحقاق عذاب کا اظہار ان پر افتراء اور بہتان عظیم ہے۔

دوسری دلیل کے بارے میں عرض ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "غيّ" (گمراہی) "رشد" (ہدایت) کی ضد ہے۔ اور رشد، یہ ہوتی ہے کہ "کسی چیز کے ذریعہ کسی چیز تک رسائی حاصل کی جائے جو منزل مقصود تک پہنچائے" لہذا جو شخص کسی چیز کے ذریعہ کسی چیز تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو اسے مقصود کی ضد تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس کا شمار بھی "غيّ" (گمراہی) میں ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے؛

فَمَنْ يَّلْقَ خَيْرًا يَحْمَدُ النَّاسُ اَمْرَهٗ وَ مَنْ يَّغْوِ لَمْ يَعْدُمْ عَلَى الْغَيِّ لَائِمًا

جو نیکی تک پہنچ جاتا ہے تو لوگ اس کے امر کی تعریف کرتے ہیں، اور جو نہیں پہنچ پاتا تو اس کے بھٹکنے پر ملامت کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔

لہذا اللہ تعالیٰ کے اس قول "فَغَوٰى" کا معنی ہوگا "فَخَابَ" یعنی "بہشت میں ہمیشہ رہنے اور دائمی ملک کے حصول کی جو تمنا ان کے دل میں تھی درخت سے کھانے کے بعد وہ اپنی اس آرزو میں ناکام ہو گئے"۔

تیسری دلیل کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ توبہ صرف گناہوں سے ہی ہوتی ہے۔ بلکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ توبہ، گزشتہ کوتاہیوں پر ندامت کا نام ہے۔ لہذا ترک مندوب پر بھی ندامت کو توبہ کہا جاتا ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ فصل، میں بیان ہوگی۔

چوتھی دلیل کے بارے میں عرض ہے کہ ہر ممنوعہ کام کے مرتکب کو گناہگار تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ صرف "نہی تحریمی" کے مرتکب کو گناہگار کہتے ہیں، "نہی تنزیہی" کے مرتکب کو نہیں۔ کیونکہ حضرت آدمؑ کو حکم تھا کہ اس درخت سے نہیں کھانا، اور یہ تفضل اور نفل کی صورت میں تھا، جس کا تارک قباحت کے زمرے میں نہیں آتا۔ اور فعل قبیح پر عقاب کی تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا مرتکب عذاب کا مستوجب ہوتا ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاءؑ عذاب سے محفوظ ہیں اور ان کے ساتھ عذاب کا کوئی تعلق نہیں۔ اور جو شخص انبیاءؑ کیلئے عذاب کو جائز سمجھتا ہے وہ خود مجرم اور گناہگار ہے اور خدا پر عظیم افترا باندھنے کا مرتکب ہوا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آدمؑ کو جنت سے نکالنا اور انہیں زمین پر اتارنا سزا کے طور پر نہیں تھا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو بہشت کیلئے خلق نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ اس لئے خلق ہوئے تھے تاکہ زمین میں خدا کے خلیفہ قرار پائیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں کو باخبر کر دیا تھا کہ: "اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" (بقرہ/۳۰) میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں۔ اور بہشت میں ان کا ٹھہرانا تو خدا کا ایک فضل و کرم تھا۔

پانچویں دلیل کا جواب یہ ہے کہ "ظالم" کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو "اپنے کو ثواب میں خسارہ اور نقصان پہنچائے" تو اس معنی کے لحاظ سے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یقیناً انہوں نے افضل کے حصول پر قدرت رکھتے ہوئے بھی اسے ترک کر دیا تو اس لحاظ

ے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور ظلم بمعنی مندوب و مستحب کر ترک کر کے ثواب میں کمی اور خسارے کا باعث بنے۔

چھٹی دلیل کا جواب یہ ہے کہ "خسران" کے معنی ہیں "منافع سے محرومی" اور واضح سی بات ہے کہ اگر آنجناب درخت کا پھل کھانے کیلئے قدم نہ اٹھاتے تو انہیں اللہ کی طرف سے وہ ثواب ملتا جس کا خدا نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر کھانا پینا اور سعادت و خوش بختی کی زندگی۔ لیکن ایسا اقدام کرنے سے انہیں خسارہ ہوا اور ملنے والے منافع سے محروم ہو گئے، نا کہ یہ خسارہ انہیں گناہ کی وجہ سے ہوا۔

ساتویں دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی غرض تخلیق ہی یہ تھی کہ وہ زمین میں خلیفہ اللہ بنیں اور انہیں زمین پر اتارنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ گنہگار تھے۔ ہاں البتہ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ترک اولیٰ کا ارتکاب زمین پر جلد اترنے کا سبب ضرور بنا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ شاید درخت کا پھل کھانے سے بقا کی مصلحت میں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔

آیا آدمؑ نے پھل عمداً کھایا تھایا سہواً؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے جو پھل کھایا تھا آیا انہوں نے یہ اقدام سہواً اور بھول کر کیا تھا یا عمداً اور جان بوجھ کر؟ تو اس بارے میں دو طرح کے مکتب فکر ہیں ایک وہ جو پہلے نکتہ نظر کا حامل ہے اور ایک وہ جو دوسرا نظریہ رکھتا ہے، اخبار و احادیث سے بھی جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ بھی پہلے مکتب فکر کی تائید کرتی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت امیرؑ کے اس قول "وَ الْعَزِيمَةَ بِوَهْنِهِ" کی شرح میں علی بن ابراہیم کی روایت میں حضرت امام محمد باقرؑ کا فرمان گزر چکا ہے۔

اعتراض: اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر آپ نے یہ اقدام بھول کر کیا تھا تو پھر آپؑ کے ایسا کرنے پر عتاب نہیں کرنا چاہئے تھا، نسیان کے ہوتے ہوئے انسان ترک پر قدرت نہیں رکھتا۔ اور غافل کو فرائض کی ادائیگی کا پابند بنانا عقلاً قبیح ہے۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ عتاب شاید اس بنا پر کیا گیا ہے کہ انہوں نے جس بات کو یاد رکھنا تھا اسے چھوڑ دیا کیونکہ جو نسیان یاد رکھنے کے ترک کر دینے کی وجہ سے صادر ہوتا ہے وہ قابل مؤاخذہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شب معراج کی یہ دعا صحیح ہے جس میں آپؐ پروردگار عالم سے بخشش کی دعا فرماتے ہوئے کہتے ہیں: "رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا ......" (بقرہ/۲۸۶) پروردگارا! اگر ہم بھول جائیں تو تو ہمارا مؤاخذہ نہ فرما! ....

یہی وہ مؤاخذہ ہے جو خدا نے اپنے خاص لطف و کرم کے تحت امت محمدیہؐ سے اٹھا لیا ہے اور دوسری امتوں میں سے صرف اس امت کو اس سے مخصوص کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اسی بات پر آنحضرتؐ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو شیخ صدوقؒ نے الخصال اور التوحید میں ذکر کیا ہے، اور وہ حدیث یہ ہے: "میری امت کے افراد سے نو چیزیں اٹھالی گئی ہیں: ۱۔ خطا ۲۔ نسیان ۳۔ جس پر انہیں مجبور کیا جائے ۴۔ جسے وہ نہ جانتے ہوں ۵۔ جس کی ان میں طاقت نہ ہو ۶۔ جس کیلئے ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ ہو ۷۔ حسد ۸۔ بدشگونی ۹۔ دل میں پیدا ہونے والے وسوسے جب تک کہ زبان سے ادا نہ کئے جائیں"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ نسیان پر مؤاخذہ خدا

کے لطف و کرم سے پیغمبرؐ کی امت مرحومہ سے برطرف کر دیا گیا ہے۔

رہی بات دوسرے مکتب فکر کی یعنی آنجنابؑ کا درخت سے پھل کھانے کا ارتکاب عمدی اور جان بوجھ کر تھا، تو اس سلسلے میں عامہ اور خاصہ (سنی اور شیعہ) مفسرین میں سے کچھ افراد اسی نکتہ نظر کے حامل ہیں، البتہ اس میں سے پھر نکتہ ہائے نظر مختلف ہیں۔

پہلا نکتہ نظر: یہ نہی "نہی تنزیہی" تھی، "تحریمی" نہیں تھی۔ ابھی آپ جان چکے ہیں کہ یہ امامیہ کا مسلک ہے۔

دوسرا نکتہ نظر: یہ آدمؑ کا عمدی اقدام تھا جس کی وجہ سے وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے کیونکہ اس وقت وہ نبی تھے۔ اور یہ قول خوارج کی ایک ملعون شاخ "فضلیہ" کا ہے۔

تیسرا نکتہ نظر: جسے امام رازی نے اکثر معتزلہ کی طرف منسوب کیا ہے کہ آپ نے یہ اقدام اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے کیا تھا۔ اور ایسا اقدام گناہ کبیرہ کا موجب نہیں بنتا۔

اس اجتہاد کی تفصیل یہ ہے کہ آپؑ سے کہا گیا تھا "وَ لاَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" یعنی اس درخت کے قریب نہ جانا۔ چنانچہ "ہذہ" کے لفظ سے کبھی تو ایک خاص چیز مراد لی جاتی ہے اور کبھی اس چیز کی نوع کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ جب آدمؑ نے "وَلاَتَقْرَبَاهٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کا کلمہ سنا تو انہوں نے سمجھا کہ اس سے مراد ایک خاص معین درخت ہے لہذا اس سے تو نہیں کھایا لیکن اس قسم کے دوسرے درخت سے کھا لیا۔ لہذا یہ آپ کی "اجتہادی غلطی" ہوئی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" سے مراد نوع درخت تھی لیکن حضرت آدمؑ نے ایک ذات مراد لی جو "اجتہادی غلطی" کہلائی۔ اور فروع میں اجتہادی غلطی سزا اور عتاب کا موجب نہیں بنتی، کیونکہ ہو سکتا ہو کہ یہ ایک چھوٹا سا گناہ ہو جو قابل بخشش ہے۔

مامون کے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوالات

اس سے ملتی جلتی ہماری ایک روایت بھی ہے جسے شیخ صدوقؒ نے عیون اخبار الرضا میں اور شیخ طبرسیؒ نے احتجاج میں علی بن محمد بن جہم سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میں مامون کے پاس اس وقت پہنچا جب ان کے ساتھ حضرت امام رضا علیہ السلام بھی تشریف فرما تھے۔ مامون نے امامؑ سے دریافت کیا کہ:

___: فرزند رسولؐ! آیا آپ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ تمام انبیاء معصوم ہوتے ہیں؟

___: کیوں نہیں؟

___: تو پھر خداوند عزوجل کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟ "وَ عَصىٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوىٰ" (طٰہٰ / ۱۲۱)

___: خداوند عالم نے حضرت آدمؑ سے فرمایا: "اُسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلاَ مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" (اعراف / ۱۹) تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں جا ٹھہرو! اور جہاں سے چاہو مزے سے کھاؤ پیو۔ لیکن اس درخت کے قریب مت جانا۔ "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کہہ کر اللہ نے درخت گندم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور آخر میں فرمایا ہے کہ: "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (ایضاً) اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "اس درخت اور اس کی جنس

نہیں کھانا" چنانچہ اس کے نزدیک تک بھی نہیں گئے اور جب شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ "خدا نے تو تمہیں اس درخت سے ہی روکا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے کسی بھی درخت سے نہ تو قریب جانے سے روکا ہے اور نہ ہی اس سے کھانے سے منع فرمایا "اِلاَّ اَنْ تَکُوْنَا مَلَکَیْنِ اَوْتَکُوْنَامِنَ الْخٰلِدِیْنَ وَقَاسَمَھُمَا اِنِّیْ لَکُمَا مِنَ النّٰاصِحِیْنَ" (اعراف / ۲۰۔۲۱) مگر یہ کہ (اگر اس سے کھالوگے تو) فرشتے بن جاؤ گے یا ہمیشہ کیلئے (بہشت میں) رہو گے اور ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، "فَدَلّٰھُمَا بِغُرُوْرٍ فَاَکَلاَ مِنْھَا" حضرت آدمؑ اور جناب حوا نے آج سے پہلے کسی کو جھوٹی قسم کھاتے نہیں دیکھا تھا پس اس نے انہیں فریب دے کر اپنے مرتبے سے نیچے گرا دیا اور پھر انہوں نے اس سے کھالیا۔

انہوں نے اس کی خدا کے نام کی قسموں پر اعتبار کرتے ہوئے ایسا کیا، البتہ یہ آدمؑ کو نبوت ملنے سے پہلے کی بات ہے اور یہ کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جس پر وہ عذاب کے مستحق قرار پاتے یا جہنم کے مستوجب ہوتے۔ بلکہ اس کا تعلق صغیرہ گناہوں سے تھا جو قابل بخشش تھے اور انبیاءؑ پر وحی کے نزول سے پہلے ان کیلئے جائز ہوتے ہیں۔ لیکن جب اللہ نے انہیں برگزیدہ فرمایا اور انہیں نبی مقرر فرمایا تو وہ معصوم ہو گئے اور صغیرہ، کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے پاک ہو گئے۔ اسی لئے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: "وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ" (طٰہٰ / ۱۲۱۔ ۱۲۲) اور آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تو اس کے انعامات سے محروم ہو گئے، اس کے بعد ان کے پروردگار نے انہیں برگزیدہ کیا اور توبہ قبول کی اور انہیں ہدایت کی۔ نیز ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" (آل عمران / ۳۳) یقیناً اللہ نے آدم، نوح آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں میں برگزیدہ فرمالیا"۔ (تمام شد قول امامؑ)

حدیث امامؑ پر تبصرہ

اگر آپ اس حدیث کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ معتزلہ کے اس موقف کے مطابق ہے جس کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں، اور امامیہ کے اصولوں کے مخالف ہے کیونکہ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نزول وحی سے پہلے انبیاءؑ سے گناہان صغیرہ کا ارتکاب جائز ہوتا ہے۔ اور ہمارے لئے یہ حدیث اس لئے ناقابل قبول ہے کہ:

الف: اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ یہ کتاب احتجاج طبرسیؒ میں بطور مرسل بیان ہوئی ہے یا پھر اس کی اسناد کا سلسلہ تمیم بن عبداللہ بن تمیم قرشی پر جا ختم ہوتا ہے جیسا کہ عیون الاخبار میں ہے۔ اس کا سلسلہ سند اس طرح ہے: "ہمیں تمیم بن عبداللہ بن تمیم قرشی نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا مجھ سے میرے والد نے انہوں نے حمدان بن سلیمان نیشاپوری سے انہوں نے علی بن محمد بن جہم سے روایت کی ہے"۔ علامہؒ نے اپنی کتاب "الخلاصہ" میں اسے ان الفاظ کے ساتھ ضعیف قرار دیا ہے کہ: "تمیم بن عبداللہ بن تمیم قرشی کہ جن سے ابو جعفر محمد بن بابویہ نے روایت کی ہے، ضعیف ہے"۔

ب: اسے تقیہ پر حمل کیا جائے گا، اگرچہ کہ ایسا کرنا بعید ہے۔

ج: اس کی اصول مذہب کے مطابق تاویل کی جائے گی۔ جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے اس کی تاویل کی ہے اور میں نے احتجاج

طبرسیؒ کے ایک نسخہ کے حاشیہ پر تحریر ملاحظہ کی جس میں لکھا تھا کہ: ”شاید حضرت امام رضاؑ کی ”بخش دیئے جانے والے گناہانِ صغیرہ“ سے مراد ”فعل مندوب کا ترک کرنا“ ہے اور ”فعل مکروہ کا ارتکاب“ ہے نا کہ فعل قبیح کا“۔

....

....

اسی طرح کی ایک اور روایت بھی اشکال سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ جسے عیون الاخبار میں اسناد کے ساتھ ابوالصلت ہروی سے بیان کیا گیا ہے کہ جب مامون نے حضرت امام رضاؑ کے ساتھ مناظرہ کیلئے مسلمان اور غیر مسلم علماء و مقررین کو بلایا گیا تو جس نے بھی آپؑ پر کوئی اعتراض کیا تو آپؑ نے فوراً ہی اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ نے اس کے منہ میں پتھر ٹھونس دیئے ہوں۔ اتنے میں علی بن محمد بن جہم اٹھا اور کہنے لگا: ”فرزند رسولؐ! آپؑ عصمت انبیاء کے قائل ہیں؟“

____: جی بالکل!

____: اس بارے میں آپؑ کیا فرماتے ہیں کہ خدا نے فرمایا: ”وَ عَصیٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَویٰ“............۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ امامؑ نے فرمایا:

____: اے علی! تم پر پھٹکار ہو، اللہ سے ڈرو اور انبیاء کی طرف برائیوں اور بری باتوں کی نسبت نہ دو اور نہ ہی کتاب خدا کی تاویل اپنی رائے کے مطابق کیا کرو کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ: ”وَلاَ یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلاَّ اللّٰهُ وَ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ (آل عمران / ۷) اس کی تاویل کو خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ آدمؑ کے بارے میں فرماتا ہے: ”وَ عَصیٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَویٰ“ تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی زمین کیلئے حجت اور اپنے شہروں کیلئے اپنا خلیفہ بنایا تھا، انہیں بہشت میں رہنے کیلئے خلق نہیں فرمایا تھا۔ اگر آدمؑ نے نافرمانی کی تھی تو وہ جنت میں تھی زمین پر نہیں تھی۔ اور ان کی عصمت تو زمین پر ضروری تھی تاکہ خدائی تقدیروں کو مکمل کیا جاسکے، اور جب وہ زمین پر تشریف لے آئے تو اللہ نے انہیں اپنی حجت بنایا اور خلیفہ مقرر فرمایا اور انہیں عصمت کی یہ سند عطا فرمائی کہ ”اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفیٰ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّآلَ اِبْرَاهِیْمَ وَ آلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ“ (آل عمران / ۳۳) یقیناً اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں میں برگزیدہ فرمالیا“۔

قول شارحؒ: ہو سکتا ہے کہ مذکورہ دونوں روایات کی کوئی اور تاویل بھی ہو جسے کوئی صاحب علم جانتے ہوں۔ اس لئے کہ ”فَوْقَ کُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ“ (یوسف / ۷۶) ہر عالم کے اوپر ایک اور عالم ہے۔

حرف آخر

البتہ اس اشکال کو اس طرح رفع کیا جاسکتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو جس درخت سے روکا گیا تھا وہ درخت کی نوع تھی اور اس کلمہ کے ساتھ کبھی تو مقررہ چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور کبھی اس کی نوع کی طرف اور اللہ تعالیٰ کا آدمؑ سے یہ فرمانا کہ ”وَلاَ تَقْرَبَا

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ "(بقرہ / ۳۵۔ اعراف / ۱۹) جبکہ کوئی قرینہ موجود نہیں تھا" خطاب مجمل" کی قسم سے ہے نہ یہ کہ "خطاب" مجمل تھا بلکہ خطاب کا جس سے تعلق ہوتا ہے یعنی مکلّف کو فرد اور کلی کے درمیان تردد پیدا ہو گیا تھا جبکہ نص خطاب یعنی اجتناب کو اپنانے کی تکلیف معلوم تھی، لہٰذا اس وقت حضرت آدمؑ کا فرض بنتا تھا کہ احتیاط کے طور پر نوع درخت کے تمام افراد سے اجتناب کرتے، لیکن اس موقع پر ابلیس نے اپنی تدلیس کے ذریعہ انہیں احتیاط کے خلاف اقدام پر آمادہ کر لیا جبکہ احتیاط کا تقاضا اجتناب تھا۔

ابلیس نے آدمؑ سے کہا "جب اللہ نے نوع کے ارادے پر کسی قسم کا قرینہ نصب نہیں فرمایا تو سوائے ایک خاص فرد کے باقی تمام نوع کو مباح قرار دے دیا ہے جس کے نتیجہ میں انہوں نے ایک درخت کے ثمر کو کھا لیا اور توبیخ کے مستحق قرار پائے۔ اور یہ بات "اغراء بالجہل" کے زمرہ میں نہیں آتی، کیونکہ اصل تکلیف تو تفصیلی علم کے ساتھ معلوم تھی اور اس میں کسی قسم کی جہالت نہیں تھی اور نہ ہی بیان کی ضرورت تھی زیادہ سے زیادہ یہی تھا کہ مکلّف کو دو امروں کے درمیان تردد تھا اور عقل کو اس بارے میں فیصلہ یہ کرنا چاہئے تھا کہ احتیاط کو اختیار کیا جائے اور احتمالات کو ترک کر دیا جائے۔

یہ حقیر کی نظر قاصر تھی جو عرض کر دی اور امور و احکام کی حقیقت کا علم اللہ اور اس کے اولیائے کرام علیہم السلام ہی کو حاصل ہے۔

تیرھویں فصل

حضرت آدمؑ کی توبہ اور اس کی قبولیت

ثُمَّ بَسَطَ اللّٰهُ لَهُ فِيْ تَوْبَتِهِ وَ لَقَّيَهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ وَ وَعَدَ الْمَرَدَّ اِلٰى جَنَّتِهِ .

پھر اللہ نے آدمؑ کیلئے توبہ کی گنجائش رکھی، انہیں اپنی رحمت کے کلمے سکھائے اور جنت میں دوبارہ پہنچانے کا ان سے وعدہ کیا۔

تشریح

"توبہ" کے معنی ہیں لوٹنا، اور اس کا اصل معنی ہے جو کچھ کہ انجام دے چکا ہے اس سے رجوع کرنا اور اپنی کوتاہیوں پر اظہار ندامت کرنا، "لِقَاءٌ" کے معنی ہیں "اَلْقَاءٌ" یعنی اس کا آمنا سامنا ہوا۔ جبکہ علامہ طبرسی مرحوم "فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "تَلَقّٰى" ہم معنی ہے "تَلَقَّنُ" کے جس کا مطلب ہے کوئی چیز کسی سے لینا اور قبول کرنا۔ اس کی اصل "لَقِيْتُ خَيْرًا" سے ہے، ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ لیکن اگر تفعیل کے وزن پر آجائے تو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا۔ جیسے "لَقِيْتُ زَيْدًا خَيْرًا" میں نے زید کو خیر دلائی۔ یا جیسے خداوند عالم کا قول ہے: "وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا" (دہر / ۱۱) اور ان کا اس حال میں استقبال کرے گا کہ وہ شادمان اور مسرور ہوں گے۔ حضرت امیرؑ کا قول بھی اسی طرح ہے کہ "وَلَقَّيَهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ" اور انہیں اپنی رحمت کے کلمے سکھائے۔

فخر الدین رازی قفال سے روایت کرتے ہیں کہ "تَلَقّٰى" کا اصل ہے آنے والے کے سامنے جانا۔ اور "تَلَقَّى الرُّكْبَانِ" بھی اسی سے ہے جو روایات اور فقہی کتب میں بیان ہوا ہے۔ پہلے تو اسے آنے والے کے استقبال کیلئے وضع کیا گیا پھر کسی چیز کے قبول

اور حصول کیلئے وضع کیا گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ" (نمل / ۶) اور یقیناً تمہاری طرف حکیم اور علیم کی طرف سے قرآن بھیجا جاتا ہے اور تم قبول کرتے ہو۔ اسی طرح "تلقَّينا الحاجَّ" کے معنی ہیں "ہم نے حاجی کا استقبال کیا"۔ اور "تَلَقَّيتُ هذهِ الْكَلِمَةَ مِنْ فُلَانٍ" یعنی میں نے یہ کلمہ فلاں سے اخذ کیا۔ اس لفظ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے وصف میں فاعل اور مفعول دونوں یکساں شریک ہوتے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے "كُلَّ مَا تَلَقَّيْتَهُ فَقَدْ تَلَقَّاكَ" یعنی جس چیز کا تو نے سامنا کیا ہے اسی نے تیرا سامنا کیا ہے۔ لہذا "تَلَقّٰى آدَمُ كَلِمَاتٍ" میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آدمؑ نے وہ کلمات اخذ کئے، انہیں یاد کر لیا اور قبولیت کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اسی طرح "كَلِمَاتٌ" پر رفع پڑھنا بھی صحیح ہوگا جبکہ "تلقّٰی" کے معنی "جائَتْ" کے ہوں اور لفظ "کلمات" اس کا فاعل بن رہا ہو۔

"مَرَدّ" کے معنی رد کرنے اور لوٹنے کے ہیں، یہ "رَدَّه" کا مصدر ہے جب "صَرَفَه" کے معنی میں ہو حضرتؑ کے کلام میں "بَسَطَ اللّٰهُ" میں محذوف ہے جس کی تقدیر یوں ہے : "بَسَطَ اللّٰهُ بِسَاطَ رَحْمَتِه وَكَرَامَتِه فِي تَوْبَتِه بِاَنْ جَعَلَهَا مُقْتَرِنَةً بِالْقَبُوْلِ"۔ جبکہ بعض نسخوں میں "لَهٗ" کا لفظ نہیں ہے تو پھر ایسی صورت میں "بَسَطَ" کو "سَرَّ" کے معنی میں لیا جائے گا جس کے معنی ہیں "مسرور کیا" تو ایسی صورت میں اس کا مفعول "ضمیر محذوف ہوگی" جو آدمؑ کی طرف لوٹ رہی ہوگی۔ غرض آدم برسر مطلب۔

(پھر) جب حضرت آدمؑ نے دشمن کے فریب میں آکر درخت سے کھالیا، ترک اولیٰ کا ارتکاب کر چکے اور عزت و تکریم کو ندامت اور پشیمانی میں بدل چکے (تو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کیلئے) اپنی رحمت و کرامت کی (چادر بچھادی توبہ کیلئے) یعنی ان کی طرف اسی بات کا الہام کیا اور ان کی توبہ کو اچھے طریقہ سے قبول کر لیا۔ (اور انہیں اپنی رحمت کے کلمے سکھائے) جن کی طرف اللہ کے اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے "فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّه كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" (بقرہ / ۳۷) پس آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے، پس اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی، یقیناً وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ (اور اپنی جنت میں انہیں دوبارہ پہنچانے کا ان سے وعدہ کیا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے : "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" (بقرہ / ۳۸) پس جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی تو اس وقت جو لوگ اس کی پیروی کریں گے ان کیلئے نہ تو خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ اسی طرح سورہ طٰہٰ میں ارشاد فرماتا ہے : "فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى" (طٰہٰ / ۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

چند ضروری باتیں

۱۔ آدمؑ کی توبہ ہبوط سے پہلے تھی یا بعد میں؟

حضرت امیر المؤمنینؑ کے ظاہر کلام سے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ کی توبہ کا واقعہ ان کے جنت سے زمین پر نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ آپؑ نے "اہباط" کو "بسط توبہ" پر معطوف کیا ہے اور سورہ طٰہٰ کی آیت میں مذکور ترتیب کے عین

تقاضوں کے مطابق ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے :"وعصیٰ آدمُ ربَّهُ فغوى ثُمَّ اجتبيهُ رَبُّهُ فتاب عليه و هدى قال اهبطا منها جميعًا "(طٰہٰ /۱۲۱۔۱۲۲۔۱۲۳)

ان آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ کو توبہ کے بعد ہبوط (زمین پر جانے) کا حکم ہوا۔ جبکہ شارح معتزلی ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ یہ بھی مفسرین کا ایک قول ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ شہرت اس قول کو حاصل ہے کہ "توبہ" ہبوط کے بعد ہوئی ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے :"فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ و قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "(بقرہ /۳۶ تا ۳۷) پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس بہشت میں وہ رہتے تھے انھیں وہاں سے نکال دیا اور اس وقت ہم نے ان سے کہا :سب کے سب زمین پر اتر جاؤ، اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہوں گے۔ زمین تمہارے لئے ایک مدت معین کیلئے قرار گاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔ پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار کی طرف سے کچھ کلمات حاصل کئے اور توبہ کی اور خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

قول شارحؒ : میرے نزدیک بھی زیادہ قوی امکان یہی ہے کہ سورہ بقرہ کی ان آیات کی روشنی کے پیش نظر توبہ، ہبوط کے بعد عمل میں آئی ہے۔ تو اس لحاظ سے امیر المؤمنینؑ کا کلام "تقدیم و تاخیر" کی قسم سے ہوگا۔ اور اس کی ترتیب یوں ہوگی "...... فاستبدلَ بالجذلِ وجلاً وَ بالاعتزازِ ندمًا وَ اَهبطهُ اللّٰهُ اِلٰى دَارِ الْبَلِيَّةِ وَ تَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ ۔ثُمَّ بَسَطَ فِيْ تَوْبَتِهٖ وَ لَقّٰهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهٖ ......"پس آدمؑ نے مسرت کو خوف سے بدل دیا اور عزت و احترام کو ندامت و پریشانی سے، پس انھیں دار ابتلاء و محل افزائش نسل میں اتار دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کیلئے توبہ کی گنجائش رکھی اور انھیں رحمت کے کلمات سکھائے......۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو آیتوں میں نظم و ترتیب مختلف بیان ہوئے ہیں تو پھر سورہ بقرہ میں بیان کردہ ترتیب کو اختیار کرنے کی کیا دلیل ہے ؟ اور سورہ طٰہٰ میں مذکور ترتیب (توبہ قبل از ہبوط) کو کیوں اختیار نہیں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ صورت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمؑ کی طرف "عصیان" اور "غيّ" کی نسبت دے دی گئی جو بظاہر گناہ کے صدور پر دلالت کرتی ہے اور جس سے عامۃ الناس کی قاصر عقلیں اور ناقص اذہان یہ سمجھنے لگے کہ یہ ایسے گناہ ہیں جو حضرت آدمؑ کی رسوائی اور سقوط کا سبب بنے ہیں، تو اگرچہ وہ اس بات کا زبانی اقرار نہ بھی کریں لیکن ان کے کلام سے یہ بات لازم آتا ہے کہ "آدمؑ، گناہ کے مرتکب ہوئے اور گناہگار نبی نہیں ہو سکتا، لہذا آدمؑ نبی نہیں ہیں !"اس بارے میں گزشتہ فصل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اسی بنا پر حال اور مقام کا تقاضا یہی تھا کہ توبہ بعد از ہبوط کے موقف کو اختیار کیا جائے تاکہ اس سے یہ وہم دور ہو جائے اور متنبہ کیا جائے کہ آدمؑ سے ایسے فعل کا صدور ان کے رتبے کے انحطاط کا سبب نہیں ہوا کہ جس سے آپؑ کی تمام تر توفیقات سلب ہو جائیں اور خدا کے الطاف خفیہ سے کلی طور پر محروم ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فاصلے کے بغیر ایسی باتیں کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو مجتبیٰ اور مرتضیٰ بنایا ہے اور مذکورہ افعال کا صدور انھیں عنایات ربانیہ کی قابلیت اور استعداد سے ساقط نہیں کر سکا۔ جیسا کہ "اجتباء" کو

"توبہ" پر مقدم فرمایا ہے۔ رہی بات سورہ بقرہ کی تو اس میں وہی ترتیب موجود ہے جو صورت حال انہیں در پیش آئی تھی گویا اصل، واقعہ کے مطابق ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی طرف شارح موصوف کے علاوہ نہ تو کسی مفسر نے توجہ کی ہے اور نہ ہی کسی عالم نے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

توبہ پر ہبوط کے مقدم ہونے کے ثبوت میں بہت سی اخبار و روایات موجود ہیں، جن میں سے ؛

۱۔ علی بن ابراہیم قمی اپنی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ فرماتے ہیں: "صفا کو اس لئے "صفا" کہتے ہیں کہ اس پر سب سے پہلے حضرت آدمؑ صفی اللہ اتارے گئے اور حضرت حوا کو مروہ پر اتاری گئیں۔ مروہ کو اس لئے "مروہ" کہتے ہیں کیونکہ اس پر "مراۃ" (عورت) اتاری گئی۔ حضرت آدمؑ وہاں پر چالیس دن تک جنت کے فراق میں سجدہ میں گریہ کرتے رہے، پھر آپ کے پاس جبرائیل نازل ہوئے اور کہا: "آدم! آیا اللہ نے تمہیں اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا؟ اس نے تمہارے اندر اپنی روح نہیں پھونکی؟ اپنے ملائکہ سے تمہیں سجدہ نہیں کرایا؟" انہوں نے جواب دیا: "کیوں نہیں!"، "پھر جب اس نے تمہیں درخت کے کھانے سے منع فرمایا تو تم نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی؟" آدمؑ نے جواب دیا: "ابلیس نے خدا کی قسم کھا کر مجھ سے کہا: وہ میرے حق میں خیر خواہی کر رہا ہے اور مجھے گمان نہیں تھا کہ کوئی مخلوق، خدا کی جھوٹی قسم بھی کھا سکتی ہے!" جبرائیل نے کہا: "تو پھر آپ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے!"۔

۲۔ اسی کتاب میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ: "حضرت آدمؑ کوہ صفا پر چالیس دن تک سجدے میں پڑے جنت کے غم اور جوار الٰہی سے جدائی پر گریہ کرتے رہے۔ پھر جبرائیلؑ نازل ہوئے اور کہا: "آدمؑ! کس لئے روتے ہو؟" کہا: "جبرائیل! کیوں نہ روؤں جبکہ اللہ نے مجھے اپنے جوار سے جدا کر کے دنیا میں بھیج دیا ہے" جبرائیلؑ نے کہا: "آدمؑ! آپ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں!"

مکمل حدیث اسی خطبہ کے آخر میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

۳۔ بحار الانوار میں اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ مفضل کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے "اجساد" کے خلق کرنے سے دو ہزار سال پہلے "ارواح" کو خلق فرمایا۔ ان تمام ارواح میں محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کے بعد تمام ائمہ علیہم السلام کی ارواح کو افضل اور اشرف مرتبے سے نوازا، پھر یہ ان کے انوار کو تمام زمین آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو ان کے نور سب پر غالب آگئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے فرمایا: "یہی لوگ میرے احباء و اولیاء ہیں، میری مخلوق پر حجت ہیں، میری خلق کے امام ہیں۔ میں نے ان سے بڑھ کر کوئی اور محبوب ترین مخلوق پیدا نہیں کی، میں نے اپنی جنت انہی کیلئے اور انہی کے ماننے والوں کیلئے پیدا کی ہے جبکہ جہنم ان کے دشمنوں اور مخالفوں کیلئے پیدا کی ہے۔ جو قدر و منزلت انہیں میرے نزدیک حاصل ہے اور جو عظمت میں نے انہیں عطا کی ہے جو شخص اس بارے میں برابری کا دعویٰ کرے گا، میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دوں گا، اور اسے مشرکین کے ساتھ اپنی جہنم کے آخری طبقے میں ڈالوں گا۔ جو شخص ان کی ولایت کا اقرار کرے گا، ان کی منزلت کا دعویٰ نہیں کرے گا میں اسے (اپنے ساتھ) یا ان کے ساتھ ٹھکانہ دوں گا۔ وہ میری بہشت کے باغات میں

ہو گا، اور ان کیلئے جو کچھ بھی وہ چاہیں گے میرے پاس موجود ہو گا۔ میں انہیں اپنی کرامت سے نوازوں گا، اپنے جوار میں جگہ دوں گا، اپنے گناہگار بندوں کے بارے میں ان کی شفاعت منظور کروں گا اور ان کی ولایت میری مخلوق کے پاس امانت ہے۔ تو تم میں سے کون ہے جو اس کا بوجھ اٹھائے اور اپنی ذات کیلئے اس کا دعویٰ کرے؟ تو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور ان کے مقام و منزلت تک پہنچنے کے دعوے سے ڈر گئے۔

چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی زوجہ کو جنت میں ٹھہرا دیا تو ان سے کہا: "كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" (اعراف / ۱۹) تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں جا ٹھہرو! اور جہاں سے چاہو مزے سے کھاؤ پیو۔ لیکن اس درخت کے قریب مت جانا ــ یہ درخت گندم کا تھا ــ ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔ جب وہ وہاں پہنچ گئے تو انہوں نے وہاں پر محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کے بعد ائمہ اطہار علیہم السلام کی قدر و منزلت کو دیکھا تو انہیں تمام اہل بہشت سے بڑھ کر ان کی قدر و منزلت نظر آئی تو عرض کرنے لگے: "خداوندا! اس قدر و منزلت کن لوگوں کی ہے؟" تو اللہ جل شانہ نے فرمایا: "تم اپنا سر میرے پایہ عرش کی طرف بلند کرو!" جب انہوں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ساق عرش پر نور جبار جل جلالہ کے ساتھ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کے بعد ائمہ اطہار علیہم السلام کے نام مکتوب تھے۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے: "ان لوگوں کی تیرے نزدیک قدر و منزلت کس حد تک زیادہ ہے؟ یہ لوگ تجھے کس قدر محبوب ہیں؟ ان کا شرف کس قدر زیادہ ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اگر یہ نہ ہوتے تو تمہیں ہر گز پیدا نہ کرتا! یہی لوگ میرے علم کے خزینہ دار ہیں، میرے رازوں کے امین ہیں۔ خبردار کہ ان کی طرف حسد کی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا! یا میرے نزدیک ان کی قدر و منزلت پر حسد کیا اور اپنے لئے اس کی تمنا کی! ورنہ اس سے میری نہی اور میری نافرمانی کے دائرہ میں آجاؤ گے اور تمہارا شمار ظالموں میں ہونے لگے گا۔ آدمؑ و حوا نے عرض کیا: "پروردگارا! ظالم کون ہوتے ہیں؟" فرمایا: "ان کی سی منزلت کے ناجائز دعویدار!" انہوں نے عرض کیا: "خداوندا! تو ہمیں ان پر ظلم کرنے والوں کے مقامات کا بھی معائنہ کرا تا کہ ہم ان کے ٹھکانے کو بھی دیکھ لیں جس طرح تیرے نزدیک محمدؐ و آل محمدؐ کی قدر و منزلت کو دیکھ لیا ہے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کو حکم دیا کہ "ان تمام ظالموں کے مختلف عذاب اور سزا کے مقامات اور ٹھکانے انہیں دکھائے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان ظالموں کا ٹھکانہ جہنم کے آخری طبقے میں ہے۔ "كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا" (حج / ۲۲) جب وہ دوزخ کی عقوبتوں سے نکلنا چاہیں گے تو انہیں اس میں پھر لوٹا دیا جائے گا۔ "كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ" (نساء / ۵۶) جب ان کی جلد جل جائے گی تو ہم انہیں دوسری جلد دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ "اے آدمؑ و حوا! میرے ان انوار (یا میرے ان ابرار) اور میری ان حجتوں کی طرف حسد کی آنکھ سے نہ دیکھنا! ورنہ میں تمہیں اپنے جوار سے جدا کر دوں گا اور تمہیں بلندی سے پستی کی طرف بھیج دوں گا!!" لیکن کیا کیا جائے: "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ" (اعراف / ۲۰) اس کے بعد شیطان نے انہیں پھسلایا تاکہ وہ چیز جو ان کے اندام میں پوشیدہ ہے ظاہر ہو جائے، شیطان نے کہا: تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا لیکن صرف اس لئے کہ (اگر اس سے کھا لو گے تو) فرشتے بن

جاؤ گے یا ہمیشہ کیلئے (بہشت میں) رہو گے۔ ساتھ ہی یہ قسم بھی کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، اس طرح اس نے انہیں دھوکہ دے کر ان کے مقام و مرتبے سے نیچے گرا دیا (اعراف / ۲۲) اور انہیں محمدؐ و آل محمدؐ کے مقام و منزلت کی تمنا کرنے پر آمادہ کیا تو دونوں نے ان کی طرف حسد کی نگاہوں سے تاکا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس مقصد میں ناکام ہو گئے اور درخت گندم کا پھل کھالیا، اور جب انہوں نے یہ کھایا تو ان کے تمام لباس اور بہشتی زیور اتار لئے گئے اور وہ ننگے تڑنگے باقی رہ گئے۔ "وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَ نَادٰيهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَا اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ" (اعراف / ۲۳) یعنی انہوں نے درخت کے پتوں کو اپنے ظاہر ہو جانے والے اندام پر رکھنا شروع کر دیا تا کہ انہیں چھپائیں ان کے پروردگار نے انہیں ندا دی کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ تو ان دونوں حضرات (آدمؑ وحوا) نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس پر اللہ نے انہیں فرمایا: میرے جوار سے دور ہو کر نیچے چلے جاؤ کیونکہ بہشت میں میرے پڑوس میں وہ لوگ نہیں رہ سکتے جو میرا کہنا نہ مانیں۔ چنانچہ وہ دونوں زمین پر اتار دیئے گئے اور انہیں ان کے اپنے سپرد کر دیا گیا، اور وہ تلاش معاش میں سرگردان پھرتے رہے۔

جب اللہ نے ان کی توبہ قبول کرنا چاہی تو جبرائیلؑ نے ان کے پاس جا کر کہا: "تم نے ان لوگوں کے مقام و منزلت کی تمنا کی ہے جنہیں تم پر فضیلت دی گئی ہے اس طرح سے تم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے تو اس کی سزا دی ہے جو تم زمین پر اتر کر بھگت رہے ہو لہذا اب تم اپنے رب سے ان لوگوں کے ناموں کا واسطہ دے کر سوال کرو جنہیں تم نے پایہ عرش پر دیکھا ہے تا کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرے"۔ یہ سن کر انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا: "اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ الْاَكْرَمِيْنَ عَلَيْكَ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَالْاَئِمَّةِ (عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) اِلَّا تُبْتَ عَلَيْنَا وَ رَحِمْتَنَا" خدایا! ہم تجھ سے تیرے کریم اور شریف بندوں یعنی محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ائمہ (علیہم السلام) کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ تو ہماری توبہ قبول فرما اور ہم پر رحم فرما!!

اس پر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور وہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

چنانچہ انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے اس امانت کی حفاظت کرتے رہے اور اس کے بارے میں اپنے اوصیاء اور اپنی امت کے مخلص لوگوں کو بتاتے رہے اور اس بوجھ کے اٹھانے سے انکار کرتے اور اس کا دعویٰ کرنے سے گھبراتے رہے لیکن اسے "ایک" انسان نے اٹھالیا جسے سب جانتے ہیں۔ پس اہل بیتؑ پر قیامت تک ہونے والے ظلم کا بانی وہی ہے اور وہی اس کا اصل ہے۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ .... ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" (احزاب / ۷۲) یعنی ہم نے امانت (ذمہ داری اور ولایت الٰہیہ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھالیا، وہ بہت ہی ظالم اور جاہل تھا۔

اس بارے میں اخبار و روایات بہت ساری ہیں، ان سب کو یہاں پر جمع کرنا طوالت بے جا کا سبب بن جائے گا۔ لہذا ہم صرف اسی حد تک ہی اکتفا کرتے ہیں۔

۲۔ حضرت آدمؑ کتنا عرصہ روتے رہے؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت کے فراق میں کتنا عرصہ روتے رہے؟
جو کچھ سابقہ دو روایتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آپؑ چالیس دن تک اس پر گریہ و بکا کرتے رہے۔ جبکہ حضرت شیخ صدوقؒ نے عیون الاخبار میں امام رضاؑ سے روایت نقل کی ہے کہ آپؑ اپنے آباء و اجداد علیہم السلام سے نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: "ایک شامی نے حضرت امیرؑ سے کئی سوالات دریافت کئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "حضرت آدمؑ جنت کے فراق اور جدائی پر کتنا عرصہ روتے رہے؟ اور آپ کی آنکھوں سے کس قدر آنسو بہے؟" تو امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: "آپ ایک سو سال تک روتے رہے اور آپ کی دائیں آنکھ سے نکلنے والے آنسوؤں کی مقدار دریائے دجلہ کے پانی کے برابر اور بائیں آنکھ سے آنسوؤں کی مقدار دریائے فرات کے پانی کے برابر تھی۔ محدث جزائریؒ (سید نعمت اللہ) اپنی کتاب "انوار نعمانیہ" میں تحریر فرماتے ہیں "پھر جب آدمؑ اور حوا کو آسمانوں سے اتارا گیا تو وہ مشرقی ہند کے ایک پہاڑ پر اترے جس کا نام "باسم" ہے۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق اسے "سراندیپ" کہتے ہیں اور وہ پہلی اقلیم (مملکت) ہے جہاں پر دن اور رات تقریباً برابر ہوتے ہیں۔ حضرت حوا نے بہشت میں ہی اپنے سر کے بالوں کو گوندھا ہوا تھا، جب یہاں پر پہنچیں تو سر کی حالت کو دیکھ کر کہا: "میں ان گندھے ہوئے بالوں کا کیا کروں گی جبکہ میں خدا کے غیض و غضب کا شکار ہو چکی ہوں" اس کے بعد انہوں نے اپنے بالوں کو وہیں پر کھول دیا۔ جبکہ بعض روایات میں ہے کہ ابھی تک آپ نے صرف ایک گچھے ہی کو کھولا ہو گا، تو ہوا نے تمام بلاد ہند میں اس خوشبو کو پھیلا دیا، اسی لئے یہاں پر خوشبو سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد جبرائیلؑ آپ کے پاس آئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر مکہ لے گئے تاکہ آپ کو مناسک حج بتائیں، چنانچہ ان کیلئے زمین کی طنابیں کھینچ گئیں اور جہاں جہاں آپ کے پاؤں زمین پر آتے گئے وہ جگہ آباد ہوتی گئی اور باقی جگہ ویران اور بنجر۔ چنانچہ جبرائیلؑ نے انہیں کوہ صفا پر روک دیا اسی لئے آدمؑ صفی اللہ کی وجہ سے اس کا نام "صفا" پڑ گیا، اور حضرت حوا کو "مروہ" پر ٹھہرایا اس لئے اس کا نام "مروہ" ہو گیا کیونکہ اس پر ایک "مرأۃ" یعنی عورت (حضرت حوا) اتری تھیں اور حضرت آدمؑ وہاں پر جنت کے فراق میں دنیا کے سن و سال کے مطابق تین سو سال تک رویا کئے۔ جبکہ آخرت کے سن و سال کے حساب سے یہ عرصہ عصر سے عشاء تک کی مدت پر مشتمل ہے(۱) اس عرصے میں حضرت آدمؑ اس قدر روئے کہ آپ کے رخسارے نہر کی مانند ہو گئے دائیں آنکھ سے اس قدر آنسو بہے جس قدر دریائے دجلہ کا پانی ہوتا ہے اور بائیں آنکھ سے فرات کے پانی کے برابر۔

حضرت آدمؑ کی بی بی حوا کے ساتھ ۸ ذی الحجہ کو ملاقات ہوئی لیکن ایک دوسرے کی پریشان حالی اور لمبے عرصے کی جدائی کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔ اور حضرت آدمؑ اس دن خوب غور و فکر کرتے رہے۔ لیکن دوسرے دن یعنی نو ذی الحجہ کو انہیں پہچان لیا۔ اسی لئے آٹھ ذی الحجہ کو "یوم ترویہ" کہتے ہیں اور نو ذی الحجہ کو "یوم عرفہ" کہتے ہیں اور پھر اس قدر طویل عرصے تک ان کی توبہ

---

(۱) آخرت کا ایک دن دنیا کے ایام کے ایک ہزار سال کے برابر ہے، اور یہ جو بتایا گیا ہے کہ آخرت کے عرصے کے حساب سے عصر سے عشاء کا درمیانی عرصہ دنیا کے تین سو سال کے مطابق ہے، مذکورہ مدت کو پیش نظر رکھ کر کہا گیا ہے۔ از حواشی من لا یحضرہ الفقیہ۔

قبول نہ ہو سکی تو جبرائیلؑ ان کے پاس آئے اور کہا: "اے آدمؑ! اللہ کو ان ناموں کے ذریعہ سے پکارو جو تم نے ساقہ عرش پر نور کی سطروں کے ساتھ لکھا ہوا دیکھا تھا اور کہو: اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّعَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ وَ بِالْاَئِمَّةِ الطَّاهِرِيْنَ (عليهم السلام) اَنْ تَقْبَلَ تَوْبَتِيْ "خدایا تجھے محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ائمہ طاہرین (علیہم السلام) کے حق کا واسطہ میری توبہ کو قبول فرما"۔ ممکن ہے محدث مذکور (سید نعمت اللہ جزائریؒ) نے حضرت آدمؑ کے گریہ کی مدت کی مقدار شیخ صدوقؒ کی بیان کردہ روایت سے اخذ کی ہو جو انہوں نے کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں ذکر کی ہے۔ اس روایت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے پنجگانہ نمازوں کے وجوب کی علت بیان فرمائی ہے۔ آنحضرتؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "نماز عصر کا وہ وقت ہے جس میں آدمؑ نے درخت کا پھل کھایا تھا اور اللہ نے انہیں بہشت سے نکال دیا تھا اور اولاد آدم کو حکم دیا کہ قیامت تک اس وقت کی نماز ادا کرتے رہیں اور میری امت کیلئے بھی اس وقت کا انتخاب فرمایا ہے، اور یہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین نماز ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمام نمازوں سے زیادہ اس کی پاسداری کروں۔

نماز مغرب کا وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی توبہ قبول فرمائی اور پھل کھانے سے لے کر توبہ کی قبولیت تک کا درمیانی عرصہ دنیاوی حساب کے لحاظ سے تین سو سال کا عرصہ بنتا ہے اور آخرت کا ایک دن دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے اور تین سو سال، کی مدت عصر سے عشاء کی مدت ہے، چنانچہ حضرت آدمؑ نے مغرب کے وقت تین رکعت نماز ادا کی ایک رکعت اپنے لئے، ایک حوا کیلئے اور ایک اپنی توبہ کی قبولیت کیلئے۔" اس کی مکمل تفصیل انشاء اللہ العزیز خطبہ ۱۰۹ کی شرح میں آئے گی

۳۔ حضرت آدمؑ کو کونسے کلمات بتائے گئے؟

روایات کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کونسے کلمات تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنے رب سے حاصل کئے اور امامؑ نے اپنے اس خطبہ میں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ "وَلَقَّيْهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ"؟

چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ کلمات ہیں: "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ" (اعراف / ۲۳)

ایک قول یہ ہے کہ وہ کلمات تسبیحات اربعہ تھے یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ" حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ اللہ نے آدمؑ اور حوا کو حج کا حکم دیا اور وہ کلمات ادا کرنے کا حکم بھی دیا جو حج میں ادا کئے جاتے ہیں، چنانچہ انہوں نے حج ادا کیا، جب حج سے فارغ ہوئے تو اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ: "میں نے تمہاری توبہ قبول کرلی ہے"۔

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ وہ کلمات یہ تھے: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَّ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَّ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ وَ ارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ لَا اِلٰهَ

الاّ اَنتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَّ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ وَ تُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ"۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، بار الہا! تو پاک ہے، تیری حمد کرتے ہیں، میں نے گناہ کیا ہے اور اپنے اوپر ظلم کیا ہے پس تو مجھے بخش دے اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، اے اللہ! تو پاک ہے، تیری حمد کرتے ہیں، میں نے گناہ کیا ہے اور اپنے نفس پر ظلم کیا ہے مجھے معاف کر دے مجھ پر رحم فرما، یقیناً تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ تیری ذات کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، بار الہا! تو پاک ہے، تیری حمد کرتے ہیں، میں نے گناہ کیا ہے اور اپنے اوپر ظلم کیا ہے تو مجھے بخش دے اور میری توبہ کو قبول فرما، یقیناً تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

یہ تو تھے مختلف اقوال لیکن ہماری اکثر روایات واحادیث یہ بتاتی ہیں کہ ان کلمات سے مراد "حضرت محمدؐ کے اسمائے مبارکہ ہیں" جن کے ذریعہ حضرت آدمؑ نے توسل کیا تھا اور انہیں اپنا وسیلہ بنایا تھا تاکہ ان کی توبہ قبول ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مذکورہ روایات اور اقوال کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے اس لئے کہ ان سب کو جمع کرنا ممکن ہے اگرچہ کہ زیادہ قوی یہی آخری قول ہے۔ کیونکہ اس کی تعداد بھی کافی قوی ہے اور سند بھی۔ ان دلائل میں سے ایک تو معانی الاخبار کی وہ روایت ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔ اور ایک وہ روایت ہے جو تفسیر امامؑ میں بیان ہوئی ہے کہ "حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت خواہانہ انداز میں عرض کیا: "بار الہا! تو میری توبہ قبول فرما! میری معذرت کو شرف قبولیت سے نوازنا! اس لئے کہ خطا کا نقص ظاہر ہو چکا ہے، اس کی ذلت میرے اعضاء اور بدن میں نمایاں ہو چکی ہے"۔ خداوند عالم نے فرمایا: "اے آدم! میرے اس امر کو خاطر میں کیوں نہیں لاتے جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ جب بھی تمہیں کسی قسم کا غم درپیش ہو اور بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا ہو تو مجھ سے محمدؐ و ان کی پاک آل کا واسطہ دے کر دعا مانگ لینا، بات یاد ہے؟" اس پر آدمؑ نے عرض کیا "ضرور!" خداوند عزوجل نے فرمایا: "وہ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ (علیہم السلام) ہیں تو تم ان کے واسطے سے مجھ سے خصوصی دعا مانگو، میں ضرور قبول کروں گا اور تمہاری مراد سے بڑھ کر تمہیں عطا کروں گا" پھر حضرت آدمؑ نے عرض کیا: "اے میرے رب اور اے میرے معبود! ان بزرگواروں کا مرتبہ تیرے نزدیک اس قدر ہے کہ تو ان کے وسیلہ سے میری توبہ قبول کرے گا، میری خطاؤں کو معاف فرمائے گا، جبکہ میرے لئے تو نے اپنے فرشتوں کو سجدہ ریز کیا، اپنی جنت کو مباح فرمایا، اپنی کنیز حوا کو میری زوجیت میں دیا اور اپنے کریم ملائکہ کو میرا خدمت گار بنایا" اللہ نے فرمایا: "آدمؑ! میں نے اس لئے ملائکہ کو تیری عظمت کے پیش نظر تیرے لئے سجدے کا حکم دیا کیونکہ تو ان "انوار" کا ظرف ہے اور اگر تم اپنی خطاؤں کے ارتکاب سے پہلے مجھ سے ان کے وسیلے سے دعا مانگتے تو میں تمہیں محفوظ رکھتا، تجھے تیرے دشمن ابلیس کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کر دیتا اور تم ہر مصیبت سے محفوظ رہتے، لیکن جو بات میرے علم میں پہلے سے آچکی ہے وہ تو ہو کر رہے گی، اب یہی ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے ان کے وسیلے سے دعا مانگو تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا" تو اس وقت حضرت آدمؑ نے ان الفاظ میں دعا کی: "اَللّٰهُمَّ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ وَ الطَّيِّبِيْنَ مِنْ آلِهِمْ لَمَّا تَفَضَّلْتَ بِقُبُوْلِ تَوْبَتِيْ وَ غُفْرَانِ زَلَّتِيْ وَ اِعَادَتِيْ مِنْ كَرَامَتِكَ اِلٰى مَرْتَبَتِيْ" "خداوندا! محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کی پاکیزہ آل کے واسطے سے (میں تجھ سے سوال کرتا ہوں) تو میری توبہ قبول کر کے، میری لغزشوں کو معاف کر کے اور مجھے میری پہلی حیثیت کی

طرف پلٹا دینے کے ساتھ مجھ پر فضل و کرم فرما!" تو خداوند عالم نے فرمایا: "میں نے تیری توبہ قبول فرمائی، اپنی رضا اور رضوان کے ساتھ تمہاری طرف توجہ فرمائی، اپنی تمام تر نعمتیں تمہاری طرف لوٹا دیں تمہیں اپنی کرامت کے سابقہ عہدے پر پلٹا دیا اور اپنی بہت سی رحمتوں میں تمہارا وافر حصہ بنایا.........."۔ یہ وجہ ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" (بقرہ / ۳۷) پس آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے (جن کے ذریعہ توبہ کی) پس اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی، یقیناً وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت، بحار میں معانی الاخبار سے نقل کی گئی ہے جس میں مفضل حضرت امام جعفر صادقؑ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول "وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ" (بقرہ / ۱۲۴) (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا۔ کے بارے میں سوال کیا کہ "وہ کونسے کلمات تھے؟" امامؑ نے فرمایا: "وہی کلمات تھے جو حضرت آدمؑ نے خدا کی طرف سے یاد کئے تھے اور دعا مانگی تھی اور حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تھی، چنانچہ انہوں نے ان الفاظ میں دعا کی تھی: "يَا رَبِّ أَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ (عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) اِلَّا تُبْتَ عَلَيَّ" خدایا! میں تجھ سے محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ (علیہم السلام) کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو میری توبہ کو قبول فرما!"

تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی اور وہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

راوی نے کہا: "میں نے امامؑ کی خدمت میں ایک مرتبہ پھر عرض کیا کہ: "فرزند رسولؐ! "فَاَتَمَّهُنَّ" (اللہ نے ان کلمات کو مکمل فرمایا) سے خدا کی کیا مراد ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "اللہ نے وہ کلمات (بارہ اماموں کے نام) بارہویں امام حضرت قائم آل محمدؐ تک مکمل فرمادیئے جو امام حسینؑ کی اولاد سے نو امام ہیں"۔ مفضل نے عرض کیا: "مولا! خدا کے اس فرمان "وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ" (زخرف / ۲۸) اللہ نے اسے رہتی دنیا تک رہنے والا کلمہ اس کی نسل میں قرار دیا۔ سے کیا مراد ہے؟" تو امامؑ نے فرمایا: "اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے امام حسینؑ کی نسل میں امامت کو قیامت تک باقی رہنے والا کلمہ قرار دیا" مفضل نے پھر پوچھا: "فرزند رسولؐ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ امامت حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں چلی اور امام حسنؑ کی اولاد میں بر قرار نہیں رہ سکی؟ حالانکہ وہ دونوں ہی فرزند رسولؐ، سبط رسولؐ اور جوانان جنت کے سردار ہیں!" امامؑ نے فرمایا: "حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں نبی مرسل تھے، دونوں بھائی تھے۔ لیکن اللہ نے نبوت، حضرت ہارونؑ کی صلب میں قرار دی حضرت موسیٰؑ کی نسل میں نہیں۔ اور اس پر کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ اسی طرح امامت بھی خدا کی خلافت ہی ہے لہذا اس کے بارے میں بھی کسی کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اللہ نے اسے امام حسنؑ کی نہیں بلکہ امام حسینؑ کی صلب میں کیوں قرار دیا؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ صاحب حکمت ہے اپنے افعال میں حکمت سے کام لیتا ہے، وہ کسی کا جوابدہ نہیں ہے، جبکہ پوری کائنات اس کے آگے جواب دہ ہے"۔

اس طرح کی ایک اور روایت "جامع الاخبار" اور "امالی صدوق" میں اسناد کے ساتھ معمر بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: "ایک یہودی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے سامنے بیٹھ کر آپؐ کو خوب غور سے دیکھنے لگا، آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا:

____: یہودی! کیا چاہتے ہو؟

____: آپؐ افضل ہیں یا حضرت موسیٰ بن عمران کہ جو اللہ کے ایسے نبی تھے جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا، ان کیلئے توریت اور عصا بھیجا، ان کے واسطے ہی دریا کو شگافتہ کیا اور ان پر بادلوں کا سایہ کیا؟

____: بات یہ ہے کہ انسان کو یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ اپنی تعریف خود کرے! لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ:

جب آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ توبہ کی اور ان کی توبہ قبول ہوئی: "اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَسئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ لَمَّا غَفَرتَ لِيَ" خدایا! میں تجھ سے محمدؐ و آل محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے۔ تو خدا نے انہیں بخش دیا۔

جب نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے اور اس کے ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی تو خدا نے انہیں غرق ہونے سے بچالیا: "اَللّٰھُمَّ اِنِّيْ اَسئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ لَمَّا اَنجَيتَنِيْ" خدایا! میں تجھ سے محمدؐ و آل محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ ڈوبنے سے بچالے۔

جب ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی تو اللہ نے ان پر آگ کو "بردو سلام (ٹھنڈک اور سلامتی) قرار دے دیا: "اَللّٰھُمَّ اِنِّيْ اَسئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ لَمَّا اَنجَيتَنِيْ مِنهَا" خدایا! میں تجھ سے محمدؐ و آل محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس آگ سے بچالے۔

جب موسیٰؑ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا اور دل ہی دل میں خوف محسوس کیا تو بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: "اَللّٰھُمَّ اِنِّيْ اَسئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ لَمَّا اٰمَنتَنِيْ" خدایا! میں تجھ سے محمدؐ و آل محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ مجھے محفوظ فرما۔ خداوند جل شانہ نے فرمایا: "لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنتَ الاَعلٰى" (طٰہٰ / ۶۸: ڈرو نہیں کیونکہ تم ہی غالب ہو) حضور انورؐ نے فرمایا:

____: یہودی! اگر موسیٰ (علیہ السلام) میری نبوت کے دور میں ہوں اور مجھ پر اور میری نبوت پر ایمان نہ لائیں تو انہیں ان کا ایمان کچھ بھی فائدہ نہ پہنچائے گا اور نہ ہی ان کی نبوت ان کے کسی کام آئے گی۔ یہودی! میری ذریت (اولاد) میں سے (امام) مھدی (علیہ السلام) ہوں گے، جب وہ ظہور کریں گے تو ان کی مدد و نصرت کیلئے عیسیٰؑ آسمان سے نازل ہوں گے۔ انہیں آگے بڑھا کر خود ان کی امامت میں نماز ادا کریں گے"۔

شارح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اخبار و احادیث ہیں جنہیں ہم نے طوالت کے خوف سے یہاں پر درج نہیں کیا۔ صاحبان مطالعہ کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس بارے میں بحار الانوار کا مطالعہ فرمائیں۔ کیونکہ اس میں محدث اہل بیتؑ علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے ساتھ ایک مستقل باب قائم کیا ہے:

"انبیاء علیہم السلام کی دعائیں محمدؐ و آل محمدؐ کی شفاعت اور وسیلے سے قبول ہوئیں"

بارے میں جولبدہ ہوتا ہے"۔ اوران ذوات مقدسہ کا اپنے نفوس قدسیہ کے لئے اعتراف گناہ درحقیقت رعیت کی طرف سے اعتراف اوران سے استغفار ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نبی یاامام کا امت اور رعیت کے ساتھ اتصال و سبب ہوتا ہے۔ اوران سے بڑھ کر کوئی اور مضبوط اور محکم سبب اور رابطہ نہیں ہوتا، آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ جب کسی قوم سے لغزش یا کوتاہی سرزد ہو جاتی ہے تو اس قوم کا رئیس عذر خواہی کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور قوم کی لغزش کو اپنی طرف منسوب کر کے اس کی معافی مانگتا ہے۔ اور اگر قوم کو سرزنش مقصود ہوتی ہے تو عتاب کا رخ اسی رئیس قوم کی طرف ہوتا ہے ناکہ بذات خود قوم سے۔ اگرچہ وہ کام اس نے نہ بھی کیا ہو بلکہ اسے دیکھا تک نہ ہو۔ اوراس قسم کے کلام کا استعمال عام اور معروف ہے۔ اوراس کی توجیہ کی تائید امام جعفر صادقؑ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جسے مفسر قمیؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ" (فتح/۱) تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے گزشتہ اور آئندہ گناہ معاف کردے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ اس بارے میں فرماتے ہیں: "خدا کی! قسم آنحضرتؐ کا کوئی بھی گناہ نہیں تھا، بلکہ آپؐ نے تو گناہ کا ارادہ تک نہیں فرمایا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آنجنابؐ کے شیعوں کے گناہوں کو آپؐ کی طرف نسبت دی پھر انہیں معاف کردیا"۔

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے روایت ہے، آپؑ فرماتے ہیں: "خدا کی قسم! آپؐ کا کوئی گناہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس بات کی ضمانت دے دی کہ وہ شیعیان علیؑ کے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دے گا"۔ ایک صاحب معرفت و عرفان فرماتے ہیں: "آنحضرتؐ کی عصمت تو پایہ ثبوت تک پہنچی ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت آپؐ کی طرف گناہ کی نسبت دی بھی گئی ہے تو صرف اس بنا پر کہ خطاب آپؐ سے ہوتا ہے اور مراد امت ہوتی ہے، جیسا کہ عربوں کی ضرب المثل ہے: "اِيَّاكِ أَعْنِي وَاسْمَعِي يَا جَارَةُ" کہنا بیٹی سے سنانا بہو کو۔

پنجم: وہ وجہ ہے جسے شیخ علی بن عیسیٰ اربلی نے اپنی کتاب "کشف الغمہ" میں ذکر کیا ہے اور جسے ان سے اکثر متاخرین مثلاً محدث مجلسیؒ اور شیخ بہائیؒ نے "شرح اربعین" میں طریحیؒ نے اور شارح صحیفہ کاملہ صدر الدین سید علی حسینی اور دیگر علماء کبار نے یوں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوالحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سجدہ شکر میں یہ دعا کیا کرتے تھے: "رَبِّ عَصَيْتُكَ بِلِسَانِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَأَخْرَسْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِبَصَرِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَأَكْمَهْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِسَمْعِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَأَصْمَمْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِيَدِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَكَنَّعْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِفَرْجِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَعَقَّمْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِرِجْلِي وَ لَوْ شِئْتَ وَ عِزَّتِكَ لَجَذَمْتَنِي وَ عَصَيْتُكَ بِجَمِيعِ جَوَارِحِي الَّتِي أَنْعَمْتَ بِهَا عَلَيَّ وَ لَمْ يَكُنْ هٰذَا جَزَاؤُكَ مِنِّي ......" "پروردگارا! میں نے اپنی زبان کے ساتھ تیری نافرمانی کی مجھے تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو مجھے گونگا بنا دیتا۔ میں نے آنکھوں کے ساتھ تیری نافرمانی کی، تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو مجھے نابینا بنا دیتا، میں نے کانوں کے ساتھ تیری نافرمانی کی، تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو مجھے بہرا بنا دیتا، میں نے ہاتھوں کے ساتھ تیری نافرمانی کی، تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو مجھے شل کر دیتا اور ہاتھوں کو خشک کر دیتا، میں نے شرمگاہ کے ساتھ تیری نافرمانی کی، تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو مجھے اس سے محروم کر دیتا، میں نے پاؤں کے ساتھ تیری نافرمانی کی مجھے تیری عزت کی قسم اگر تو چاہتا تو انہیں کاٹ کر رکھ دیتا، اور میں نے

اپنے تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ تیری نافرمانی کی حالانکہ یہ اعضاء تو نے مجھے نعمت کے طور پر عطا فرمائے ہیں اور میرا کوئی حق نہیں بنتا تھا کہ تو مجھے اس کی جزا کے طور پر عطا کرتا۔

جب میں نے ان معانی پر غور کیا تو دل میں کہنے لگا: "یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ حالانکہ ہم شیعہ تو ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے قائل ہیں" میرے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی اور اس کی وضاحت نہیں ہو پا رہی تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ میری ملاقات سید سعید، نقیب رضی الدین ابوالحسن علی بن موسیٰ طاؤس حسنیؒ سے ہوئی، میں نے ان کے سامنے اپنی اس ذہنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا: "وزیر سعید مؤید الدین قمیؒ نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا، تو میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ "امام علیہ السلام لوگوں کی تعلیم کیلئے ایسا فرمایا کرتے تھے" اس کے بعد مجھے یہ بات یاد آئی کہ امام علیہ السلام یہ الفاظ اس وقت ادا فرماتے تھے جب آپؑ رات کو سجدہ کی حالت میں ہوتے اور اس وقت آپؑ کے پاس کوئی دوسرا شخص بھی نہیں ہوتا تھا کہ جسے آپؑ تعلیم دیتے۔

پھر مجھ سے وزیر مؤید الدین ابن علقمی نے یہی سوال کیا تو میں نے انہیں وہی سوال جو سید رضی الدین سے کہا تھا اور ان کا جواب ذکر کیا اور ساتھ ہی کہا کہ اس جواب پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہاں سیکھنے والا کوئی موجود نہیں ہوتا تھا، ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "امام رضا علیہ السلام کا ایسا کہنا ان کی بارگاہ خداوندی میں عاجزی اور انکساری کی وجہ سے ہو" لیکن تسلی پھر بھی نہیں ہو پا رہی تھی یہاں تک کہ سید رضیؒ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہوا، زمانے پہ زمانہ گزرتا رہا آخر ایک مرتبہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی کرامت بلکہ ان کا معجزہ کہئے اور عصمت امام کی برکت سے یہ شبہ دور ہو گیا اور عصمت ائمہ کے متعلق میرا عقیدہ مزید مضبوط ہو گیا وہ یوں کہ:

عصمتِ انبیاءؑ وائمہؑ کا ایک اور پہلو

انبیاء وائمہؑ علیہم السلام کے تمام اوقات خداوند متعال کے ساتھ مشغول، ان کے قلوب بھرپور اور ان کے دل ملاء اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ "مراقبہ" کی حالت میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "اُعْبُدِ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ" خدا کی یوں عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے (اور یہی مراقبہ ہے)۔ لہٰذا یہ ذوات قدسیہ ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنے سارے وجود کے ساتھ اسی کی طرف لو لگاتے ہیں۔ لیکن جب کھانے، پینے، ازدواجی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے اپنے ذاتی امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو خود کو یہ سمجھتے ہیں کہ بلندی سے پستی کی طرف آگئے ہیں اور اپنے آپ کو مباح امور کے ساتھ مشغول کر لیا ہے۔ لہٰذا اس کیفیت کو وہ اپنے لئے "گناہ" سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک ایسا کرنا "خطا" ہے لہٰذا وہ اس قسم کے گناہوں اور اس طرح کی خطاؤں سے استغفار کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

اس کی مثال دنیوی طور پر یوں سمجھئے کہ ایک غلام اگر اٹھتا، بیٹھتا، کھاتا، پیتا اور ازدواجی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ اس کا آقا اسے دیکھ بھی رہا ہے اور اس کی باتوں کو سن بھی رہا ہے تو وہ خود کو لوگوں کے نزدیک قابل ملامت سمجھتا ہے اور اپنے کو آقا و مولا کے حق میں قصوروار جانتا ہے، یہ ایک دنیا کے بندے کی مثال ہے جس کا آقا و مولا بھی خدا کا ایک بندہ ہی ہے تو جو سید السادات اور شاہ شاہان ہے اس کے آگے اس کے خاص الخاص بندوں کی کیا کیفیت ہو گی؟

یہی توجہ ہے کہ حضرت رسالتمابؐ فرماتے ہیں: "اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ بِالنَّهَارِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" میرے دل کو خواہشات کے پردے چھپادیتے ہیں اور میں روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

اسی طرح سرکار دوعالمؐ کا ارشاد گرامی ہے "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" نیک لوگوں کی نیکیاں، مقربین بارگاہ کے نزدیک برائیاں سمجھی جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان تمام اشکالات کو رفع کیا جاسکتا ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے بارے میں کئے جاتے ہیں، اے کاش کہ سید سعید رضی الدینؒ زندہ ہوتے تو میں ان کی خدمت میں اپنی یہ "سوغات، دلہن کی صورت میں" بنا سجا کر بھیجتا اور انہیں پتہ چلتا کہ پیچیدہ مسائل کو کیونکر حل کیا جاتا ہے!

میں نہیں سمجھتا کہ اس عقدہ کو میرے علاوہ کسی اور صاحب علم و دانش نے حل کیا ہو، اور یہ اس لئے ہے کہ کبھی کبھار بجھے ہوئے دل سے بھی عجائبات صادر ہو ہی جاتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم الایام سے ضرب المثل چلی آرہی ہے کہ "مَعَ الْخَوَاطِي سَهْمٌ صَائِبٌ" یعنی خطا کرنے والے تیروں کے ساتھ نشانہ پر بیٹھنے والا تیر بھی ہوتا ہے۔

انہی کی اقتدا میں قاضی بیضاوی شرح مصابیح میں آنحضرتؐ کے اس قول "میرے دل پر حجاب پڑ جاتے ہیں لہٰذا میں روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "غَيْنٌ" لغت میں بادل کو کہتے ہیں اور جب اس کا اطلاق "عَلٰى" کے ساتھ ہو تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں "ڈھانپ دینا"۔ ابو عبیدہ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ، اس کا مقصد یہ ہے کہ "میرے دل کو پردے چھپالیتے ہیں"۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ اصمعی کے بارے میں ہے کہ ان سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے سائل سے پوچھا: "تم یہ کس کے دل کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" اس نے کہا: "حضرت پیغمبر خداؐ کے دل کے بارے میں!" تو اصمعی نے جواب دیا: "اگر پیغمبرؐ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں پوچھتے تو میں اس کی تشریح اور تفسیر سے مطلع کرتا"۔ علامہ بیضاوی تبصرہ کے طور پر فرماتے ہیں: "خدا اصمعی کا بھلا کرے انہوں نے آنحضرتؐ کے بارے میں نہایت ادب سے کام لیا اور اس دل کے اجلال و احترام کے پیش نظر لب کشائی نہیں کی جسے اللہ نے اپنی وحی و تنزیل کا مرکز قرار دیا"۔ پھر خود ہی (علامہ بیضاوی) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "چونکہ آنحضرتؐ کا دل صفا اور پاکیزگی کے لحاظ سے اس مقام پر فائز ہے جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، آپ کا دل سب دلوں سے زیادہ صاف، زیادہ منور، زیادہ روشن، زیادہ پاکیزہ، زیادہ عارف اور عرفان کی بلند ترین مرتبہ پر فائز ہے۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرتؐ تاسیس ملت اور تشریع سنت کے بھی پابند تھے اور پھر نرمی سے کام لیتے، سختی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اسی لئے آپؐ کیلئے ضروری تھا کہ افراد امت کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے کیلئے ان بلندیوں سے اتر کر ظاہری بشری ضروریات و احکام کو بھی پورا فرمائیں۔ اور جب آپؐ اس بشری کیفیت میں ہوتے تو چونکہ آپ کا دل اس قدر صاف اور شفاف ہو تا کہ دنیوی گرد و غبار کے ذرات فوراً اس پر جمع ہو جانے کی کوشش کرتے، کیونکہ کوئی چیز جس قدر زیادہ صاف اور شفاف ہو گی اس پر پڑنے والے داغ

دھبے اتنا ہی واضح اور نمایاں ہوں گے۔ اسی لئے جب آنحضرتؐ ایسے ذرات اور دھبوں کو پڑتا محسوس فرماتے تو انہیں اپنے واسطے "گناہ" تصور کرتے اور فوراً اس گناہ سے استغفار کرتے"۔

علامہ مجلسیؒ کا موقف

محدث اہل بیتؑ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار کی ساتویں جلد میں ارشاد فرماتے ہیں: "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ شیعہ امامیہ اثناعشریہ (رضی اللہ عنہم) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرات ائمہ علیہم السلام تمام صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں، ان سے گناہ بالکل سرزد نہیں ہوتا، نہ ہی عمداً اور نہ سہواً، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ انہیں سہو و نسیان سے دوچار کرتا ہے۔ البتہ شیخ صدوق اور ان کے استاد بزرگوار ابن ولید رحمۃ اللہ علیہما کا موقف اس سے قدرے مختلف ہے۔ وہ دونوں بزرگوار فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی خاص مصلحت کے تحت ائمہ علیہم السلام کو سہو سے دوچار کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی ان امور میں جن کا تعلق تبلیغ اور بیان احکام سے نہیں ہوتا، البتہ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سہو خدا کی طرف سے ہوتا ہے شیطان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا"۔

عصمت انبیاء و ائمہ کے بارے میں بہت سی اخبار و روایات اور دلائل بیان ہو چکے ہیں اور بحار کی پانچویں اور چھٹی جلدیں اس بات کی شاہد ہیں، اور ساتویں جلد کے اکثر ابواب بھی انہی دلائل سے لبریز ہیں۔ اور جو روایات یا دعائیں اس کے خلاف ملتی ہیں ان کی درج ذیل وجوہات کے ساتھ تاویل کی جائے گی:

اول: مستحب کا ترک اور مکروہات کا ارتکاب بھی کبھی گناہ اور عصیان کہلاتا ہے بلکہ ان کی رفعت شان اور بلندی مرتبت کے پیش نظر ان کا کسی فعل مباح کا ارتکاب بھی "گناہ" کہلاتا ہے۔ جیسا کہ کلام اربلیؒ میں اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔

دوم: جب یہ نفوس قدسیہ اپنے الٰہی فرائض یعنی مخلوق خدا کے ساتھ معاشرت، ان کی انسانی زندگی کی تکمیل و ہدایت سے فارغ ہو کر اپنے اصل مقام قرب و وصال اور مناجات ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بعض اوقات اپنے آپ کو اس عظیم المرتبت بارگاہ تک رسائی کے لائق نہیں سمجھتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر گریہ وزاری کرتے اور خود کو قصوروار سمجھ کر اس کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہیں۔ خواہ وہ فریضہ بھی بحکم رب ذوالجلال انجام دے چکے ہوتے ہیں۔ مگر اپنے اندر احساس ندامت کرتے ہوئے اس سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔

اس کی ظاہری مثال یوں سمجھئے کہ جیسے کوئی دنیوی بادشاہ اپنے کسی مقرب بارگاہ کو اپنی خدمت کی انجام دہی کیلئے کسی دور دراز مقام کی طرف روانہ کرتا ہے جس پر اسے بادشاہ کے حضور موجود رہنے اور اس کے قرب کا شرف حاصل کرنے سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ تو جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے واپس آتا ہے تو روتا ہے، گریہ وزاری کرتا ہے بادشاہ کے حضور گڑگڑاتا ہے اور خود کو مجرم و قصوروار ظاہر کرتا ہے کہ اس عظیم مقام سے محروم رہا۔

سوم: چونکہ ان کے تمام فضائل و کمالات اور علوم فضل و کرم پروردگار کے مرہون منت ہیں۔ یعنی اگر فضل الٰہی ان کے شامل حال نہ ہو تو ان سے مختلف قسم کے گناہوں کا صدور ممکن ہو۔ لہذا جب وہ اپنی کیفیت کو دیکھتے ہیں تو فوراً اپنے رب کے فضل اور اپنی ذات کے عجز کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کا یہ اعتراف کچھ ایسے انداز میں ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے گناہ اور

سیئات سرزد ہوتے ہیں حالانکہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ: "اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو میں گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہوتا۔ اور اگر تیری ہدایت نہ ہوتی تو میں بھٹک چکا ہوتا"

چہارم: چونکہ وہ ہر ہر لحہ معرفت رب کیلئے ترقی و کمال کے زینوں پر گامزن ہوتے ہیں اور ان کا ہر اٹھنے والا قدم ترقی اور کمال کی جانب ہوتا ہے اور جب وہ اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنی معرفت اور اپنے اعمال کو اپنی نگاہوں میں لے آتے ہیں تو خود کو قصوروار سمجھتے ہیں جس سے توبہ کرنا اپنا فریضہ جانتے ہیں۔ اگر اسی مناسبت سے پیغمبر اکرمؐ کا یہ قول کہ: "میں روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں" یہاں پر ذکر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پنجم: چونکہ وہ بزرگوار (خدا کا ان سب پر درود و سلام ہو اور بروز قیامت ہمارے حق میں ان کی شفاعت قبول ہو، آمین۔ از مترجم) اپنے معبود کی معرفت کے آخری درجے پر فائز ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے اعمال بجالاتے ہیں اور اعمال کی بجاآوری میں پوری طرح کوشش کرتے ہیں لیکن جب ذات رب ذوالجلال کی عظمت کو دیکھتے ہیں تو زبان حال سے یہی کہتے ہیں ۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور اپنی اس قدر عظیم عبادت کو بھی اس کے مقابلے میں ناچیز بلکہ گناہ سمجھتے ہیں اسی لئے اس سے یوں استغفار کرتے ہیں جیسے کوئی عاصی گناہگار۔

جو شخص محبت کے جام سے شوق کے گھونٹ پیتا ہے تو مذکورہ پیش ہونے والی وجوہات سے انکار نہیں کرتا اور محب کامل و عارف جب اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھتا ہے یا اپنے مطلوب کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو بڑا قصوروار، خطاکار اور گناہگار سمجھتا ہے، خداوند تعالیٰ ہمیں محبین کے درجوں تک پہنچنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

شارح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: یہ تو تھیں وہ وجوہات جو ہمارے علمائے اعلام نے مذکورہ اشکالات کے ازالہ کیلئے بیان فرمائی ہیں، خداوند عالم ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور انہیں اجر جزیل سے نوازے۔ رضوان اللہ علیہم۔ البتہ ذاتی طور میرے نزدیک ایک اور وجہ ہے جو اگرچہ سابقہ وجوہات سے بظاہر نزدیک نظر آتی ہے لیکن اسے ان کی طرف نسبت دینا ایسے ہے جیسے ثریا کی نسبت ثریٰ کی طرف ہوتی ہے۔ اور یہ صاحبان ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر مخفی نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ابھی اسی خطبے کی آٹھویں فصل کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے کہ: "سب سے پہلے اللہ نے انوار محمدؐ و آل محمدؑ کو پیدا کیا ہے اور انوار کی یہ تخلیق، کائنات کی تخلیق سے ہزاروں سال پہلے کی ہے اور اس سلسلے میں ابوالحسن بکری کی حدیث بیان ہو چکی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انوار عالم کی ایجاد سے چار لاکھ چوبیس ہزار سال قبل خلق فرمائے"۔

مذکورہ بالا تصریح کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذوات قدسیہ اس زمانے میں بسیط انوار اور جوہر کی صورت میں تھیں جو جسم و جسمانیت سے بالکل جدا تھیں۔ مادیت سے خالی، ہر قسم کے حدود و قیود سے آزاد تھیں، اور اس طویل دورانیہ میں جمال حق کے شہود میں مستغرق، تسبیح و تقدیس و تنزیہ باری میں مشغول، کبھی حجاب قدرت میں تو کبھی حجاب عظمت میں، کسی وقت حجاب عزت میں تو گاہے حجاب ہیبت میں، غرض ان کا یہ دورانیہ مذکورہ حدیث میں بیان ہونے والے حجابات میں گزرتا رہا۔

اس کے بعد حکمت خداوند متعال کا تقاضا یہ ہوا کہ انہیں "عالم تجرد" سے نکال کر "عالم تقید" میں بھیجے، تاکہ وہ انسانی

صورت اختیار کر کے مخلوق کو ہدایت اور امت کو راہنمائی کریں، چنانچہ اس مادی دنیا میں آکر جو بشری اور جسمانی تقاضے ہوتے ہیں ان کی حدود و قیود میں پابند ہو گئے۔ اور چونکہ اس عالم میں آکر انہیں استغراق کامل اور اسی طرح پوری فراغت نہیں ملی جس طرح کہ وہ اس عالم میں محو و مستغرق اور فارغ البال ہو کر بجالاتے تھے۔ کیونکہ یہاں پر آکر تعلقات مانع ہو گئے، جبکہ وہاں پر ایسی صورت نہیں تھی۔ اس لئے وہ اپنی سابقہ کیفیت کو پیش نظر رکھ کر اللہ سبحانہ سے استغفار کرتے تھے اور اپنی تقصیر و کوتاہیوں کا یوں اعتراف کرتے تھے جیسے کوئی قصوروار خطاکار اور گناہگار ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ توجیہ جو نظر قاصر میں آئی اور میں نے یہاں پر بیان کر دی، خداوند عالم راہ راست کا ہادی اور صراط مستقیم کا راہنما ہے۔

چودھویں فصل

لفظ ذریت کی تشریح

فَاَهْبَطَه' اِلیٰ دَارِ الْبَلِيَّةِ وَ تَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ وَ اصْطَفٰی مِنْ وُّلْدِهٖ اَنْبِيَآءَ اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ وَعَلٰی تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِاَمَانَتَهُمْ لَمَّا بَدَّلَ اَكْثَرُخَلْقِه عَهْدَ اللهِ اِلَيْهِمْ فَجَهِلُوْاحَقَّه'وَاتَّخَذَ الاَنْدَادَ مَعَه'وَاجْتَالَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ وَاقْتَطَعَتْهُمْ عَنْ عِبَادَتِهٖ فَبَعَثَ فِيْهِمْ رُسُلَهٗ وَوَاتَرَاِلَيْهِمْ اَنْبِيَائَه' لِيَسْتَاْدُوْهُمْ مِيْثَاقَ فِطْرَتِهٖ وَيُذَكِّرُوْهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهٖ وَ يَحْتَجُّوْا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيْغِ وَ يُثِيْرُوْا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ وَ يُرُوْهُمْ آيَاتِ الْمُقَدَّرَةِمِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوْعٍ وَّ مِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوْعٍ مَعَايِشَ تُحْيِيْهِمْ وَآجَالَ تُفْنِيْهِمْ وَاَوْصَابٍ تُهْرِمُهُمْ وَاَحْدَاثٍ تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ.

پس اللہ نے آدمؑ کو دار ابتلاو محل افزائش نسل میں اتارا اور اللہ نے ان کی اولاد سے انبیاء چنے۔ وحی پر ان سے عہد و پیمان لیا اور تبلیغ رسالت کا انہیں امین بنایا جبکہ اکثر لوگوں نے اللہ کا عہد بدل دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے حق سے بے خبر ہو گئے، اوروں کو اس کا شریک بنا ڈالا۔ شیاطین نے اس کی معرفت سے انہیں روگردان اور اس کی عبادت سے الگ کر ڈالا۔ پس اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کئے اور لگاتار انبیاء بھیجے تا کہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں، ان کو بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں عقل کے دفینوں کو ابھاریں اور انہیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں یہ سروں پر بلند بام آسمان، ان کے نیچے بچھا ہوا فرش زمین، زندہ رکھنے والا سامان معیشت، فنا کرنے والی اجلیں، بوڑھا کر دینے والی بیماریاں اور پے در پے آنیوالے حادثات۔

تشریح

"ھبط" کے معنی ہیں "نزل" ضرب کے باب سے ہے اور لازم ہے۔ "اَھبط" متعدی ہے "اَنزَلَ" کے معنی میں اور "ذُرِّيَّة" کے معنی "نسل اور ایک جیسی اولاد کے ہیں واحد اور جمع کیلئے یکساں استعمال ہوتا ہے اس کی قرائت کیلئے تین لغات ہیں۔ زیادہ فصیح یہ ہے کہ لفظ ذال کے ضمہ (پیش) کے ساتھ پڑھا جائے۔ آیات قرآنیہ میں "قراء

سبعہ "(ساتوں قاریوں) نے اسی اعراب کے ساتھ پڑھا ہے۔
دوسری قرائت ذال کے کسرہ (زیر) کے ساتھ ہے۔ اور یہ زید بن ثابت کی ورائت روایت کی جاتی ہے۔ جبکہ تیسری قرائت اسی کے فتحہ (زبر) کے ساتھ ہے اور "راء" غیر مشدد ہے۔ "کَرِیمَۃٌ" کے وزن پر، یہ ابان بن عثمان کی قرائت ہے۔ اس کی جمع "ذُرِّیَّات" "بھی آتی ہے اور "ذَرَارِي" "بھی۔

لفظ ذریت کی اصل اور اس کی علمی تحقیق

اس کی اصل میں چار مذہب ہیں :

۱۔ اس کی اصل "ذَرَءَ" ہمزہ کے ساتھ ہے اور "ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ" سے لیا گیا ہے۔

۲۔ "ذَرّ" ہے ۳۔ "ذَرْوٌ" ہے اور ۴۔ "ذَرْيٌ" ہے۔

اگر اسے "ذَرَءَ" سے لیا جائے تو اس کا وزن "فُعْلِیَّةٌ" ہو گا جیسے "قُمْرِیَّةٌ" ۔ یا "فُعَیْلَةٌ" جیسے "ذُرَیْرَةٌ" ہو گا، چونکہ کثرت سے "راء" اکٹھی ہو گئی تھیں لہذا آخری "راء" کو "یاء" میں بدل دیا اور "یاء" کو "یاء" میں ادغام کر دیا۔ "ذُرِیَّةٌ" ہو گیا، بروزن "سُرِّیَّةٌ" بمعنی نکاح۔ یا اسے "ذُرُوْرَةٌ" (بروزن فُعُوْلَةٌ) سے لیا گیا ہے، کثرت راء کی وجہ سے آخری راء کو یاء میں تبدیل کر کے واؤ کو یاء میں ادغام کر دیا "ذُرِیَّةٌ" ہو گیا۔

تیسری صورت میں اس کا وزن "فُعُوْلَةٌ" ہو گا اور چوتھی صورت میں "فُعِیْلَةٌ"۔

لفظ "شیاطین" کی تحقیق

"شیاطین" جمع ہے "شیطان" کی، جو کہ "شطن" بمعنی دوری سے لیا گیا ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ : "سیبویہ نے "شیطان" کے نون کو اپنی کتاب میں ایک جگہ تو اصل قرار دیا ہے اور ایک جگہ زائدہ بتایا ہے۔ اس کا نون اصل قرار دینے کی دلیل یہ ہے کہ یہ "تَشَیْطُنٌ" سے بنا ہے اور اسے "شَطَنَ" سے مشتق کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں "اچھائی، نیکی اور بہتری سے دور ہوا"۔

اگر اسے "شَاطَ" بمعنی "بَطَلَ" (باطل ہوا) سے لیا جائے تو اس کا نون "زائدہ" ہو گا۔

"وَاتَرَ" کا لفظ "مُوَاتَرَہ" بمعنی متواتر سے لیا گیا ہے اور ایک قول کے مطابق چیزوں کے درمیان تواتر اس وقت ہوتا ہے جب ان کے درمیان وقفہ آجائے اور اگر کسی قسم کے وقفہ کے بغیر ہو تو اس وقت "مدارکہ" اور "مواصلہ" کہا جائے گا۔ "احداث" جمع ہے "حَدَث" کی اور نئے امور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا عرفی استعمال نت نئے مصائب کے ساتھ خاص ہے۔ چند الفاظ کی تشریح کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ :

نماز پنجگانہ کے وجوب کے اسباب

جب آدمؑ نے درخت کا پھل کھا لیا تو اللہ سبحانہ نے انہیں بہشت سے نکال دیا اور (پھر انہیں دار ابتلاء میں اتارا) لفظ "اِھْبَاط" میں معانی کی دو صورتیں بنتی ہیں۔ وہ یوں کہ اگر حضرت آدمؑ آسمانی بہشت میں تھے تو اوپر سے نیچے اتارنے کا معنی واضح

ہے۔اور اگر دنیاوی جنت میں تھے تو بھی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ "اِھْبَاط" بمعنی "اِنْتِقَال" کے ہو جیسے "اِھْبِطُوا مِصْرًا" ہے، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی مراد ہو گی۔اور "دار ابتلاء" سے مراد وہی "دار دنیا" ہے۔ کیونکہ "دار دنیا" میں اللہ تعالیٰ نے آزمائش مقرر کر رکھی ہیں جو ظالم کیلئے ادب، مؤمن کیلئے امتحان، انبیاء کیلئے درجے اور اولیاء کیلئے کرامت کا موجب ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اخبار و روایات میں موجود ہے۔

بعض روایات کے مطابق زمین کے سب سے پہلے بقعہ پر جہاں آدمؑ کو اتارا گیا سرزمین مکہ میں کوہ صفا تھا۔ اور بعض دیگر روایات کے مطابق کوہ "سرانديپ" تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، جو سرزمین ہندوستان اور چین کے بالائی پہاڑوں پر ہے۔ بحری سفر کرنے والوں نے اس جگہ کا مشاہدہ بھی کیا ہے اور جیسا کہ نقل کیا گیا ہے وہاں پر حضرت آدمؑ کے پاؤں کے نشان بھی پتھر پر نقش ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس پہاڑ میں سرخ یاقوت پائے جاتے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو اس کی چوٹی سے یہ پتھر بارش کے پانی کے ساتھ اس سے نیچے آجاتے ہیں، یہیں پر الماس (ہیرا) بھی پایا جاتا ہے اور "عود ہندی" بھی۔

حضرت آدمؑ کا ہبوط غروب آفتاب کے بعد عمل میں آیا، جیسا کہ علی ابن ابراہیم نے اسناد کے ساتھ حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ کی عمر اُن کے تخلیقی دن سے لیکر مرتے دم تک نو سو تیس برس تھی۔ آپ مکہ معظمہ میں مدفون ہوئے، جمعہ کے دن زوال آفتاب کے بعد آپؑ میں روح پھونکی گئی۔ اس کے بعد آپؑ کی نچلی پسلی (۱) سے حضرت حوا کو پیدا کیا گیا، اسی روز اللہ نے انہیں بہشت میں ٹھہرایا، ابھی وہاں پر چھ گھنٹے ہی گزر پائے تھے کہ خدا کی نافرمانی کے سبب وہاں سے غروب آفتاب کے وقت نکال دیئے گئے۔ وہاں پر انہوں نے ایک رات بھی نہیں گزاری"۔

من لایحضر الفقیہ میں ہے کہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: "جب حضرت آدمؑ کا جنت سے ہبوط ہوا تو آپؑ کے جسم پر سیاہ خال نمودار ہوا جو سر سے پاؤں تک کو گھیرے ہوا تھا۔ جب یہ داغ نمودار ہوا تو آپؑ کے حزن و بکا میں اضافہ شروع ہو گیا، آپؑ کے پاس جبرائیل آئے اور آکر عرض کیا: "آپ کیوں روتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "ظاہر ہونے والے اسی خال کی وجہ سے روتا ہوں" حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا: "ابھی کھڑے ہو جاؤ اور نماز پڑھو کیونکہ یہ پہلی نماز کا وقت ہے، آپؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔ جس سے وہ خال سر سے گردن تک مٹ گیا، اس کے بعد دوسری نماز کا وقت ہوا تو جبرائیلؑ پھر آگئے اور فرمایا: "اٹھئے اور نماز پڑھئے کہ یہ دوسری نماز کا وقت ہے، چنانچہ آپؑ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی، جس سے وہ خال "گردن سے ناف تک" مٹ گیا۔

جب تیسری نماز کا وقت ہوا تو پھر جبرائیلؑ آپؑ کے پاس آئے اور کہا: "آدمؑ اٹھئے اور نماز پڑھئے کہ یہ تیسری نماز کا وقت ہے"۔ چنانچہ انہوں نے نماز ادا کی، جس پر وہ خال گھٹنوں تک ختم ہو گیا، اسی طرح چوتھی نماز کے وقت پر پہنچ کر نماز پڑھنے کا کہا، جب آپ نماز پڑھ چکے تو وہ خال پاؤں تک ختم ہو گیا۔ اور پانچویں نماز کے وقت بھی اسی طرح کیا اور انہوں نے پانچویں نماز پڑھ لی تو خال بالکل ہی ختم ہو گیا۔ اس پر انہوں نے خداوند ذوالجلال کی حمد و ثنا کی۔ حضرت جبرائیلؑ نے کہا: "آدمؑ! جس طرح نماز کے ذریعے تمہیں

---

(۱) من لایحضرہ الفقیہ میں ہے کہ جس روایت میں یہ بات ہے کہ حضرت حوا، حضرت آدمؑ کے بائیں طرف کی پسلی سے پیدا کی گئیں وہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس کا معنی ہے حوا اس مٹی سے پیدا ہوئیں جو آدمؑ کی بائیں طرف کی پسلی سے بچ گئی تھی۔ اس لئے مرد کی ایک پسلی عورت کی ایک پسلی سے کم ہے۔

شفا حاصل ہوئی ہے، اسی طرح تمہاری اولاد بھی پنجگانہ نمازوں کی برکت سے گناہوں کی بیماری سے نجات پائے گی"۔

کتاب وسائل الشیعہ "انگوروں کے نچوڑنے کی حرمت" کے باب میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے اسناد کے ساتھ منقول ایک روایت بھی یہاں درج کی گئی ہے، جس کا ہمارے موضوع کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں ہے، لہذا اسے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت آدمؑ کے بارے میں عیون اخبار الرضا سے ایک روایت درج کی گئی ہے کہ حضرت آدمؑ اس دنیا میں پہنچ کر جن حادثات اور مصائب و مشکلات سے دوچار ہوئے، ان میں سے ایک قابیل کے ہاتھوں ہابیل کی موت کا صدمہ بھی تھا، جس نے آپ کو بہت رنج و غم میں مبتلا کر دیا اور آپ نے ان کی موت پر ایک دردناک مرثیہ بھی کہا، چنانچہ مذکورہ کتاب میں ہے کہ کسی شامی نے حضرت امیرؑ سے دریافت کیا کہ "دنیا میں سب سے پہلے کس نے اشعار کہے؟" امامؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ نے" اس نے پوچھا: "ان کے کونسے اشعار تھے؟" امامؑ نے فرمایا: "جب وہ آسمان سے زمین پر اتارے گئے تو انہوں نے اس کی مٹی، وسعت اور ہواؤں اور فضاؤں کو دیکھا، پھر قابیل کے ہاتھوں ہابیل کی موت کے صدمہ سے دوچار ہوئے تو ایک مرثیہ پڑھا جس کے یہ اشعار تھے:

تَغَيَّرَتِ الْبِلَادُ وَ مَنْ عَلَيْهَا فَوَجْهُ الْاَرْضِ مُغْبَرٌّ قَبِيْحٌ
تَغَيَّرَ كُلُّ ذِيْ لَوْنٍ وَّ طَعْمٍ وَ قَلَّ بَشَاشَةُ الْوَجْهِ الْمَلِيْحِ
وَ مَالِيْ لَا اَجُوْدُ بِسَكْبِ دَمْعٍ وَ هَابِيْلُ تَضَمَّنَهُ ضَرِيْحٌ
اَرٰى طُوْلَ الْحَيَاةِ عَلَيَّ غَمًّا وَ هَلْ اَنَا فِيْ حَيَاتِيْ مُسْتَرِيْحٌ
قَتَلَ قَابِيْلُ هَابِيْلَ اَخَاهُ فَوَاحُزْنَاهُ لَقَدْ فَقَدَ الْمُتِيْحُ

یعنی زمین اور روئے زمین پر رہنے والے کتنے تبدیل ہو چکے ہیں۔ اور زمین کا چہرہ بگڑا ہوا غبار آلود ہے، ہر رنگ اور ذائقے دار چیز بدل چکی ہے۔ اور نمکین چہرے کی بشاشت گھٹ کر رہ گئی ہے۔ میں (ہابیل پر) آنسوؤں کی سخاوت کیوں نہ کروں جبکہ ہابیل کو قبر کی مٹی نے اپنے اندر چھپایا ہوا ہے۔ مجھے تو ساری زندگی کے غم ہی غم نظر آتے ہیں، کیا مجھے زندگی سے چھٹکارا بھی مل سکتا ہے؟ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا ہے۔ پس ہائے غم!! مجھ سے میرا پیارا بچھڑ گیا ہے۔ (یہ تو تھا غمزدہ باپ کا اپنے مظلوم اور شہید بیٹے کی قبر پر مرثیہ، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہید مظلوم کی شہادت پر مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی حضرت آدمؑ نے سکھایا ہے لیکن شہیدوں پر رونے اور نوحہ پڑھنے والوں کا مذاق اڑانا اور ان کے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کرنا شیطانی طریقہ کار ہے) ابلیس نے انہیں اس طرح جواب دیا

تَنَحَّ عَنِ الْبِلَادِ وَ سَاكِنِيْهَا فَبِيْ فِي الْخُلْدِ ضَاقَ بِكَ الْفَسِيْحُ
وَ كُنْتَ بِهَا وَ زَوْجُكَ فِيْ قَرَارٍ وَ قَلْبُكَ مِنْ اَذَى الدُّنْيَا مُرِيْحٌ
فَلَمْ تَنْفَكَّ مِنْ كَيْدِيْ وَ مَكْرِيْ اِلٰى اَنْ فَاتَكَ الثَّمَنُ الرَّبِيْحُ
وَ بَدَّلَ اَهْلُهَا اَثْلًا وَّ خَمْطًا بِجَنَّاتٍ وَ اَبْوَابٍ مُتِيْحٌ
فَلَوْلَا رَحْمَةُ الْجَبَّارِ اَضْحٰى بِكَفِّكَ مِنْ جِنَا الْخُلْدِ رِيْحٌ

یعنی زمین اور ساکنین زمین سے دور رہو، اس لئے کہ تمہاری وجہ سے مجھ پر خلد بریں کا وسیع وعریض علاقہ تنگ کر دیا گیا۔ تم اور تمہاری زوجہ جنت میں مزے لے رہے تھے اور تمہارا دل دنیا کی تکلیفوں سے آرام میں تھا۔ آخر کار تم میرے مکر اور چالوں سے نہ بچ سکے اور ایک گرانقدر منافع تمہارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ تو جنت میں رہنے والوں نے بہشت اور اس کے بلند دروازوں کو جھاؤ اور پیلو کے درختوں کے ساتھ بدل دیا۔ پھر بھی اگر خدا کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو کبھی بہشت کی ہوا بھی تم تک نہ پہنچ پاتی۔

بہر حال یہ تو تھی کیفیت آدمؑ کے ساتھ ابلیس کے مقابلے کی۔ اور بات ہو رہی تھی حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطبے کی کہ آپ فرماتے ہیں کہ "اللہ نے آدمؑ کو دار ابتلاء (اور محل افزائش نسل میں اتارا) کہ جہاں پر سلسلہ توالد اور تناسل آگے بڑھے اور بیٹے، بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

انسان کی افزائش نسل اور اس کا ایک تحقیقی جائزہ

اس بارے میں زبردست اختلاف ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد کا سلسلہ آگے کیسے بڑھا؟

چنانچہ "مجوسی" جو کہ محرم کے ساتھ نکاح جائز سمجھتے ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ "حضرت آدمؑ نے اپنی بیٹیوں کا نکاح اپنے بیٹوں سے کر دیا، جس سے نسل آدمؑ آگے بڑھی اور انسانوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا"۔

روایات کے مطابق ان کا ایک بدمست اور عیاش بادشاہ تھا، ایک رات مستی میں آکر اپنی ماں اور بہن کی آبرو لوٹ لی، جب مستی دور ہو گئی تو اس پر سخت ندامت کا اظہار کیا اور اسے یہ بات سخت ناگوار گزری۔ لیکن اپنے اوپر یہ عار بھی نہ آنے دینا چاہتا تھا لہذا لوگوں سے یہ کہنے لگا: "یہ کوئی ناجائز کام نہیں بلکہ حلال اور جائز ہے" مگر لوگوں نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے لعن طعن کرتے رہے، مگر وہ اپنے غرور میں انہیں قتل کر کے گڑھے کھود کر ان میں انہیں ڈال دیتا تھا۔ حضرت امیر المؤمنینؑ سے ایک اور روایت میں منقول ہے کہ جو بانوے خطبہ کی شرح میں تفصیل سے بیان ہو گی کہ "جب لوگوں نے اس کے قبیح فعل پر احتجاج کیا تو اس نے ان کے سامنے یہ دلیل پیش کی کہ آدمؑ کی اولاد (بہن بھائیوں) کا آپس میں نکاح ہوا تھا۔ جس پر کچھ لوگوں نے اس کی بات کو قبول کر لیا اور آج تک اس پر قائم ہیں"

اسی سے ملتا جلتا عقیدہ (شیعوں کا نہیں بلکہ) جمہور مسلمانوں کا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ: "حضرت آدمؑ کی زوجہ محترمہ، یعنی جناب حوا (ام البشر) ہر مرتبہ دو جڑواں بچوں (بیٹا اور بیٹی) کو جنم دیتیں، چنانچہ "قابیل" کے ساتھ اس کی جڑواں بہن کا نام "اقلیما" تھا جو پہلے بطن حوا سے پیدا ہوئے اور دوسرے بطن سے "ہابیل" کے ساتھ اس کی جڑواں بہن "لیوذا" پیدا ہوئے۔ جب سب افراد شادی کے قابل ہوئے تو اللہ نے حکم دیا کہ قابیل کی جڑواں بہن کو ہابیل کے ساتھ اور ہابیل کی جڑواں بہن کو قابیل کے ساتھ بیاہ دیا جائے۔ اس حکم پر ہابیل نے تو رضامندی کا اظہار کر دیا لیکن قابیل نہ مانا، کیونکہ اس کی جڑواں بہن خوبصورت تھی قابیل نے اپنے باپ سے کہا: "اللہ نے یہ حکم نہیں دیا بلکہ آپ نے اپنی طرف سے کہہ دیا ہے"۔ حضرت آدمؑ نے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ اللہ کے حضور قربانی پیش کریں (جس کی قبول ہو گئی وہ مقبول بارگاہ ٹھہرے گا) دونوں نے اپنے باپ کے حکم کو مان لیا۔ چنانچہ ہابیل تو اپنے ریوڑ سے

ایک بہترین مینڈھا لے آئے اور اسے اللہ کی بارگاہ میں قربان کرنے اور اس کی خوشنودی کے حصول اور والد کو راضی کرنے کیلئے پیش کر دیا جبکہ قابیل نے کھلیان سے ناکارہ بچی کھچی جئی کی بالیاں لے آیا اور مٹھی بھر اس گٹھے کو بڑی بے دلی کیساتھ نہ تو خدا کی رضا کیلئے اور نہ ہی اپنے والد کو راضی کرنے کیلئے قربانی چڑھانے کیلئے لا کر ڈال دیا۔ چنانچہ اللہ نے ہابیل کی قربانی قبول فرمائی اور آسمان سے سفید آگ اتری اور اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا، جبکہ قابیل کی قربانی رد کر دی گئی۔ اس کے رد عمل کے طور پر ابلیس نے قابیل سے کہا "ہابیل کی نسلیں تمہاری نسلوں پر اپنی برتری جتائیں گی اور انہیں شرم دلائیں گی کہ قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی اور ہابیل کی ہو گئی "لہذا اسے قتل کر دو تا کہ اس کی نسل ہی وجود میں نہ آنے پائے۔ چنانچہ قابیل نے اپنے ماں جائے "ہابیل" کو قتل کر ڈالا۔

یہ ہے مجوسی مذہب کے ہم نواؤں کا موقف، خدا انہیں غارت کرے، جو کہ اسلامی نظریہ کے سراسر مخالف ہے جبکہ مذہب حقہ خیر البریہ کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور جسے ہمارے علماء اعلام نے اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام سے وارد ہونے والی ہر روایات سے لیا ہے اور جسے اپنانا ہر کلمہ گو کا فرض ہے۔ چنانچہ اس بارے میں چند ایک روایات کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے۔

ہمارا موقف

اس بارے میں چند ایک روایات کا تذکرہ

اول: شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" میں زرارہ سے حضرت امام جعفر صادقؑ سے بیان کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام "شیث" اور لقب "ہبۃ اللہ" تھا۔ اور روئے زمین پر انسانوں میں سے سب سے پہلے آدمی ہیں جنہیں اللہ نے آدمؑ کا وصی قرار دیا۔ ان کے بعد حضرت آدمؑ کے ہاں ایک اور فرزند پیدا ہوئے جن کا نام "یافث" ہے۔ جب دونوں سن بلوغ کو پہنچے تو اللہ نے آدمؑ کی اولاد کو بڑھانے، نسل کو پروان چڑھانے نیز بہنوں کی بھائیوں کے ساتھ شادی کو حرام قرار دینے کیلئے جمعرات کے دن عصر کے بعد ایک حور کو زمین پر بھیجا جس کا نام "نزلہ" تھا۔ اور حکم دیا کہ اس کا نکاح "شیثؑ" سے کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، پھر دوسرے دن عصر کے بعد ایک اور حور کو بھیجا جس کا نام "منزلہ" تھا اور حکم دیا کہ اس کا نکاح "یافث" سے کر دیا جائے چنانچہ اسے یافث کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور ان نکاحوں کے نتیجے میں شیث کو بیٹا اور یافث کو بیٹی عطا ہوئی۔ جب ان دونوں کی اولاد بڑی ہوئی تو اللہ نے آدمؑ کو حکم دیا کہ یافث کی بیٹی کے ساتھ شیث کے بیٹے کو بیاہ دیا جائے۔ حضرت آدمؑ نے امر الٰہی کی تکمیل کرتے ہوئے ایسا ہی کیا اور انہی سے نسل آدمؑ کا سلسلہ آگے بڑھا اور انبیاء و مرسلین علیہم السلام بھی انہی کی نسل سے دنیا میں تشریف لائے۔ خدا کی پناہ ایسے لوگوں سے جو بہن بھائیوں کا نکاح جائز ہونے کے قائل ہیں"۔

دوم: "الفقیہ" ہی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے پاس ایک حور کا بھیجا جس کا عقد آپؑ نے اپنے دو بیٹوں میں سے ایک سے کر دیا اور دوسرے کا نکاح ایک جن عورت سے کر دیا، چنانچہ اولاد آدمؑ میں جو حسن و جمال اور حسن اخلاق پایا جاتا ہے تو یہ اسی حور کی وجہ سے ہے اور جو بد صورتی اور بد اخلاقی پائی جاتی ہے تو یہ اس جن عورت کی وجہ سے ہے"۔

سوم : ابو بکر حضرمی کہتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے مجھ سے پوچھا: "لوگ حضرت آدمؑ کی اولاد کی تزویج کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا: "وہ تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت حوا کے ہر بطن سے جڑواں بچے (لڑکی اور لڑکا) پیدا ہوتے تھے، لہٰذا ایک بطن کے لڑکے کو دوسرے بطن کی لڑکی سے بیاہ دیا گیا اور سلسلہ نسل اسی طرح آگے بڑھا" امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "بات یوں نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا پھر مجوس کے مذہب کیلئے تو دلیل بن جاتی ہے اور وہ تو تمہارے سامنے یہی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ بھائی بہن کا نکاح جائز ہے! لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو فرزند عطا فرمایا جس کا نام "ہبۃ اللہ" رکھا گیا، جب وہ بڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ سے اپنی شادی کی دعا مانگی جس پر اللہ نے اس کیلئے جنت سے ایک حور بھیج دی اور اس سے ان کا نکاح کر دیا اور اس حور کے بطن سے چار بیٹے ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ایک اور بیٹا عطا فرمایا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تزویج ایک جنیہ (جن عورت) کے ساتھ کر دی۔ اور اس کے بطن سے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں، چنانچہ بڑے بیٹے کے لڑکوں اور چھوٹے کی لڑکیوں سے عقد ازدواج کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد آدمؑ میں نظر آنے والی خوبصورتی حور کے حسن کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور بد صورتی جنیہ کا شاہکار ہے۔ حلم و بردباری حضرت آدمؑ کی آدمیت کا نمونہ ہے اور حقد و کینہ جنات کی طرف سے ہے۔ اور جب نسل کی افزائش شروع ہوئی اور سلسلہ آگے بڑھا تو حور آسمان کی طرف چلی گئی"۔

چہارم : شیخ صدوقؒ اسناد کے ساتھ زرارہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ سے اولاد آدمؑ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ان کا سلسلہ کیونکر آگے بڑھا؟ کیونکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی طرف وحی کی کہ اپنے لڑکوں کا عقد اپنی بیٹیوں سے کر دیں، لہٰذا موجودہ نسل آدمؑ دراصل بہن بھائیوں کی اولاد ہے"۔ حضرت امامؑ نے یہ سن کر فرمایا: "خداوند عالم ایسی باتوں سے بلند و بالا ہے۔ اور جو شخص اس عقیدے کا حامل ہے جو تم نے بتایا ہے تو پھر وہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے برگزیدہ بندوں، پیاروں، نبیوں، رسولوں، مؤمن مردوں، مؤمن عورتوں، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں غرض سب کو حرام سے پیدا کیا۔ اور اسے حلال سے پیدا کرنے کی قدرت نہیں تھی۔ حالانکہ اس نے خود مسلمانوں سے یہ میثاق، عہد اور پیمان لیا ہے کہ اپنی اولاد کو طیب، طاہر، پاک اور حلال طریقے سے پیدا کریں، خدا کی قسم مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے (یا یہ بات بھی بیان کی گئی ہے) کہ کوئی نر جانور اپنی بہن کو نہیں جانتا تھا، اس کے ساتھ اس کی جفتی کرائی گئی۔ لیکن اسے کسی طریقے سے بعد میں معلوم ہو گیا کہ یہ تو اس کی بہن تھی تو اس نے پریشان ہو کر اپنے عضو کو کاٹ لیا اور اس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اسی طرح ایک اور جانور کے بارے میں ہے کہ اس کا ماجرا اس کی ماں سے ایسا ہی ہوا تو اس نے بھی ایسا ہی کیا اور مر گیا۔ یہ تو جانور تھے اب انسان اپنے علم و فضل کے باوجود ایسا کیونکر کر سکتا ہے؟

ہاں! البتہ ہیں کچھ لوگ ایسے جنہیں تم دیکھ رہے ہو جو ایسے عقیدے کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ کے دروازے سے علم حاصل کرنے کی بجائے وہاں سے علم حاصل کیا جہاں سے انہیں حکم نہیں ملا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تم ان کی جہالت اور گمراہی کی صورت میں دیکھ رہے ہو......"

آپؑ نے آخر میں فرمایا: "سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجوسیوں کے دلائل کو تقویت پہنچانے کیلئے ایسے نظریئے گھڑ

لئے ہیں۔ خدا انہیں غارت کرے انہیں کیا ہو گیا ہے ؟"۔

اس کے بعد آپؑ نے اولاد آدمؑ کی افزائش اور اس کی کیفیت بیان فرمائی اور بتایا کہ افزائش نسل آدم کیونکر ہوئی ؟ فرمایا : "حضرت آدمؑ کی طرف سے ان کی اہلیہ کو ستر شکم ہوئے اور ہر شکم میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ہابیل کی پیدائش ہو گئی۔ لیکن جب ہابیل کو قتل کر دیا گیا تو انہیں اس بات کا شدید دکھ ہوا اور انہوں نے گھر جانا چھوڑ دیا اور یہ سلسلہ پانچ سو سال تک جاری رہا جس کا دکھ حضرت حوا کو بھی ہوا۔ آخر کار ان حضرات سے غم کے بادل چھٹ گئے اور حضرت حوا سے اللہ تعالیٰ نے شیث عطا فرمایا جن کا اصل نام "ہبۃ اللہ" تھا اور وہ اکیلے ہی شکم مادر سے متولد ہوئے اور وہ پہلے انسان ہیں جنہیں روئے زمین پر نبی کا وصی قرار دیا گیا۔ پھر شیث کے بعد اللہ نے انہیں یافث عطا فرمایا، اور یہ بھی شیث کی مانند شکم مادر سے اکیلے ہی متولد ہوئے۔ جب دونوں بلوغ کی حد کو پہنچے اور ارادہ الٰہی اس بات کا متقاضی ہوا کہ نسل آدمؑ آگے بڑھے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور ساتھ ہی قلم تقدیر اس بات پر بھی چل جائے کہ بہن کا نکاح بھائی کیلئے حرام ہے تو اللہ تعالیٰ نے جمعرات کے دن عصر کے بعد بہشت سے ایک حور بھیجی جس کا نام "نزلہ" تھا اور اس نے یہ حکم بھی دیا کہ اس کا عقد شیث کے ساتھ کر دیا جائے............" اس سے آگے سلسلہ حدیث، سابقہ حدیث کی مانند ہے۔ ان مختلف روایات کو آپس میں اکٹھا کرنا بھی ممکن ہے، وہ یوں کہ ہو سکتا ہے کہ یافث کی دو بیویاں ہوں، ایک حور ہو اور دوسری جن۔ یا آدمؑ کی جو اولاد جن عورت سے بیاہی گئی ہے وہ ان شیث اور یافث کے علاوہ کوئی اور شیث اور یافث ہو۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت آدمؑ کی بیٹیوں کا کیا انجام ہوا ؟ اور ان کے تفصیلی حالات کیا ہیں ؟ اس بارے میں روایات خاموش ہیں۔ اس کا بہتر علم خدا کو ہے۔ (اور) ہر حالت میں اللہ تعالیٰ نے جب آدمؑ کو دنیا میں اتارا اور روئے زمین پر سلسلہ اولاد آدمؑ چل نکلا تو (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی اولاد سے انبیاء چنے، وحی پر ان سے عہد و پیمان لیا اور تبلیغ رسالت کا انہیں امین بنایا)

انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد و پیمان لیا گیا

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ سے اس بات کا عہد و پیمان لیا کہ اس کی وحی کو لوگوں تک پہنچائیں گے اور وحی میں بتائے ہوئے اصول و فروع سے لوگوں کو باخبر کریں گے۔ اور ساتھ ہی انہیں اس بات کا امین بھی بنایا کہ وہ رسالت کی تبلیغ کریں گے، شریعتوں اور احکام الٰہی کی نشر و اشاعت کریں گے، اور امت تک یہ چیزیں پہنچائیں گے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :"وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ...." (احزاب / ۷) اور اس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے تمام انبیاء سے اور (بالخصوص) آپؐ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے عہد لیا......

روایات میں اس قسم کے میثاق لینے کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ کافی اور بحار میں تفسیر عیاشی سے اسناد کے ساتھ ابو حمزہ ثمالی سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :"جب حضرت آدمؑ نے بہشت کے درخت سے اس کا پھل کھایا تو انہیں زمین پر اتار دیا گیا۔ چنانچہ یہاں پر ہابیل کی اس کی جڑواں بہن کے ساتھ پیدائش ہوئی، اور جب حضرت آدمؑ نے اپنے فرزندان ہابیل و قابیل کو اپنی اپنی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تو چونکہ ہابیل بکریوں کے مالک تھے اور قابیل کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا، لہذا

ہابیل نے ایک بہترین مینڈھا اسی مقصد کیلئے پیش کیا اور قابیل نے بے دلی کے ساتھ زراعت کے چند سوکھے سڑے خوشے رکھ دیئے۔ ہابیل کی قربانی منظور کرلی گئی اور قابیل کی قربانی رد کردی گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اسی بارے میں فرماتا ہے: "وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الآخَرِ ......" (مائدہ / ۲۷) اور اے پیغمبرؐ! آپ ان لوگوں کو آدمؑ کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنایئے کہ جب ان دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قربانی رد کردی گئی......۔

اس وقت کے دستور کے مطابق جس کی قربانی قبول ہوتی تھی اسے آگ چٹ کر جاتی تھی، چنانچہ ہابیل کی قربانی بھی اسی طرح قبول ہوئی، قابیل کی قربانی قبول نہ ہونے کی وجہ سے اس نے آگ کو خوش کرنے کیلئے ایک "آگ گھر" (آتش کدہ) بنایا اور وہ روئے زمین پر آگ گھر بنانے والا پہلا شخص ہے۔ اس نے اس مقصد کیلئے یہ گھر بنایا کہ اس کی اس وقت تک پوجاپاٹ کرتا رہے گا جب تک کہ وہ اس کی قربانی کو چٹ نہ کرجائے۔ اس کے بعد ابلیس ملعون اس کے پاس آیا اور ابلیس تو وہ ہے جو اولاد آدم کے اندر یوں چلتا ہے جس طرح رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اس نے قابیل سے کہا: "قابیل! ہابیل کی قربانی تو قبول ہوگئی اور تیری قربانی قبول نہیں ہوئی، اگر تم نے ہابیل کو زندہ رہنے دیا تو اس کی نسل بڑھے گی اور وہ تمہاری نسل پر فخر کرے گی کہ ہم تو وہ ہیں جن کے جدامجد کی قربانی قبول ہوئی اور تمہارے بڑے کی قربانی ٹھکرادی گئی۔ لہذا نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری کے مصداق، اسے قتل کردو!" چنانچہ اس نے ہابیل کو قتل کردیا۔ اور جب وہ گھر واپس گیا تو آدمؑ نے اس سے پوچھا: "قابیل! ہابیل کہاں ہے؟" اس نے کہا: "اسے قربانگاہ میں جاکر تلاش کرو!" حضرت آدمؑ وہاں سے چل دیئے اور جب قربان گاہ پہنچے تو دیکھا کہ ہابیل قتل ہوچکے تھے اس پر انہوں نے ہابیل کا خون جذب کر لینے پر زمین پر نفرین کی (۱) اور وہ ہابیل کے غم میں چالیس شبانہ روز روتے رہے۔ پھر انہوں نے اللہ سے دعا کی انہیں فرزند سے نوازے ، اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور "ہبۃ اللہ" نامی بیٹا عطا فرمایا، اس بچے کا نام اسی بنا پر "ہبۃ اللہ" رکھا گیا کہ اس نے یہ بچہ خصوصی بخشش کے تحت عطا فرمایا، اور اس کے ساتھ اس کی جڑواں بہن بھی پیدا ہوئی (۲) تو جب حضرت آدمؑ کے ایام حیات پورے ہوگئے اور مدت نبوت تکمیل کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ: "آدم! تمہاری نبوت کی مدت مکمل ہوچکی اور تمہاری زندگی کے دن پورے ہوگئے، لہذا اپنے پاس موجود علم، ایمان، اسم اعظم، علمی میراث، اور علم نبوت کے آثار اپنی آئندہ نسل کیلئے اپنے فرزند "ہبۃ اللہ" کے سپرد کردو کیونکہ میں یہ تمام چیزیں قیامت تک تمہاری نسل میں برقرار رکھوں گا اور کبھی بھی منقطع نہیں کروں گا۔ اور زمین کبھی ایسے عالم کے وجود سے خالی نہیں ہوگی جو میرے دین کی معرفت اور میری اطاعت کی پہچان کرائے گا۔ اور تمہارے اور نوحؑ کے درمیانی عرصہ میں لوگوں کو اس قسم کے عالم کی وجہ سے نجات حاصل ہوگی"۔ پھر حضرت آدمؑ نے لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کی خوشخبری دی اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ ایک نبی بھیجے گا جس کا نام نوحؑ ہے اور وہ خداوند عزوجل کی طرف لوگوں کو دعوت دے گا، لیکن قوم کے لوگ اس کی تکذیب کریں گے جنہیں خداوند عالم طوفان کی وجہ سے ہلاک کردے گا"۔

(۱) یہی وجہ ہے کہ زمین اس وقت سے لے کر آج تک کوئی خون اپنے اندر جذب نہیں کرتی۔

(۲) سابقہ روایت بیان ہوچکی ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام اکیلے پیدا ہوئے تھے جبکہ اس روایت میں ہے کہ اپنی بہن کے ساتھ پیدا ہوئے تھے، دونوں روایات کو آپس میں جمع کرنے میں تامل سے کام لیا جائے گا۔

حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس انبیاء و اوصیاء کے آباء و اجداد گزر چکے ہیں، چنانچہ حضرت آدمؑ نے آخری وقت اپنے فرزند ہبۃ اللہ کو وصیت کی کہ : "تم میں سے جس شخص کو بھی حضرت نوحؑ کی زیارت کا شرف حاصل ہو اور ان کے دوران نبوت کو پائے، ان پر ایمان ضرور لے آئے، ان کی اتباع کرے اور ان کی تمام باتوں کی تصدیق کرے۔ کیونکہ وہ ایسی صورت ہی میں طوفان میں غرق ہونے سے نجات پا سکے گا"۔

حضرت آدمؑ کی وفات

پھر حضرت آدمؑ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ہبۃ اللہ کو بھیجا کہ جائیں جبرائیل یا کسی اور فرشتے سے ملاقات کریں، انہیں میرا سلام پہنچائیں اور کہیں : "جبرائیل! میرے والد آپ سے جنت کا پھل تحفہ کے طور پر مانگ رہے ہیں"۔ حضرت جبرائیلؑ نے ہبۃ اللہ سے کہا : "ہبۃ اللہ! آپ کے والد اس دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں اور ہم ان پر نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں، لہٰذا آپ واپس لوٹ جایئے!" چنانچہ وہ واپس آگئے اور آکر دیکھا تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اور جبرائیلؑ نے انہیں آدمؑ کو غسل دینا بتایا۔ چنانچہ جب نماز جنازہ کا موقع آیا تو ہبۃ اللہ نے جبرائیلؑ سے کہا : "آپ آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے!" انہوں نے کہا : "اللہ نے ہمیں آپ کے والد آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا جبکہ وہ جنت میں تھے۔ اب ہمیں حق حاصل نہیں ہے کہ ہم ان کی اولاد کی امامت کریں" اس پر حضرت ہبۃ اللہؑ آگے بڑھے، نماز جنازہ کی امامت کرائی جبرائیلؑ اور فرشتوں کے ایک عظیم لشکر نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی اور تیس تکبیریں نماز جنازہ پڑھی گئی چنانچہ اس کے بعد جبرائیلؑ نے پچیس تکبیریں اٹھالیں اور آج تک پانچ تکبیریں رائج ہیں جبکہ اصحاب بدر پر سات اور نو تکبیریں بھی پڑھی گئیں۔

ہبۃ اللہ کو قابیل کی دھمکی

جب ہبۃ اللہ حضرت آدمؑ کو دفن کر چکے تو قابیل ان کے پاس آیا اور کہا : "ہبۃ اللہ! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بابا آدمؑ نے تمہیں ایسے علوم سے نوازا ہے جن سے مجھے نہیں نوازا، اور وہ علوم وہ تھے جن کے ذریعہ تمہارے بھائی ہابیل نے دعا مانگی تھی تو اس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اور میں نے اسے اس لئے قتل کر دیا تھا تاکہ آئندہ کیلئے اس کی نسل میری نسل پر فخر نہ کر سکے۔ لہٰذا اگر تم نے بھی اپنے والد کا وہی مخصوص علم ظاہر کیا تو میں تمہیں بھی اسی طرح قتل کر ڈالوں گا جس طرح تمہارے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا"۔

اس دھمکی کے بعد حضرت ہبۃ اللہ اور ان کی اولاد نے حضرت نوحؑ کی بعثت تک حضرت آدمؑ کے عطا کردہ علم، ایمان، اسم اعظم، میراث نبوت اور آثار علم نبوت کو چھپائے رکھا اور جب حضرت نوحؑ کی بعثت ہو گئی اور حضرت آدمؑ کی وصیت کے مطابق حضرت ہبۃ اللہ کی وصیت بھی پوری ہو گئی اور ان وصیتوں کے معیار کے مطابق حضرت نوحؑ کو نبی پایا تو ان پر ایمان بھی لے آئے، ان کی اتباع اور تصدیق بھی کی۔

حضرت آدمؑ نے ہبۃ اللہؑ کو یہ وصیت بھی کی تھی کہ وہ ہر سال اس وصیت کے ساتھ "تجدید عہد" کیا کریں اور تجدید عہد کا یہ دن اس کیلئے عید کا دن قرار پایا اور یہ سلسلہ حضرت خاتم الانبیاء محمدؐ مصطفیٰ کے دور نبوت تک جاری رہا، اور لوگوں نے حضرت نوح

کواس علم کے ذریعے پہچانا جوانہیں حضرت آدمؑ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ" (ہود / ۲۵) اور ہم نے نوحؑ کوان کی قوم کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ میں تمہیں عذاب الٰہی سے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان بہت سے انبیاء تھے جو مخفی رہے اسی لئے ان کا ذکر بھی قرآن میں مخفی ہے اور جس طرح دوسرے انبیاء کا نام لیا گیا ہے ان کا نام اسی طرح نہیں لیا گیا، جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے "وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ......" (نساء / ۱۶۴) کچھ رسول ہیں جن کے قصے ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے نہیں کیا ہے...... یعنی ان انبیاء کا نام اسی طرح واضح اور علی الاعلان نہیں لیا گیا جس طرح دوسرے انبیاء کا لیا گیا ہے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال رہ کر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا اور اس دوران میں وہ بلا شرکت غیرے نبی تھے۔ البتہ ان کی قوم کے افراد نے ان انبیاء کی تکذیب کی جو آدمؑ اور اس کے درمیان ہو گزرے تھے، چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: "كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ﹰالْمُرْسَلِیْنَ" (شعراء / ۱۰۵) نوحؑ کی قوم نے رسولوں کی تکذیب کی۔ یعنی ان رسولوں کی جو آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان تھے، اور اس سے پہلے فرماتا ہے: "وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ" (شعراء / ۱۰۴) اور یقیناً تیرا رب غالب اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت نوحؑ کی وصیت

جب حضرت نوحؑ کی نبوت کے دن پورے ہو گئے اور ایام حیات اپنے اختتام کو پہنچے تو اللہ نے انہیں وحی فرمائی کہ "نوح تمہاری نبوت کے دن پورے اور زندگی کے دن مکمل ہو چکے ہیں، لہذا تمہارے پاس جو علم، ایمان، اسم اعظم، علمی میراث اور علم نبوت کے آثار ہیں انہیں اپنی ذریت کو سونپ دو، کیونکہ میں یہ سلسلہ منقطع نہیں کرنا چاہتا جس طرح کہ انبیاء کے ان کے بیوت کو ختم نہیں کیا جو تمہارے اور آدمؑ کے درمیان تھے اور میں زمین کو ایسے عالم کے بغیر بھی نہیں رہنے دیتا جو دین کی راہنمائی کرے اور میری اطاعت کی پہچان کرائے۔ اور نجات اسے ملے گی جو ایک نبی سے دوسرے نبی کے عرصہ نبوت کے درمیان انہی گھروں میں پیدا ہوگا"۔

حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے "سام" کو حضرت "ہودؑ" کے آنے کی خوشخبری دی اور نوحؑ اور ہودؑ کے درمیان بھی اور بہت سے انبیاء گزرے ہیں، حضرت نوحؑ نے اپنی وصیت میں فرمایا: "اللہ تعالیٰ ایک نبی بھیجے گا جس کا نام "ہودؑ" ہوگا، وہ اپنی قوم کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی طرف بلائے گا لیکن اس کی قوم اسے جھٹلائے گی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس قسم کو ہوا کے ذریعہ ہلاک کردے گا، لہذا تم میں سے جو بھی اس کو پائے اس پر ایمان بھی لے آئے اور اس کی پیروی بھی کرے اس وجہ سے خدا اسے ہوا کے عذاب سے محفوظ رکھے گا"۔

حضرت نوحؑ نے سام کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ہر سال اس وصیت کے ساتھ تجدید عہد کیا کریں اور تجدید عہد کے دن کو عید

قرار دیا کریں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس پر حضرت ہودؑ کی بعثت تک عمل کرتے رہے، جب وہ تشریف لے آئے تو حسب وصیت ان پر ایمان لے آئے، ان کی اتباع کی اور ان کے قول کی تصدیق کی اور عذاب خداوندی سے بچ گئے۔ اسی سلسلے میں خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا" (اعراف / ۶۵۔ ہود / ۵۰) اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ نیز فرماتا ہے: "کَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ" (شعراء / ۱۲۳۔ ۱۲۴) اور قوم عاد نے بھی مرسلین کی تکذیب کی۔ جب ان کے بھائی ہودؑ نے کہا کہ تم خدا سے کیوں نہیں ڈرتے؟ اور فرماتا ہے "وَوَصّٰی بِهَا اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ....." (بقرہ / ۱۳۲) اور اسی بات کی ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو وصیت کی......وغیرہ۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں انہوں نے اپنی اولاد اور ذریت کو ابراہیمؑ کے بارے میں تاکیدی وصیت کی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اور جناب ہودؑ کے درمیان بھی کئی انبیاء گزرے ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے: "وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ ......" (ہود / ۸۹) اور قوم لوط تم سے زیادہ دور نہیں گزری۔ اور ارشاد ہوتا ہے: "فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ" (عنکبوت / ۲۶) پھر لوط، ابراہیمؑ پر ایمان لے آئے اور کہا میں تو اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں......۔ اسی طرح قول خداوندی ہے: "وَ اِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ ......" (عنکبوت / ۱۶) اور ابراہیمؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ خدا کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرتے رہو، یہی چیز تمہارے لئے بہتر ہے۔ چنانچہ ان ہر دو انبیاء کے درمیان آٹھ، نو یا دس نبی ہو گزرے ہیں اور ہر ایک پیغمبر کے ساتھ وہی کچھ کیا گیا جو نوحؑ کے ساتھ کیا گیا یا جو آدمؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ، اور ابراہیم علیہم السلام کو درپیش آیا۔

﴿سلسلہ نبوت آگے بڑھتا ہے﴾

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا یہاں تک کہ نوبت حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام تک آن پہنچی، ان کے بعد اسباط کی باری آئی اور نبوت کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تک آن پہنچا۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان کئی انبیاء ہو گزرے ہیں۔ اور اللہ نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، لیکن سلسلہ نبوت ان کے بعد بھی جاری رہا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ ......" (مؤمنون / ۴۴) اس کے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیجے اور جب کسی امت کے پاس کوئی رسول آیا تو اس نے اس کی تکذیب کی اور ہم نے بھی سب کو عذاب کی منزل میں ایک دوسرے کے پیچھے لگا دیا اور سب کو ایک افسانہ بنا کر چھوڑ دیا......۔

بنی اسرائیل کا انبیاء کے ساتھ سلوک

بنی اسرائیل نے انبیاء کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ بعض اوقات دو آدمی کھڑے ہو کر ایک نبی کو قتل کر دیتے تھے یا دو دو اور چار چار کو حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ہی دن میں ستر انبیاء کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔ اور قتل کا یہ سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہتا۔

گزشتہ انبیاء کی خاتم النبیینؐ کے بارے میں خوشخبری

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل ہوئی تو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں

خوشخبری دی اور حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان بھی کئی انبیاء ہو گزرے ہیں جبکہ حضرت موسیٰ کے وصی حضرت یوشع بن نونؑ ہیں اور یہ وہی نوجوان ہیں جن کا تذکرہ خدا نے قرآن میں کیا ہے۔

چنانچہ تمام انبیاء یکے بعد دیگرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی خوشخبری دیتے آئے یہاں تک کہ خداوند عالم نے حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے بھی آنجنابؐ کے بارے میں خوشخبری دی، چنانچہ جناب عیسیٰؑ کی زبانی ارشاد خداوندی ہے "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ أَحْمَدُ ......"(صف / ۶) اور اپنے بعد کیلئے ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمدؐ ہے......۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں خداوند عالم فرماتا ہے: "اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ......"(اعراف / ۱۵۷) جس نبی کا ذکر وہ یہود و نصاریٰ اپنے پاس توریت وانجیل میں (محمدؐ کی صفات کی صورت میں) لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ (محمدؐ) نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں......۔ حضرت موسیٰ اور جناب عیسیٰ علیہما السلام نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی اسی طرح پیش گوئی فرمائی ہے جس طرح دوسرے تمام انبیاء ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ آنحضرتؐ کی تشریف آوری تک جاری رہا۔

خاتم الانبیاءؐ کو وصیت اور امانت سپاری کا حکم

جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت مکمل اور ایام حیات پورے ہو گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی: "محمدؐ تمہاری نبوت مکمل اور ایام حیات پورے ہو گئے ہیں، لہذا تمہارے پاس جو علم، ایمان، اسم اعظم، میراث علم اور آثار علم نبوت ہیں وہ اپنے اہل بیت کے فرد علی بن ابی طالبؑ کے سپرد کر دو، کیونکہ یہ چیزیں میں آپؐ کی اولاد اور ذریت سے منقطع نہیں کرنا چاہتا، جیسا کہ اس سے پہلے انبیاء کے اہل بیت سے منقطع نہیں کیا جو انبیاء آپ کے اور آدم کے درمیان تھے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ" (آل عمران / ۳۳) یقیناً اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں میں برگزیدہ فرمایا یہ ایک نسل ہے جس میں ایک کا سلسلہ ایک سے ہے، اور اللہ سب کی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "فَقَدْ اٰتَيْنَا اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا" (نساء / ۵۴) ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم سب کچھ عطا کیا ہے۔ یہاں پر کتاب سے مراد نبوت، حکمت سے مراد صاحبان حکمت اور برگزیدہ انبیاء ہیں اور ملک عظیم سے مراد برگزیدہ ائمہ ہیں۔ اور ان سب کا تعلق "ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" سے ہے......

اور حجت آل ابراہیمؑ کے ساتھ ہے اور وہ بروز قیامت اس پر قائم ہوں گے اور حجت سے مراد انبیاء اور اہل بیت ہیں جن کے بارے میں ارشاد قدرت ہوتا ہے: "فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ......"(نور / ۳۶) ان گھروں میں جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی بلندی کا اعتراف کیا جائے......۔ اور یہ، انبیاء ورسل، حکماء اور ائمہ ہدیٰ کے گھر ہیں لہذا جو ان گھروں سے حقیقی

رابطہ رکھے گا اور ائمہ ہدیٰ کی اتباع کرے گا وہ نجات پا جائے گا، جیسا کہ سابقہ ادوار میں انبیاءؑ ورسل کی اتباع کرنے والے نجات پا گئے،
چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "......وَ نُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ وَ مِنْ اٰبَائِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (انعام / ۸۴ تا ۸۷)......اور اس سے پہلے تو نوحؑ کو ہدایت دی اور پھر ابراہیمؑ کی اولاد میں داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ قرار دیئے اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنیوالوں کو جزا دیتے ہیں۔ اور زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو بھی رکھا، جو سب کے سب نیک کرداروں میں تھے۔ اور اسماعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ بھی بنائے اور سب کو عالمین سے افضل و بہتر بنایا۔ اور پھر ان کے باپ، دادا، اولاد اور برادری میں سے اور خود انہیں بھی منتخب کیا اور سب کو سیدھے راستے کی ہدایت کر دی۔ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۤءِ فَقَدْ وَ كَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ" (انعام / ۸۹) یہی وہ افراد ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی ہے اب اگر یہ لوگ ان باتوں کا بھی انکار کرتے ہیں تو ہم ان باتوں کا ذمہ دار ایک ایسی قوم کو بنایا ہے جو انکار کرنے والی نہیں ہے۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں فضل کی ذمہ داری اہل بیتؑ، برادری اور اولاد کو سونپی گئی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
"اگر آپؐ کی امت ان باتوں کا انکار کرتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم نے آپؐ کے اہل بیت کو سونپ دی ہے جو کبھی انکار نہیں کریں گے"......

قول مؤلف: مذکورہ بالا روایت میں سمجھدار اور باشعور انسان کیلئے بہت سے باریک نکتے، اہم ترین اسرار و مطالب اور عظیم مسائل کا حل موجود ہے۔ اس میں جس قدر زیادہ غور و خوض کیا جائے گا اتنا زیادہ راز کھلتے جائیں گے اور اہم مسائل حل ہوتے جائیں گے۔ اور معارف کے رموز اور انوار کے حقائق تک پہنچنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ البتہ یہ اس شخص کیلئے ہے جس کا دل اللہ نے نور ایمان و عرفان کے ساتھ آزمایا ہے اور اس کا ذہن شکوک و شبہات کی کدورتوں اور وہم و گمان کی تاریکیوں سے پاک صاف رکھا ہے اور یہ خدا کا فضل و کرم ہے جسے چاہے عطا کر دے اس لئے کہ وہ فضل عظیم کا مالک ہے۔

عالم ذر کی باتیں

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں کہ "اللہ نے......انبیاء چنے، وحی پر ان سے عہد و پیمان لیا اور تبلیغ رسالت کا انہیں امین بنایا (جبکہ اکثر لوگوں نے اللہ کا عہد بدل دیا تھا) یعنی جبکہ اکثر لوگوں نے اللہ کے اس عہد و میثاق کو بدل دیا تھا جو ان سے توحید، معرفت، نبوت، اور ولایت کے بارے میں لیا گیا تھا۔ اس بات کی تائید آیہ شریفہ اور احادیث متواترہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۔ اَوْتَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا

فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ "(اعراف ۱۷۲۔ ۱۷۳)اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرزندان آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنا کر سوال کیا کہ میں تمہارا خدا نہیں ہوں ؟ تو سب نے کہا کہ بے شک ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ عہد اس لئے تھا کہ بروز قیامت یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس عہد سے غافل تھے۔یا یہ کہہ دو کہ ہم سے پہلے ہمارے بزرگوں نے شرک کیا تھا اور ہم صرف ان کی اولاد میں تھے۔ تو کیا اہل باطل کے افعال کی بنا پر ہم کو ہلاک کردے گا ؟

اکثر مفسرین و محدثین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی صلب سے ان کی ذریت کو باریک باریک چیونٹیوں (ذر) کی صورت میں نکالا اور انہیں آدمؑ کے سامنے پیش کر کے فرمایا :"میں تمہاری ذریت سے میثاق لینے والا ہوں کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ان کے رزق وروزی کی ذمہ داری مجھ پر ہے "پھر فرمایا :"کیا میں تمہارا رب (پروردگار) نہیں ہوں ؟"تو سب نے کہا :"کیوں نہیں ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے "اللہ نے اسی پر ملائکہ سے فرمایا :"گواہ رہو! "انہوں نے کہا کہ :"ہم گواہ ہیں!"

ایک اور قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل و فہم عطا کی اور انہوں نے خداوند عالم کے خطاب کو سنا بھی اور سمجھا بھی۔ اس کے بعد اللہ نے انہیں آدم کی صلب میں واپس لوٹا دیا، تمام اولاد پشت آدمؑ میں محبوس چلے آئے اور ہر ایک اپنے اپنے وقت کے مطابق وہاں سے باہر آتا گیا، اور ان میں سے جو بھی اسلام پر ثابت قدم رہا وہ اپنی فطرت اولیٰ پر قائم رہا اور جس نے کفر وانکار کیا وہ فطرت اولیٰ میں تبدیلی کا مرتکب ہوا۔

لیکن محققین نے اس تفسیر کو کئی وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا ہے (۱) اور وہ تقریباً دس سے زیادہ وجوہات ہیں۔ان میں سے ایک شریف سید مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس نظریئے کو مسترد کیا ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب "الغُرَرُ و الدُّرَرُ "میں اس آیت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :"بعض بے بصیرت اور لاشعور افراد کا یہ گمان ہے کہ اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے ان کی تمام ذریت کو "ذر" (چھوٹی چھوٹی باریک چیونٹیوں) کی صورت میں باہر نکالا اور ان سے اپنی معرفت کا اقرار لیا اور انہیں اس بات پر گواہ بھی ٹھہرایا، حالانکہ یہ ایسی بودی تاویل ہے جسے عقل صرف قبول ہی نہیں کرتی محال بھی قرار دیتی ہے، کیونکہ ظاہر قرآن اس کے خلاف شہادت دیتا ہے، اس لئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے "اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ "یعنی یہاں پر "آدم" نہیں "بنی آدم" کہا گیا ہے۔ پھر "مِنْ ظُهُوْرِهِمْ "کہا ہے "مِنْ ظَهْرِهٖ "نہیں کہا، اسی طرح "ذُرِّيَّتَهُمْ "فرمایا ہے، "ذُرِّيَّتَهٗ" نہیں فرمایا۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خبر بھی دی ہے کہ اس نے یہ اس لئے کیا ہے تاکہ کل بروز قیامت یہ نہ کہیں کہ وہ اس بات سے غافل تھے یا وہ یہ عذر پیش کریں کہ شرک تو ان کے آباواجداد نے کیا تھا اس میں بذات خود ان کا تو کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ وہ تو انہی کے بتائے ہوئے رستوں پر گامزن چلے آرہے ہیں۔اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ آیت تمام اولاد آدم کو ان کے آدم کی صلب میں موجودگی کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ ان لوگوں کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے جن کے آباواجداد مشرک

(۱) بعض وجوہات تو وہ ہیں جو اس آیت کی ظاہری تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اور بعض اصل قضیہ ہی کو محال قرار دیتی ہیں جیسا کہ آگے چل کر سید مرتضیٰؒ کے کلام سے ظاہر ہوگا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں تقریباً بارہ وجوہات بیان کی ہیں۔

تھے۔ جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آیت تمام اولاد آدم سے متعلق نہیں بلکہ بعض سے اس کا تعلق ہے اور یہ ایک ایسی ظاہری شہادت ہے جوان لوگوں کی تاویل کو باطل قرار دیتی ہے"۔

"باقی رہا عقلی لحاظ سے اس کا محال ہونا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جو ذریت آدمؑ کی پشت سے باہر نکالی گئی اور اس سے اقرار لیا گیا، یا تو وہ کامل العقل اور تمام شرائط کی حامل ہوگی یا نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیق اور پیدائش کے بعد بھی اسی طرح کامل العقل ہو جس طرح بوقت اقرار و شہادت تھی۔ اس لئے کہ عقلمند کو اس طرح کے اہم واقعات کبھی نہیں بھولتے خواہ کتنا زیادہ عرصہ ہی کیوں نہ گزر چکا ہو۔ اور وہ ہر دور اور ہر مکان میں عاقل کامل ہی ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے اس وقت کسی انسان کو کچھ بھی یاد نہیں ہے اور وہ سب کچھ بھلا چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی نہیں ہو سکتی کہ چونکہ زمانہ "الست" کے اور اس دور کے درمیان موت واقع ہوئی ہے لہذا اس کا یہ اثر ہے کہ اس سے وہ سب کچھ بھول گئے ہیں کیونکہ اگر موت ایسا کر سکتی تو پھر نیند، دیوانگی اور بے ہوشی بھی تو موت سے ملتی جلتی صورتیں ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتیں کہ عقلا سے ان کی یادداشت سلب کرلیں۔ اسی طرح یہ دلیل بھی نہیں دی جا سکتی کہ "جس طرح بچپن کی باتیں بھول جاتی ہیں اسی طرح یہ عہد و پیمان بھی بھول گئے ہیں"۔ اس لئے کہ انہوں نے اوائل میں یہی کہا ہے کہ جب انہیں پشت آدم سے نکالا گیا تو انہیں مکمل طور پر کامل العقل اور باشعور بنا کر ان سے اقرار لیا گیا، جبکہ بچپن کی حالت کمال عقل کی حالت نہیں ہوتی۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بھلا دینے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر آیت میں بیان کردہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آیت یہ بتاتی ہے کہ اللہ نے ان سے اقرار لیا اور اس پر گواہ ٹھہرائے تاکہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم اس بات سے غافل تھے لہذا حجت ان پر تمام ہو جائے گی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ یہاں آکر سب کچھ بھلا گئے تو پھر حجت ان سے ساقط ہو جائے گی اور وہ بروز قیامت اس کے جواب دہ نہیں ہوں گے۔ اگر وہ کامل العقل اور تمام شرائط کی حامل نہیں تھی تو پھر ایسی حالت میں خدا کا اس سے مخاطب ہونا، اس سے اقرار لینا اور اس پر گواہ ٹھہرانا سب کچھ عبث اور فضول ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کوئی عبث اور فضول کام نہیں کرتا"۔

ایک سوال اور اس کا جواب

سید مرتضیٰؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آپ نے مخالفین کی تاویل کو تو رد کر دیا، آپ کے پاس اس کی صحیح تاویل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں دو وجوہات پائی جاتی ہیں۔ یعنی اس کا دو طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے۔

ایک جواب تو یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ذریت سے ایک خاص قسم کی مخلوق مراد لی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا اور بالغ و عاقل قرار دیا اور پھر اپنے پیغمبروں کی زبانی ان سے اپنی معرفت اور دیگر واجبات کا اقرار لیا اور اس پر ان انبیاء کو گواہ ٹھہرایا تاکہ قیامت کے دن وہ یہ نہ کہہ سکیں ہم اس بات سے غافل تھے یا ہمارے آباؤ اجداد مشرک تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے جو پہلے سے زیادہ بہتر ہے وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو خلق فرمایا تو ان کی ترکیب کچھ اس طرح

کی جو اس کی معرفت، قدرت کی شہادت اور وجوب عبادت پر مشتمل تھی، اور ان کو رو نما ہونے والی عبر تیں، نصیحتیں، آیات اور دلائل کا مشاہدہ بھی کرایا، ان کی اپنی ذات میں بھی اور دوسروں میں بھی، اور یہ انداز ایسا تھا کہ گویا وہ اس پر گواہ بھی بن گئے اور ان میں مشاہدہ، خدا کی معرفت اور ان تمام امور کی صلاحیت پیدا ہو گئی جو خدا چاہتا تھا، اور اتمام حجت اور عذر خواہی کی بھی کوئی صورت ان کے پاس باقی نہ رہی، اور گویا یہ ان کا اعتراف اور اقرار تھا اور گواہی تھی۔ اگر چہ ظاہر میں ایسا کوئی عمل و قوع پذیر نہیں ہوا............اسی آخری جواب کے ساتھ جاراللہ زمخشری نے اپنی تفسیر "الکشاف" میں اور دیگر مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں اتفاق کیا ہے۔

قول مؤلف : سید مرتضیٰؒ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ تاویل کرنے والوں کی تاویل ظاہر آیت سے مطابقت نہیں رکھتی کہ ذریت آدمؑ کو ان کی پشت سے نکال کر اور چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی صورت دے کر ان سے اقرار و اعتراف لیا گیا اور گواہ ٹھہرائے گئے۔ یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے۔ لیکن انہوں نے خود جو دو جواب پیش کئے ہیں ان پر بھی اسی قسم کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ان جوابات میں آیت کے ظاہر کے ساتھ اس تاویل کی نسبت زیادہ مخالفت پائی جاتی ہے۔ اور پھر یہ ان میں سے کسی ایک جواب میں بھی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

سید مرتضیٰؒ اور دیگر مفسرین نے عقلی دلائل کے ساتھ اگر اصل قضیہ کا انکار کیا ہے اور اس پر محال ہونے کا حکم لگایا ہے تو یہ بات اس لئے نا قابل قبول ہے، کیونکہ متواتر اور مفید احادیث کے ہوتے ہوئے ان دلائل کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی اور نہ ہی یہ دلائل قابل اعتنا سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں اس قدر تواتر کے ساتھ احادیث موجود ہیں کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے۔ البتہ ہم یہاں پر تبرکاً چند ایک احادیث کو ذکر کرتے ہیں تاکہ وضاحت بھی ہو جائے اور ہمارے قول پر مر صداقت بھی لگ جائے۔ چنانچہ ؛

۱۔ علی بن ابراہیم قمیؒ نے اپنی تفسیر میں ابن مسکان سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے قرآن مجید کی اس آیت "وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ ....قَالُوْا بَلٰی ...." تک کی تفسیر فرمائی، میں نے عرض کیا : "آیا یہ بات بالعیان اور ظاہر میں ہوئی ؟" آپؑ نے فرمایا : "ہاں! اس طرح سے معرفت ثابت ہو گئی لیکن لوگوں نے اپنے اس موقف کو فراموش کر دیا جسے وہ عنقریب یاد کریں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کا خالق و رازق کون ہے ؟ البتہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے جنہوں نے عالم ذر میں اپنی زبان سے تو اقرار کیا تھا لیکن دل سے اقرار نہیں کیا تھا۔ اسی لئے خدا نے فرمایا "فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِهٖ بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ......" (یونس / ۴۷) وہ لوگ پہلے کے انکار کرنے کی بنا پر ان کی تصدیق نہ کر سکے۔

۲۔ ایضاً۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ : "ان سے خداوند تعالیٰ کی ربوبیت پیغمبر خداؐ کی نبوت اور امیر المومنین علیؑ اور اولاد علیؑ سے ائمہ اطہارؑ کی امامت کا یثاق لیا گیا، اللہ نے فرمایا : "کیا میں تمہارا رب، محمدؐ تمہارے نبی، علیؑ تمہارے امام اور ائمہ ہدیٰ تمہارے امام نہیں ہیں ؟" تو سب نے کہا : "کیوں نہیں! ضرور ہیں!!"

۳۔ بحار الانوار میں امالی شیخ مفیدؒ سے اسناد کے ساتھ جابر بن عبد اللہ سے روایت کی گئی ہے وہ امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں اور امامؑ اپنے آباؤ اجداد سے کہ : "حضرت رسول خداؐ نے علی ابن ابی طالبؑ سے فرمایا : "یا علیؑ! اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے ابتدائے

تخلیق ہی میں لوگوں پر حجت قائم کر دی ہے اور وہ یوں کہ انہیں ڈھانچوں کی صورت میں قائم کر کے کہا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" توانہوں نے جواب میں کہا: "ضرور ہے!" پھر فرمایا: "اور محمدؐ رسول اللہ نہیں؟" توانہوں نے کہا: "ضرور ہیں!" اور پوچھا کہ: "علیؑ امیر المؤمنین نہیں؟" تو بہت سے لوگوں نے غرور و تکبر کی بنا پر تمہاری ولایت کا انکار کر دیا، لیکن بہت تھوڑے لوگوں نے اس کا اقرار کیا، جن کی تعداد نہایت ہی قلیل ہے، لیکن وہ لوگ ہیں "اصحاب الیمین"۔

۴۔ ایضاً۔ بصائر الدرجات سے نقل کیا گیا ہے کہ اسناد کے ساتھ عبد الرحمان بن کثیر نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے قرآن مجید کی اس آیت: "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ......" کی تفسیر نقل کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی پشت سے قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کو ذر (چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں) کی صورت میں باہر نکالا، پھر انہیں اپنی ذات کا تعارف کرایا، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی اپنے رب کو نہ پہچانتا، اللہ نے فرمایا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو سب نے کہا: "ہاں ہے!" اسی طرح محمدؐ رسول اللہ اور علی امیر المومنینؑ کے بارے میں بھی پوچھا!"

۵۔ ایضاً۔ کشف الغمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حسن بن حسین انصاری اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت علیؑ کا نام "امیر المؤمنین" کب رکھا گیا ہے، تو کوئی بھی شخص ان کے حق کا انکار نہ کرتا!" امامؑ سے پوچھا گیا کہ: "کب رکھا گیا؟" تو آپؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ...... قَالُوْا بَلٰی" امامؑ نے فرمایا: "اللہ کی ربوبیت کا، محمدؐ کی نبوت کا اور علیؑ کے امیر المؤمنین ہونے کا اقرار لیا گیا"۔

۶۔ ایضاً۔ تفسیر فرات سے منقول ہے کہ ؛اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس آیت: "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ......" کے بارے میں ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے قیامت تک پیدا ہونے والی ذریت کو ذرّ (چھوٹی چیونٹیوں) کی صورت میں باہر نکالا اور انہیں اپنی ذات کا تعارف کرایا، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی اپنے رب کی معرفت حاصل نہ کر پاتا۔ اللہ نے فرمایا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو سب نے کہا: "ضرور ہے!" پھر فرمایا: "تو محمدؐ میرے بندے اور رسول اور علیؑ امیر المؤمنین میرے خلیفہ اور امین ہیں!" اسی لئے پیغمبر نے فرمایا ہے کہ: "ہر پیدا ہونے والے شخص کی ولادت اس بات کی معرفت پر ہوتی ہے کہ اللہ اس کا خالق ہے" اسی لئے تو خدا فرماتا ہے: "وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ......" (زخرف / ۸۷) اگر آپ ان سے سوال کریں کہ خود ان کا خالق کون ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ......۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اخبار و روایات ہیں جنہیں علامہ مجلسیؒ نے اپنی کتاب بحار الانوار جلد امامت میں ایک مستقل باب کی صورت میں تحریر کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ وہ عہد جو اللہ نے اپنی مخلوق سے لیا اور مخلوق نے بدل ڈالا وہی یثاق ہے جو اللہ نے ان سے اپنی ربوبیت، اپنے رسول حضرت محمدؐ کی رسالت اور ائمہ اطہار کی ولایت کا عہد تھا۔

حق سے کیا مراد ہے؟

اسی طرح حضرت امیر المؤمنینؑ کا یہ فرمان ہے کہ (چنانچہ وہ اس کے حق سے بے خبر ہو گئے) تو اس سے مراد وہ حق ہے جو

اللہ نے اپنے بندوں پر توحید اور اس کی معرفت کی صورت میں ان پر لازم قرار دیا ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل کی روایت اس بات کی شاہد ہے، جو اسی خطبہ کی چوتھی فصل میں بیان ہو چکی ہے کہ وہ کہتے ہیں: "میں سرکار رسالتؐ کے ہمرکاب تھا کہ آپؐ نے فرمایا: "معاذ! جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟" آپؐ نے یہ سوال تین مرتبہ دہرایا، تو میں نے عرض کیا: "خدا اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں!" تو آپؐ نے فرمایا: "خداوند عزوجل کا بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں...... "آخر حدیث تک جو کہ گزر چکی ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد عمومی حقوق ہوں، جو مذکور ہو چکے ہیں وہ اور دیگر فروعات بھی۔ چنانچہ اس کی طرف آئندہ کا تیسرا جملہ اشارہ کر رہا ہے، جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (اوروں کو اس کا شریک بنا ڈالا، شیاطین نے اس کی معرفت سے انہیں روگردان اور اس کی عبادت سے الگ کر ڈالا) پس شیاطین خدا کے عبادت گزار بندوں کی عبادت کیلئے راہزن اور ڈاکو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(پس) جب صورت حال یہ ہوگئی تو (اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کئے اور لگاتار انبیاء بھیجے) یعنی متواتر انبیاء اور رُسُل کی بعثت کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ دو انبیاء کے درمیان فترت (نبی کے نہ آنے) کا عرصہ بھی ہوتا تھا، جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے: "ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ فَبُعْدًا لِقَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ "(مؤمنون / ۴۴) اس کے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیجے اور جب کسی امت کے پاس کوئی رسول آیا تو اس نے رسول کی تکذیب کی اور ہم نے بھی سب کو ہلاکت کی منزل میں ایک کے پیچھے ایک لگا دیا اور سب کو ایک افسانہ بنا کر چھوڑ دیا کہ ہلاکت اس قوم کیلئے ہے جو ایمان نہیں لاتی۔ چنانچہ مفسر طبرسیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد متواتر اور لگاتار اور ایک کے پیچھے دوسرا ہے۔ ابن عباس اور مجاہد کہتے ہیں کہ ان کی بعثت کے ادوار نزدیک نزدیک تھے۔ (تا کہ ان سے فطرت کے عہد و پیان پورے کرائیں) اس جملے سے لے کر "اور انہیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں" تک کے تمام جملے انبیاء و رُسُل کی بعثت اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی طرف اشارہ ہیں۔ اور وہ پانچ جملے ہیں۔

فطرت الٰہیہ سے کیا مراد ہے؟

اور میثاق فطرت سے مراد وہی میثاق توحید، نبوت اور امامت وولایت ہے۔ اس بات کی شاہد:

۱۔ شیخ صدوقؒ کی وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "التوحید" میں عبدالرحمٰن بن کثیر (غلام امام محمد باقرؑ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اللہ تعالیٰ کے اس قول "فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (روم / ۳۰) (یہ دین وہ) فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ کے بارے میں فرمایا: "اس سے مراد توحید، محمدؐ رسول اللہ اور علی امیر المومنین ہیں"۔

۲۔ ابن مسکان زرارہ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا: "خدا آپ کا بھلا کرے قرآن مجید میں خداوند عالم کے اس قول "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (روم / ۳۰) میں فطرت

الٰہی سے کیا مراد ہے؟" تو امامؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو توحید پر پیدا کیا جب ان سے میثاق لیا کہ اس بات کی معرفت حاصل کرلیں کہ وہ ان کا رب ہے" میں نے پھر امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: "آیا ان لوگوں نے خدا کو مخاطب بھی کیا؟" امامؑ نے تھوڑی دیر سر جھکانے کے بعد فرمایا: "اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں کیا معلوم ہوتا کہ کون ان کا رب ہے اور کون ان کا رازق ہے"۔

۳۔ عبداللہ بن سنان روایت کرتے ہیں کہ: میں نے امام جعفر صادقؑ سے اللہ کے اس قول: "فِطْرَتَ اللّٰهِ......" کے بارے میں سوال کیا کہ "فطرت سے کیا مراد ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "اس سے مراد اسلام ہے، اللہ تعالیٰ نے جب لوگوں کو پیدا کیا تو ان سے توحید کا عہد و میثاق لیا اور فرمایا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو کچھ ان میں سے مومن ہوئے اور کچھ کافر"۔

نعمت سے کیا مراد ہے؟

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: (تاکہ ...... ان کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں) یہاں پر نعمت سے مراد یا تو وہ نعمت ہے جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم ذر میں اپنے بندوں کو اس نعمت سے نوازا اور اس کا اقرار لیا جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے یا پھر اس سے مراد عمومی نعمتیں ہیں جو بندے بھلا چکے ہیں، لیکن بظاہر بہتر وہی پہلا قول ہے کیونکہ لفظ "نسیان" سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، امیر المومنینؑ فرماتے ہیں (اور پیغام ربانی پہنچا کر ان پر اپنی حجت تمام کریں) یعنی احکام الٰہیہ کی تبلیغ، شریعت اور دین کی نشرو اشاعت کر کے قیامت کے دن ان پر اپنی حجت تمام کریں گے۔ اس لئے کہ "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ......" (انفال / ۴۲) "......لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا" (نساء / ۱۶۵) تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل کے ساتھ اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے ساتھ ...... اور ...... تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے، اور خدا سب پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔

(اور ان کیلئے عقل کے دفینوں کو ابھاریں) یعنی انہیں توحید کے شواہد اور ربوبیت کے دلائل پیش کر کے قانع کریں۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ" (بقرہ / ۱۶۴) بے شک زمین و آسمان کی خلقت، روز و شب کی رفت و آمد، ان کشتیوں میں جو دریاؤں میں لوگوں کے فائدے کیلئے چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے خدا نے آسمان سے نازل کر کے اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ کر دیا اور اس میں طرح طرح کے چوپائے پھیلا دئے ہیں اور ہواؤں کے چلانے میں اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر کئے جانے والے بادل میں صاحبان عقل کیلئے اللہ کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

(اور انہیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں) یعنی انہیں قدرت کی نشانیاں اور شواہد دکھائے تاکہ وہ ان کی طرف غور سے دیکھیں اور عبرت حاصل کریں، وگرنہ مذکورہ علامتیں تو ہر ایک کو نظر بھی آرہی ہیں اور سنائی بھی دے رہی ہیں انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

قدرت الٰہی کی چھ آیات

اس کے ساتھ ہی امیر المؤمنینؑ ان آیات میں سے چھ آیتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور ساتھ ہی انہیں ذکر بھی کیا ہے ۔چنانچہ فرماتے ہیں (یہ سروں پر بلند بام آسمان اور ان کے نیچے بچھا ہوا فرش زمین) جیسا کہ ارشاد خداوندی بھی ہے :" وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ "(طور / ۵)اور بلند چھت (آسمان) کی قسم ۔ اور فرماتا ہے :" اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ....وَ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا "(نباء / ٦ ـ ١٢) کیا ہم نے زمین کا فرش نہیں بچھایا۔اور پہاڑوں کی میخیں نہیں نصب کی ہیں۔اور ہم نے تم کو جوڑا نہیں بنایا،اور تمہاری نیند کو رات کا سامان قرار دیا ہے ۔اور رات کو پردہ پوش بنایا ہے ۔اور دن کو وقت معاش قرار دیا ہے۔اور تمہارے سروں پر سات مضبوط آسمان بنائے ہیں۔

اس خطبے کی آٹھویں فصل میں اس بارے میں وہ باتیں بیان ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ بصیرت میں اضافے کا موجب ہوگا۔ پھر فرماتے ہیں (اور زندہ رکھنے والا سامان معیشت ، فنا کرنے والی اجلیں اور بوڑھا کر دینے والی بیماریاں) زندہ رکھنے والے سامان معیشت سے مراد کھانے پینے والی چیزیں ہیں کہ زندگی کا جن پر دارومدار ہے ۔اور زندہ رکھنے کی نسبت معیشت کی طرف ، فنا کی اجل کی طرف اور بڑھاپے کی بیماریوں کی طرف ،اسنادالی سبب کی قسم سے ہے اور مجازی نسبت ہے (اور پے در پے آنے والے حادثات) یعنی نت نئی مصیبتیں اور روزانہ جدید حوادث ۔ اور مذکورہ چھ آیات میں سے ہر ایک میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا موجود ہے جو اس بات پر قدرت رکھتا ہے جو چاہے کرے جو چاہے حکم جاری کرے ،نہ تو اس کے فیصلے کو کوئی ٹال سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بلاؤں کو کوئی روک سکتا ہے۔

پندرھویں فصل

نبی اور رسول میں فرق

وَ لَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ اَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ اَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ اَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ رُسُلٌ لَا يُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ وَ لَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ اَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ.

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر یا آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا ایسے رسول جنہیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت درماندہ وعاجز نہیں کرتی تھی ،ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام و نشان بتایا، کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا۔

تشریح

لفظ "نبی" بروزن "فعیل" بمعنی فاعل ہے اور "نَبَاء" سے مشتق ہے۔جس کے معنی خبر کے ہیں، الفاظ "نَبَاء" اور "اَنْبَاء" تمام کے ایک ہی معنی ہیں یعنی "اَخْبَرَ" (اس نے خبر دی) لہٰذا "نَبِي" وہ ہوتا ہے جو خداوندعالم کی طرف سے خبریں دے۔ "نَبِيء" کے ہمزہ کو "یا" میں تبدیل کر کے دونوں کو آپس میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ

"ذُرِّيَّة" کے ہمزہ کو "یا" میں تبدیل کر کے دونوں "یا" کو آپس میں ادغام کر دیا گیا ہے۔

صاحب "شرح مقاصد" کہتے ہیں کہ "نُبُوَّۃ" کے معنی ہیں "انسان کا حق کی طرف سے خلق خدا کی طرف مبعوث ہو تا ہے "اگر لفظ "نَبِي" کو "نَبَاوَة" سے اخذ کیا جائے جس کے معنی ہیں "بلندی" اس لئے کہ نبی کی شان بلند اور مرتبہ و مقام عالی ہو تا ہے اور اگر اسے "نَبِي" سے اخذ کیا جائے جس کے معنی ہیں "راستہ" اس لئے کہ "نبی" حق کا وسیلہ ہو تا ہے۔ پس "نبوت" در اصل "اُبُوَّۃ" کی مانند ہے۔ اور اگر اسے "نَبَاء" بمعنی خبر سے اخذ کیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے خدا کی طرف سے خبریں دینے والا۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب شرح مقاصد نے "نبی" کی تعریف یوں کی ہے: "نبی وہ انسان ہو تا ہے جسے اللہ تعالیٰ وحی کی تبلیغ کیلئے مبعوث فرماتا ہے" اور "رسول" کی بھی یہی تعریف ہے البتہ کچھ لوگ اس کے ساتھ "صاحب کتاب و شریعت" ہونے کی قید بھی لگاتے ہیں، للذا اس تعریف کی رو سے "رسول"، "نبی" سے خاص ہو تا ہے۔ لیکن اس تعریف پر کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "اگر رسول وہ انسان ہو تا ہے جسے اللہ تعالیٰ وحی کی تبلیغ کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے اور وہ صاحب کتاب و شریعت بھی ہو تا ہے" تو اس لحاظ سے رسولوں کی تعداد زیادہ ہے اور کتابوں کی تعداد کم ہے۔

نبی اور رسول میں ایک فرق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "رسول وہ ہو تا ہے جس کے پاس آسمانی کتاب ہو یا سابق شریعت کے احکام کو منسوخ کرنے کے اختیارات ہوں" جبکہ "نبی" ایسی کیفیت کا حامل نہیں ہو تا۔ جیسے حضرت "یوشع" علیہ السلام تھے۔ اور "معتزلہ" کہتے ہیں کہ "رسول وہ ہو تا ہے جس پر ملک کے ذریعے وحی ہوتی ہو اور نبی اسے کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے کتاب یا الہام یا خواب میں متنبہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خبریں پہنچائے"۔

البتہ اس بارے میں مزید تفصیل کیلئے علم کلام کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، اور اگر اس بارے میں کلام ائمہ اطہار علیہم السلام کی روشنی میں "رسول"، "نبی" اور "محدَّث" میں فرق معلوم کرنا ہو تو "اصول کافی" کی کتاب "الحجۃ" کے تیسرے باب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ "الحجت" کے معنی ہیں ایسی کیفیت جس کے ذریعہ انسان اپنے مد مقابل پر غلبہ حاصل کر تا ہے۔ "المحجۃ" جیم کے فتحہ (زبر) کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں "درمیانی راستہ"۔ اور "غابر" کے معنی ہیں "باقی رہ جانے والا" اس کا اطلاق ماضی اور مستقبل دونوں کیلئے ہو تا ہے، اس لئے کہ اس کا شمار "اضداد الفاظ" میں ہو تا ہے۔

نبوت کیوں ضروری ہے؟

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اس خطبے میں پہلے تو حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان کیلئے ملائکہ کے سجدہ کرنے اور دیگر حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، پھر یہ بھی بتایا کہ ان کے زمین پر تشریف لانے کے بعد خلق خدا کی ہدایت کیلئے ان کی اولاد سے انبیاء کو برگزیدہ کیا اور کوئی زمانہ کسی نبی کے بغیر نہیں رہنے دیا ہر دور میں کوئی نہ کوئی نبی ضرور آتا رہا جو لوگوں کو اچھائیوں کی طرف ہدایت کرتا اور برائیوں سے روکتا تھا۔ یا پھر کتاب تھی جو نیکیوں کی طرف رہنمائی کرتی اور برائیوں سے روکتی تھی اور یہ سب کچھ اس کے لطف و کرم اور عنایت و احسان کی وجہ سے ہے، اس کی مزید وضاحت کے طور پر آپؑ فرماتے ہیں (اور اللہ سبحانہ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی

فرستادہ پیغمبر یا آسمانی کتاب یونہی نہیں چھوڑا) آپؑ کے اس فرمان میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہاں پر انبیاء ورُسُل کی بعثت کی وجوہات اور لوگوں کو ان کی ضرورت کیلئے دلائل کو بیان کرنا ضروری ہے اور یہ بتانا لازمی ہے کہ ہر زمانے میں معصوم حجت کا ہونا ضروری ہے جس کی خلق خدا کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس بارے میں علمائے علم کلام نے کافی عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے ہیں لیکن ہم ضرورت کے تقاضے کے پیش نظر صرف ایک دلیل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے، اور دلیل پیش کرنے سے پہلے چند مقدمات کا ذکر ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ :

۱۔ ہمارا ایک خالق اور صانع ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۔ وہ جسم وجسمانیت اور مادہ ومادیت سے منزہ ومبرا ہے اور حواس خمسہ میں سے کسی کے ذریعے بھی محسوس نہیں ہوتا۔

۳۔ وہ صاحب حکمت ہے، نظام عالم کے چلانے اور مخلوق کی معیشت، بقا، دوام کی منفعت، بہتری اور مصلحت کو اچھی طرح جانتا ہے۔

۴۔ چونکہ انسان کثیر تعداد میں ہیں لہذا انہیں اپنے معاش ومعاد کیلئے ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو ان کے معاشی امور کا بندو بست کرے اور دنیا میں ان کے رہن سہن کے آداب بتائے اور آخرت میں انہیں عذاب سے نجات کی راہیں دکھائے۔ اس لئے کہ یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی اپنی نوع کی بقا کیلئے معاشرے کا ہر ایک فرد دوسرے کا محتاج ہے جو کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ کوئی غلہ کاشت کرتا ہے تو کوئی اسے آٹا بناتا ہے، کوئی گھر بناتا ہے تو کوئی کپڑے بنتا ہے، کوئی کپڑے سیتا ہے تو کوئی دوسرا کام کرتا ہے، اسی طرح کئی دوسرے کام۔ اور پھر شہریت اور یگانگت کو بحال رکھنے کیلئے معاملات طے کرنے ضروری ہیں، کیونکہ انسانی بقا کا راز اجتماعیت، معاشرت اور باہمی تعاون میں مضمر ہے۔ اور یہ تعاون باہمی معاملات کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور باہمی معاملات کیلئے عدل وانصاف پر مبنی قوانین کی ضرورت ہے جو حقوق وفرائض کا تعین کریں اور ہر ایک سے ان پر عملدرآمد کرائیں۔ اور اگر انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے تو معاشرہ جنگل کا نمونہ پیش کرنے لگ جائے اس لئے کہ ہر شخص ذاتی اور طبعی طور پر اپنی ذات کیلئے منفعت کا طالب ہوتا ہے اور مفاد پرستی اس کی فطرت میں ہے؛ اس لئے وہ فائدہ کی چیز پر اپنا حق جتاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس میں دوسرے کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ چھینا جھپٹی اور انارکیت پیدا ہو جائے گی اور معاشرہ تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ اسی لئے معاملات کو چلانے کیلئے عادلانہ اور منصفانہ قوانین کی ضرورت ہے۔

جب عادلانہ اور منصفانہ قوانین کی ضرورت مسلم ہو گئی تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قانون ساز افراد کا ہونا ضروری ہے جو عدل وانصاف پر مبنی قوانین بنائیں۔ اور قانون ساز افراد فرشتے تو ہو نہیں سکتے لامحالہ انسان ہی ہوں گے۔ اس لئے کہ فرشتوں کو تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں کہ اسے اس کی اصلی حالت میں دیکھ سکے، اگر انبیاء کرامؑ نے انہیں دیکھا ہے تو یہ ان کی ''قدسی طاقت'' تھی۔ بالفرض اگر وہ انسانی شکل اختیار کر بھی لیں تو بھی ان کی شناخت مشتبہ اور مشکل ہو جائے۔ جیسے جبرائیلؑ کبھی دحیہ کلبی کی صورت میں آجاتے تھے۔ اسی لئے تو خداوند عالم فرماتا ہے: ''وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ'' (انعام / ۷) اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بھی بناتے تو بھی مرد ہی بناتے اور وہی پہناتے جو انسان پہنا کرتے

ہیں۔ ایسے قانون ساز کیلئے ضروری ہے کہ اس میں ایسی خصوصیات پائی جائیں جو دوسرے لوگوں میں نہ پائی جاتی ہوں اور اس کیلئے معجزات کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اسے بنی نوع انسان کی تمام تر ضروریات سے باخبر ہونا چاہئے اور اس طرح کے انسان کی معاشرے کو نوع انسانی کی بقا کیلئے سخت ضرورت ہے اور ایسے انسان کا وجود ممکن ہے اور معجزات کے ذریعے اس کی تائید بھی ممکن ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسانی معاشرے کیلئے نبی کا ہونا ضروری ہے اور نبی کا انسان ہونا بھی ضروری ہے اور اسے ایسی خصوصیات کا حامل ہونا بھی ضروری ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ اور ایسی خصوصیات خارق العادات یا معجزاتی کیفیتیں ہوتی ہیں اور اس کیلئے ضروری ہے کہ خدا کے امر وحی کے ساتھ لوگوں کیلئے قانون بنائے اور اس کے پاس فرشتہ آتا ہو جو منجانب اللہ اس کے پاس خدائی احکام و اوامر لے کر آتا ہو۔ اور سب سے پہلا قانون جو لوگوں کو بتائے وہ یہ کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات جاگزین کرے کہ اس کائنات کا ایک خالق و صانع ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور ضروری ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اس لئے کہ وہ ہے ہی اس قابل کہ اس کا حکم مانا جائے۔ اس نے اطاعت گزاروں کیلئے جنت اور نافرمانوں کیلئے جہنم پہلے سے تیار کر رکھی ہے۔ اسی دلیل کی طرف حضرت امام جعفر صادقؑ اشارہ فرماتے ہیں، جیسا کہ کافی میں اسناد کے ساتھ ہشام بن حکم روایت کرتے ہیں کہ؛ ایک زندیق نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ: "انبیاء و رُسُل کے بارے میں آپؑ کے پاس کیا دلیل ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "جب ہم یہ ثابت کر چکے کہ ہمارا ایک خالق و صانع ہے اور ہم تمام مخلوق سے بلند و بالاتر ہے اور وہ خالق و صانع صاحب حکمت ہے لیکن مخلوق کی اس تک براہ راست رسائی نہیں ہو سکتی نہ تو وہ اسے دیکھ سکتی ہے نہ ہی چھو سکتی ہے اور نہ ہی وہ مخلوق کے ساتھ براہ راست اپنا تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی طرف سے اپنی مخلوق میں اس کے سفیر موجود ہوں جو اس کے احکام و فرامین اس کی مخلوق اور اس کے بندوں تک پہنچائیں، اور انہیں ان کی بہتری کی راہیں بتائیں، اور ایسے امور کے ارتکاب سے انہیں منع کریں جن سے ان کا نقصان ہوتا ہو یا بقاء فنا میں بدل جاتی ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ خداوند علیم و حکیم کی طرف سے اپنی مخلوق میں امر و نہی کرنے والے حضرات ہوں اور یہی لوگ ہی تو اس کے انبیاء و رسل اور برگزیدہ مخلوق ہیں، وہ ایسے صاحبان حکمت ہیں جو خلق خدا کو حکمت کی باتیں بتاتے ہیں اور اسی چیز کے ساتھ وہ مبعوث ہوتے ہیں، اور خداوند علیم و حکیم کی طرف سے تائید شدہ ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ہر دور میں انبیاء اور رسل کا دلائل اور براہین کے اسلحہ کیساتھ مسلح ہونا ضروری ہے، تاکہ زمین کبھی حجت خدا سے خالی نہ رہے اور وہ حجت خدا، خدا کی طرف سے عطا کردہ علم کی حامل ہو جس سے اس کی باتوں کی صداقت اور عدالت نمایاں ہوں۔

﴿ہر دور میں حجت خدا کا ہونا ضروری ہے﴾

پس معلوم ہوا کہ خداوند عالم نے کسی بھی زمانے کو نبی مرسل اور آسمانی کتاب کے بغیر نہیں چھوڑا جس کی تصریح حضرت امیر المومنینؑ نے فرمائی ہے، اسی طرح آپؑ فرماتے ہیں کہ (یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے بغیر کبھی یوں ہی نہیں چھوڑا) یعنی ایسی

دلیل جو مخلوق کیلئے لازم تھی اور عدل کا ایسا درمیانی راستہ جس پر لوگ گامزن رہیں اور ادھر ادھر نہ بھٹکنے پائیں، اور یہاں پر "روشن طریق" سے مراد "شریعت مطہرہ" ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا" (مائدہ/ ۴۸) ہم نے سب کیلئے الگ الگ شریعت اور راستہ مقرر کر دیا ہے۔ اور فرماتا ہے: "شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ......" (شوریٰ / ۱۳) اس نے تمہارے لئے دین میں وہ شریعت مقرر کی ہے جس کی نصیحت نوحؑ کو کی ہے۔

البتہ یاد رہے کہ حجت کا اطلاق کبھی تو آسمانی کتاب پر ہوتا ہے اور کبھی ایسے امام معصومؑ پر جو مخلوق خدا کیلئے مقتدا ہوتا ہے اور دنیا اس کی اقتدا کرتی ہے اور اس سے ہدایت اور تقویٰ کی راہیں معلوم کرتی ہے، وہ امام خواہ نبی ہو یا اس کا وصی ہو، اور یہی چیز اصول کافی میں بھی ہے، جسے اسناد کے ساتھ حضرت امیر المومنینؑ سے نقل کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: "خداوندا! تو اپنی زمین کو کبھی ایسی حجت سے خالی نہیں رکھتا جو تیری مخلوق پر ہوتی ہے"

گویا امامؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ: "پروردگارا! تو اپنے بندوں پر لطف و کرم اور احسان و مہربانی کی وجہ سے اپنی زمین کو کبھی بھی اپنی حجت سے خالی نہیں رکھتا جو تیری مخلوق پر ہوتی ہے تاکہ اس طرح سے تیرے بندے تیری راہ پر گامزن رہیں اور تیرے قرب و رحمت کی راہوں کو اپنائے رکھیں، اور تیرے عذاب و معصیت اور نافرمانی سے نجات پا جائیں"۔

اسی طرح کبھی "حجت" کا اطلاق "عقل" پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ باطن میں یہ بھی خدا کی طرف سے لوگوں پر حجت ہوتی ہے جس طرح ظاہر میں نبی اور امام حجت ہوتے ہیں۔ اور اس بارے میں ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔

امام معصومؑ حجت خدا ہوتا ہے

جبکہ یہ بات آپ کو معلوم ہو گئی تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ: یہاں پر امام علیؑ کی حجت سے مراد "امام معصومؑ" ہے، یعنی خصوصی طور پر آنحضرتؐ کے جانشین اور آپؐ کے وصی برحق ہیں، اور "نبی" اور "کتاب" مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اور "عقل" بھی مراد نہیں ہے اس لئے کہ وہ "مستقلات عقلیہ" میں حجت کے مقام و مرتبہ کی حامل ہوتی ہے، دوسری کسی اور جگہ پر نہیں۔ بعض ایسے امور بھی ہوتے ہیں جہاں پر انسانی عقلیں حق اور باطل کے درمیان تمیز نہیں کر سکتیں اور افکار انسانی ان کی پہچان سے عاجز آجاتے ہیں تو وہاں پر امام ہی نور الہام کے ذریعہ اس کا فرق بتاتا اور عقول انسانی کی رہنمائی کرتا ہے، اور بعد از پیغمبر لطف الٰہی وجود امام کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ہماری اس تصریح کے بعد شارح معتزلی (ابن ابی الحدید) کا وہ مفروضہ باطل ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس مقام پر "حجت" کے بارے میں قائم کیا ہے اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے فرمان میں موجود حجت سے مراد "عقل" کو لیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: "یہ جو حضرت امیرؑ نے اپنے فرمان میں کہا ہے "اَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ" آیا یہ امامیہ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں امام معصومؑ کا ہونا ضروری ہے؟" تو اس کا جواب یہی ہے کہ وہ (امامیہ) اسی لفظ کی تفسیر اسی (امام معصومؑ) سے کرتے ہیں، جبکہ یہ امکان بھی ہے کہ اس سے مراد "عقل" کی حجت ہو"۔

....

شارح معتزلی کے نظریہ کی تردید

اس نظریہ کے غلط ہونے کی اصل وجہ وہی ہے جو ہم ابتدا میں ذکر کر چکے ہیں، اس کی مزید وضاحت کیلئے عرض ہے کہ : اللہ تعالی نے بنی نوع انسان کیلئے دو طرح کی حجتیں خلق فرمائی ہیں ا۔ داخلی حجت ۲۔ خارجی حجت جبکہ انسان یا تو عقلی بصیرت کے مالک ہوتے ہیں یا پھر ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں، چنانچہ اہل بصیرت کیلئے حجت، کلی طور پر ان کے عقول ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ اپنے حقیقی مصالح اور مفاسد کو پہچانتے ہیں انہیں "حجت خارجیہ" کی اتباع کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ان پر خدا کی حجت ان کی اپنی بصیرت، عقلی نورانیت اور ہدایت ہوتی ہے، لیکن جو اہل حجاب ہوتے ہیں جن کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں ان کے لیے خارجی حجت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی عقلیں اچھائی اور برائی کی جہات کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ لطف الٰہی بھی ان کے حق میں اس صورت میں مکمل ہوتا ہے، جب وہ خارجی حجت کی اتباع کرتے ہیں کیونکہ اندھے کو راستہ طے کرنے کیلئے ایک بیرونی قائد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر ہر قدم پر اسے اس کی اتباع کرنا پڑتی ہے تب وہ منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔

غرض جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام علیہ السلام کے کلام میں "حجت" سے مراد "امام معصومؑ" ہی ہے۔ اور اس تمام کلام کا خلاصہ ہے کہ دین اور دنیا کا نظام وجود امام ہی سے قائم ہے۔ لوگ جس کی اقتدا کرتے ہیں اور اس سے اپنی ہدایت و تقویٰ کی راہیں دریافت کرتے ہیں۔ اور انسان کیلئے ہر دور اور ہر زمانے میں امام کی اہمیت اور ضرورت اپنی غذا، لباس اور دوسری ضروریات زندگی سے بھی زیادہ ہوتی ہے، لہذا لطف الٰہی اور عنایات پروردگار کے لئے واجب ہو جاتا ہے کہ وہ زمین اور اپنی مخلوق کو امام کے وجود سے کسی لحہ بھی خالی نہ رہنے دے خواہ وہ امام نبی ہو یا وصی۔ ورنہ خدا کے لئے تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازم آئے گی :

ا۔ یا تو خدا کو اس چیز کا علم ہی نہیں اور وہ اس ضرورت سے بے خبر ہے۔ یا

۲۔ امام کو خلق کرنے سے عاجز ہے یا پھر

۳۔ اس کے وجود سے بخل سے کام لے کر تنگدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور یہ تینوں باتیں خدا سے بعید ہیں اور محال ہیں لہذا ماننا پڑے گا کہ ہر دور میں امام، حجت خدا کی صورت میں موجود ہے۔

زمین حجت خدا سے کبھی خالی نہیں ہوتی

ا۔ حضرت امیر المومنینؑ کے کلام سے ملتا جلتا وہ کلام ہے جسے کافی میں اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں : "اللہ نے جب سے حضرت آدمؑ کو اپنے حضور طلب فرمایا ہے اس وقت سے لے کر آج تک زمین کو امام کے وجود سے کبھی خالی نہیں چھوڑا جس کے ذریعہ خدا تک ہدایت حاصل کی جاتی ہے، اور امام خدا کی طرف سے اس کی مخلوق پر حجت ہوتا ہے اور زمین ایسے امام کے بغیر کبھی باقی نہیں رہ سکتی جو امام خدا کے بندوں پر اس کی حجت ہوتی ہے"

۲۔ ابو بصیر حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا : "خداوند عالم کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے

کہ زمین کو کسی عادل امام کے بغیر ہی رہنے دے"۔

۳۔ ابو بصیر امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے زمین کو کسی عالم کے بغیر نہیں رہنے دیا، اگر ایسا نہ ہو تو حق اور باطل کی پہچان مفقود ہو جائے" یعنی ایسے امور میں حق وباطل کی پہچان جہاں عقلیں عاجز آجاتی ہیں، جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے، اسی طرح بہت سی احادیث وروایات میں جو تقریباً تواتر معنوی کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں اور انہیں کافی، علل الشرائع، اکمال الدین، رجال کشی اور ان جیسی بہت سی دوسری کتابوں میں درج کیا گیا ہے کہ: "اگر کسی وقت زمین امام کے وجود سے خالی ہو جائے تو وہ دھنس جائے" اور اس "دھنس جانے" سے، مرادیا تو حقیقی معنوں میں پانی میں غرق ہو جانا ہے یا پھر کنایہ کی صورت میں ہے اور اس سے مراد انسانیت کی تباہی اور نظام کائنات میں گڑبڑ پیدا ہو جائے اور بشریت کا نظام میں بگڑ کر رہ جائے۔ جیسا کہ محقق مجلسیؒ نے اپنی کتاب "مرأۃ العقول" میں اسی بات کی نشاندہی کی ہے۔

بہر حال حضرت امیر المؤمنینؑ ان انبیاء اور رسولوں کی توصیف فرمارہے ہیں کہ وہ ایسے رسول ہیں کہ انہیں اپنے پیغام کی نشر واشاعت اور رسالت کے پہنچانے، احکام کی تبلیغ اور امانتوں کی ادائیگی میں (تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت درماندہ وعاجز نہیں کرتی)۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء نے کبھی تقیہ سے کام نہیں لیا اور نہ ہی ان کیلئے تقیہ جائز ہے۔ اسی سے فخر الدین رازی کی وہ بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے جس کی انہوں نے مذہب امامیہ کی طرف نسبت دی ہے اور کہا ہے کہ: "امامیہ، انبیاء کیلئے کفر کو جائز سمجھتے ہیں اس لئے کہ وہ ان کیلئے تقیہ کے قائل ہیں" جیسا کہ عصمت انبیاء کے باب میں بارہویں فصل میں گزر چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امامیہ کا عقیدہ اپنے معصوم امامؑ کے فرمان کے مطابق ہے، جب امام علیہ السلام نے اس امر کی وضاحت فرمادی ہے تو ان کے قول کے برعکس کس طرح عقیدہ رکھا جاسکتا ہے؟ ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اور یہاں پر پھر اس کا تکرار کئے دیتے ہیں کہ "کوئی عقلمند کیونکر یہ کہہ سکتا ہے کہ نبی کی ذات سے کفر کا کلمہ سرزد ہو سکتا ہے جبکہ پیغمبر کی علت بعثت ہی مادہ کفر کو مٹانا ہوتی ہے، لہٰذا ہم صریح تہمت اور کھلم کھلا بہتان سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور یہ ایک بہتان عظیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے"

امیر المومنینؑ نے انبیاء اور مرسلین کے بارے میں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ (ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام ونشان بتایا، کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا) جیسے حضرت عیسیٰؑ نے پیغمبر اکرمؐ کے متعلق خوشخبری دی اور ان کا تعارف کرایا، خداوند عالم حضرت عیسیٰؑ کی زبانی قرآن میں فرماتا ہے "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ" (صف / ۶) میں تمہیں ایک رسول کی خوشخبری دے رہا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

اس بارے میں تفصیلی گفتگو بھی گزر چکی ہے۔ جو حضرتؑ کے قول "وَاصْطَفٰى مِنْ وُّلْدِهٖ اَنْبِيَاءَ......" کی تفسیر کے ضمن میں کافی کی حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

سولہویں فصل

آدمؑ سے خاتمؐ تک زمین پر خدا کی حجتیں

عَلٰی ذٰلِکَ نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ وَ مَضَتِ الدُّهُوْرُ وَ سَلَفَتِ الْآبَآءُ وَ خَلَفَتِ الْاَبْنَاءُ اِلٰی اَنْ بَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ لِاِنْجَازِ عِدَتِهٖ وَ اِتْمَامِ نُبُوَّتِهٖ مَاخُوْذًا عَلَی النَّبِیِّیْنَ مِیْثَاقُهٗ مَشْهُوْرَةً سِمَاتُهٗ كَرِیْمًا مِیْلَادُهٗ وَ اَهْلُ الْاَرْضِ یَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَ اَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَ طَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ بَیْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهٖ اَوْمُلْحِدٍفِیْ اِسْمِهٖ اَوْمُشِیْرٍ اِلٰی غَیْرِهٖ فَهَدَاهُمْ بِهٖ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ اَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهٖ مِنَ الْجَهَالَةِ.

اسی طرح مدتیں گزر گئیں زمانے بیت گئے باپ داداؤں کی جگہ پر ان کی اولادیں بس گئیں، یہاں تک کہ اللہ نے ایفائے عہد اور اتمام نبوت کیلئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو مبعوث کیا جن کے متعلق نبیوں سے عہد و پیمان لیا جا چکا تھا جن کے علامات (ظہور) مشہور، وقت ولادت مبارک و مسعود تھا اس وقت زمین پر بسنے والوں کے مسلک جدا جدا تھے، خواہشیں متفرق و پراگندہ اور راہیں الگ الگ تھیں، یوں کہ کچھ اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے، کچھ اس کے ناموں کو بگاڑ دیتے، کچھ اسے چھوڑ کر اوروں کی طرف اشارہ کرتے تھے، خداوند عالم نے آپ کی وجہ سے انہیں گمراہی سے ہدایت کی راہ پر لگایا اور آپ کے وجود سے انہیں جہالت سے چھڑایا۔

تشریح "نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ" کے معنی ہیں صدیوں نے نسلیں پیدا کیں اور تیزی سے گزر گئیں، "سَلَفَ" جو گزر گیا "خَلَفَ" پہلے دونوں حروف پر فتحہ (زبر) ہے یعنی نیک اولاد اور لام کے سکون کے ساتھ کے معنی ہیں "ناخلف اولاد" بعض اوقات ان کا ایک دوسرے کے برعکس معنی بھی ہوتا ہے، "مِیْثَاق" اور "مَوْثِق" کا ایک ہی معنی ہے یعنی عہد و پیمان "مِیْلَاد" اور "مَوْلِد" کا بھی ایک ہی معنی ہے یعنی مقام ولادت اور وقت ولادت۔ لیکن لفظ "مِیْلَاد" کے معنی ہیں وقت ولادت، اور یہ "محل ولادت" کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، جیسا کہ شارح بحرانی کو مغالطہ ہوا ہے جبکہ "مَوْلِد" کا اطلاق وقت اور مقام دونوں پر ہوتا ہے، اور فیوی نے بھی اسی بات کی صراحت کی ہے، "مِلَلٌ" جمع ہے "مِلَّة" کی جس کے معنی ہیں دین اور شریعت، "اَهْوَاءٌ" جمع ہے "هَوَا" کی جس کے معنی ہیں خواہشات نفسانی، "مُلْحِد"، "اِلْحَاد" سے ہے جس کے معنی ہیں راہ راست سے ہٹ جانے والے۔

یہ تو تھی چند الفاظ کی مختصر سی تشریح، اب ہم حضرت امیرؑ کے مذکورہ کلام کی طرف آتے ہیں، چنانچہ بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خطبہ اپنی طبعی ترتیب کیساتھ حضرت آدمؑ سے لے کر بعثت حضرت خاتمؐ تک کے حالات بیان کرتا آرہا ہے۔ اور بعثت کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈال رہا ہے، چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں (اسی طرح) اسی مذکورہ اسلوب پر زمین اور خلق خدا کبھی بھی خدا کی حجت اور اس کے پیغمبر سے خالی نہیں رہی اور (مدتیں گزر گئیں اور زمانے بیت گئے اور باپ داداؤں کی جگہ پر ان کی اولادیں بس

گئیں یہاں تک کہ اللہ نے) نبی، امی، عربی، قرشی، ہاشمی، ابطحی، تہامی، مصطفیٰ، اور مرتضیٰ (حضرت محمدؐ کو ایفائے عہد کیلئے) جو اس نے اپنے رسولوں کی زبانی اپنی مخلوق سے کیا تھا (اور اتمام نبوت کے واسطے مبعوث فرمایا)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰؐ تک آنے والی خدا کی ان حجتوں کا ذکر کیا جائے جن کے وجود سے دنیا کبھی خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ شیخ صدوقؒ "امالی" میں ابن متوکل سے وہ حمیری سے وہ ابن عیسیٰ سے وہ حسن بن محبوب سے وہ مقاتل بن سلیمان سے اور وہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا کہ حضرت رسالتمآبؐ نے فرمایا ہے کہ: "میں تمام انبیاء کا سردار ہوں اور میرا وصی تمام اوصیاء کا سردار ہے، اور میرے تمام وصی تمام وصیوں کے سردار ہیں، حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کیا کہ ان کیلئے ایک صالح وصی مقرر کیا جائے تو اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں نے تمام انبیاء کو نبوت کا منصب عطا کر کے انہیں عزت بخشی ہے، پھر میں نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کا انتخاب کیا ہے اور ان میں سے بھی بہترین لوگوں کو انبیاء کا وصی مقرر کیا ہے۔ اس پر حضرت آدمؑ نے عرض کیا: پروردگارا! میرا وصی ایسا ہو جو تمام اوصیاء سے بہتر ہو۔" اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ: "آدمؑ! تم ہبۃ اللہ بن آدمؑ کو جو شیثؑ کے نام سے مشہور ہیں اپنا وصی بناؤ" پھر شیثؑ نے اپنے فرزند "شبان" کو اپنا وصی بنایا، اور یہ وہی "نزلہ" حور کے فرزند ہیں جسے اللہ نے بہشت سے آدمؑ کے پاس بھیجا اور انہوں نے اس کا عقد ازدواج اپنے فرزند "شیث" سے کر دیا تھا۔ اور شبان نے اپنا وصی "محلث" کو مقرر فرمایا۔ محلث نے "محوق" کو، محوق نے "عثمیا" کو انہوں نے "اخنوخ" کو جو "ادریس پیغمبر" کے نام سے مشہور ہیں، انہوں نے "ناخور" (بعض روایت کے مطابق "ناحور") کو، انہوں نے حضرت نوحؑ کو، انہوں نے اپنے بیٹے "سام" کو، انہوں نے "عثامر" کو، انہوں نے "برغیثاشا" کو، انہوں نے "یافث" کو، انہوں نے "برہ" کو، انہوں نے "جفشیہ" کو، انہوں نے "عمران" کو، انہوں نے حضرت "ابراہیمؑ خلیل اللہ" کو، انہوں نے "اسماعیلؑ" کو، انہوں نے "اسحاقؑ" کو، انہوں نے "یعقوبؑ" کو انہوں نے "یوسفؑ" کو، انہوں نے "برثیا" کو، انہوں نے "شعیبؑ" کو، انہوں نے "موسیٰؑ بن عمرانؑ" کو، انہوں نے "یوشع بن نونؑ" کو، انہوں نے "داؤدؑ" کو، انہوں نے "سلیمانؑ" کو، انہوں نے "آصفؑ بن برخیا" کو، انہوں نے "زکریاؑ" کو، انہوں نے "عیسیٰؑ بن مریم" کو، انہوں نے "شمعون بن حمونؑ صفا" کو، انہوں نے "یحییٰ بن زکریاؑ" کو(۱) انہوں نے "منذر" کو، انہوں نے "سلیمہ" کو، انہوں نے "بردہ" کو۔

پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: "بردہ نے وہ وصیت میرے سپرد کی اور اے علیؑ! وہی وصیت میں آپؑ کے سپرد کرتا ہوں، اور آپؑ اپنے وصی کے سپرد کریں گے، اور اپنے آنے والے اوصیاء کے سپرد کرتے جائیں گے جو آپؑ کی اولاد سے ہوں گے اور یکے بعد دیگرے تشریف لائیں گے، بہر حال تم اس زمین پر سب سے بہتر مخلوق کو اپنا وصی بناؤ گے، اور میری امت کے بہت سے لوگ آپ کا انکار کریں گے، اور آپؑ کے بارے میں شدید ترین اختلافات کا شکار ہو جائیں گے۔ جو آپؑ کے بارے میں ثابت قدم رہا وہ گویا آپ کے ساتھ قائم رہا۔ اور جو آپؑ سے دور ہو گیا وہ جہنمی ہے اور جہنم کافروں کا ٹھکانہ ہے"۔

(۱) بعض روایات بتاتی ہیں کہ حضرت یحییٰ بن زکریا ابھی تک بقید حیات ہیں جبکہ مشہور اس کے خلاف ہے، اور بعض روایات حضرت عیسیٰؑ سے پہلے حضرت یحییٰ کی نبوت کی نفی کرتی ہیں، جبکہ کچھ روایات ایسی بھی ہیں جو کہتی ہیں کہ یحییٰ بن زکریا صرف ایک ہی نہیں بلکہ اس نام کے کئی حضرات تھے، واللہ اعلم۔ بحار الانوار

قول مؤلف: "حضرت امیرؑ کے اسی خطبے کی چودھویں فصل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے کہ اللہ نے عالم ذر میں تمام مخلوق سے توحید، رسالت اور علیؑ اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی امامت کا عہد و میثاق لیا ہے"۔

انبیاء سے خصوصی میثاق لیا گیا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے لئے جانے والے خصوصی میثاق کا ذکر کیا جائے جو اللہ نے ان سے لیا تھا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ" (آل عمران / ۸۱) اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ ہم تم کو جو کتاب و حکمت دے رہے ہیں، اس کے بعد جب وہ رسول آجائے جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنیوالا ہے تو تم سب اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا۔ اور پھر پوچھا کیا تم نے ان باتوں کا اقرار کر لیا اور ہمارے عہد کو قبول کر لیا تو سب نے کہا بے شک ہم نے اقرار کر لیا، ارشاد ہوا اب تم سب گواہ بھی رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسر طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ، ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبرؐ سے عہد لینے سے قبل دوسرے تمام انبیاء سے اس بات کا میثاق لیا کہ وہ آنجنابؐ کی تشریف آوری بعثت اور رفعت و سربلندی کی خوشخبری اپنی اپنی امتوں کو دیں گے اور انہیں ان کی تصدیق کرنے کا حکم بھی دیں گے"۔ اسی طرح طبرسیؒ ہی نے حضرت امیرؑ سے روایت کی ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء کو اس وقت تک مبعوث ہی نہیں کیا جب تک ان سے اس بات کا عہد نہیں لے لیا کہ اگر خدا حضرت محمدؐ کو مبعوث فرمائے اور وہ بھی اس وقت زندہ ہوں تو انہیں ضرور آپؐ پر ایمان لانا پڑے گا اور ان کی نصرت بھی کرنا پڑے گی"۔

علی بن ابراہیم قمی کی تفسیر میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اللہ تعالیٰ کے اس قول: "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ......" کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم سے اپنی ربوبیت، اپنے پیغمبر محمد مصطفیٰ کی نبوت اور امیر المؤمنین علیؑ اور ان کی اولاد سے ہونے والے معصوم ائمہؑ کی امامت کا اقرار لیا اور فرمایا: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ وَ مُحَمَّدٌ نَبِيُّكُمْ وَ عَلِيٌّ اِمَامُكُمْ وَ الْاَئِمَّةُ الْهَادُوْنَ اَئِمَّتُكُمْ" تو سب نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" یعنی قیامت کے دن یہ نہ کہنا: "اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ" کہ ہم اس بات سے غافل تھے۔ اور اللہ نے انبیاء سے جو سب سے پہلا میثاق لیا وہ اس اپنی ربوبیت کا تھا، جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے: "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ" یعنی جب ہم نے تمام انبیاء سے میثاق لیا، پھر ہر ایک نبی کا نام بنام ذکر کیا البتہ سب سے پہلے ان انبیاء کا نام لیا جو سب سے افضل تھے، چنانچہ فرمایا: "وَمِنْكَ" اے محمد! آپ سے بھی۔ پیغمبر اسلام کا نام تمام انبیاء سے افضل ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے لیا۔ پھر فرمایا: "وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ......" (احزاب / ۷) اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے......

چنانچہ مذکورہ پانچ انبیاءؑ سب سے افضل ہیں اور محمد مصطفیؐ ان سب سے افضل ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے حضرت رسول خداؐ کے بارے میں میثاق لیا کہ ان پر ایمان لائیں اور امیر المؤمنینؑ کی نصرت کریں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ ہم تم کو جو کتاب و حکمت دے رہے ہیں، اس کے بعد جب وہ رسول آجائے جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنیوالا ہے یعنی حضرت محمد مصطفیؐ تو تم "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ" سب اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا یعنی تم اپنی اپنی امتوں کو اس پیغمبر کی بھی خبر دینا اور اس کے ولی (علی بن ابی طالبؑ) اور دیگر ائمہ کی خبر بھی دینا، یہی تمہاری اس کے ساتھ مدد اور نصرت ہو گی۔

ایک مشکل مسئلہ اور اس کا حل

بحار الانوار میں کشف الغمہ سے منقول ہے اور اسی کتاب میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"امیر المؤمنینؑ مسجد کوفہ میں تلوار کی ٹیک لئے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہنا شروع کر دیا: "قرآن مجید میں موجود ایک آیت نے میرے دل میں مختلف قسم کے وسوسے اور میرے دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں" آپؑ نے فرمایا: "وہ کونسی آیت ہے؟" اس نے کہا: "یہ: وَ سْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ..... "(زخرف / ۴۵) اور اے پیغمبرؐ! آپؐ ان رسولوں سے سوال کریں جنہیں ہم نے آپؐ سے پہلے بھیجا ہے..... تو کیا اس زمانے میں ہمارے پیغمبرؐ کے علاوہ کوئی اور نبی یا رسول تھا کہ جس سے آپؐ سوال کرتے؟" حضرت امیرؑ نے فرمایا: "بیٹھو! میں انشاء اللہ تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں"۔ پھر فرمایا: "خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا..... "(بنی اسرائیل / ۱) پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں۔ تو ان آیات میں سے جو اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھلائیں ایک یہ بھی تھی کہ ایک رات حضرت جبرائیلؑ آنحضرتؐ کے پاس مکہ آئے اور انہیں وہاں سے اپنے ہمراہ لیا اور بیت المقدس پہنچ گئے۔ اور وہاں آپ کیلئے براق لے آئے جس کے ذریعہ آپ آسمان کی بلندیوں میں تشریف لے گئے، چنانچہ جب آپؐ "بیت المعمور" پہنچے تو جبرائیلؑ نے بھی وضو کیا اور آپؐ نے وضو فرمایا اور جبرائیل نے اذان دی اور اقامت کہی اور پیغمبر عالی مرتبت سے کہا کہ آپؐ آگے بڑھئے اور نماز کی امامت فرمائیے! اس لئے کہ آپ کی اقتدا میں ملائکہ کی ایک عظیم جماعت جس کی تعداد کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اسی طرح صف اول میں آپؐ کے باپ آدمؑ ہیں، حضرت نوحؑ ہیں، ہودؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ عیسیٰؑ ہر وہ نبی و رسول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے اور آپ سے پہلے وہ روئے زمین پر مبعوث ہو چکے ہیں۔

چنانچہ آنحضرتؐ آگے بڑھے اور بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ دو رکعت نماز کی امامت فرمائی نماز سے فارغ ہو جانے

کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ : "وَ اسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا...... "(زخرف / ۴۵)ان انبیائے ماسبق سے پوچھیے! تو آنحضرتؐ نے صف انبیاء کی طرف متوجہ ہو کر ان سے پوچھا : "آپؑ لوگ کس بات کی گواہی دیتے ہیں ؟" انہوں نے کہا : "نَشْهَدُاَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ عَلِيًّااَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ وَصِيُّكَ وَ كُلُّ نَبِيٍّ مَاتَ وَ خَلَفَ وَصِيًّامِنْ عُصْبَتِهٖ غَيْرَهٰذَا(اشاروا إلى عيسىٰ بن مريم)فَاِنَّهُ لَا عُصْبَةَ لَهُ وَ كَانَ شَمْعُوْنُ بْنُ الصَّفَا ابْنُ حَمُوْنِ بْنِ عَمَامِهٖ وَنَشْهَدُاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ سَيِّدُ النَّبِيِّيْنَ وَ اَنَّ عَلِيَّ ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ عليه السلام سَيِّدُ الْوَصِيِّيْنَ اُخِذَتْ عَلٰى ذٰلِكَ مَوَاثِيْقُنَا لَكُمَا بِالشَّهَادَةِ ...... "ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ معبود حقیقی وحدہ لاشریک ہے اور آپؐ اللہ کے برحق رسول ہیں، اور یقیناً علیؑ مؤمنین کے امیر اور آپؐ کے وصی ہیں اور جو نبی بھی اس دنیا سے رخصت ہوتا تھا اپنے پدری رشتہ داروں میں سے کسی کو اپنا وصی بناتا تھا سوائے اس ایک شخص (حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے اس لئے کہ اس کا کوئی پدری رشتہ دار نہیں ہے۔ اور شمعون صفا اس کا وصی تھا۔ اور ہم یہ گواہی بھی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے برحق رسول اور تمام انبیاء کے سردار ہیں اور علی بن ابی طالبؑ تمام اوصیاء کے سردار ہیں اور ہم سے آپ دونوں کیلئے اسی بات کا عہد و پیمان لیا جا چکا ہے"۔

جب اس شخص نے حضرت امیر المؤمنینؑ سے یہ تفصیل سنی تو اس نے کہا : "یا امیر المؤمنینؑ! آپؑ نے میری مشکل کشائی فرمادی ہے اور میرے دل کو زندگی بخش دی ہے"۔

بحار الانوار ہی میں کتاب "بصائر الدرجات" سے اسناد کے ساتھ حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ : "اللہ تعالیٰ نے اولوالعزم انبیاء سے یہ میثاق لیا ہے کہ میں تمہارا رب ہوں، محمدؐ میرے رسول ہیں اور علیؑ امیر المؤمنین ہیں، اور ان کے بعد کے اوصیا میرے ولی امر اور میرے علم کے خازن ہیں اور ان میں سے مہدیؑ کے ذریعہ میں اپنے دین کو غلبہ عطا کروں گا"۔ علاوہ ازیں اور بہت سی روایات ہیں جو تلاش کرنے پر مل سکتی ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی سابقہ کتابوں میں علامات

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (جن کے علامات (ظہور) مشہور ہیں) یعنی ان کی صفات اور علامتیں آسمانی کتابوں اور صحیفوں مثلاً توریت، زبور، انجیل، صحف ابراہیمؑ، صحف دانیال، کتاب زکریا، کتاب شعیاء وغیرہ میں موجود ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے : "اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ......"(بقرہ / ۱۴۶۔ انعام / ۲۰) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ رسول کو بھی اپنی اولاد ہی کی طرح پہچانتے ہیں...... یعنی محمدؐ کو ان کی ذات و صفات، مقام بعثت اور محل ہجرت، ان کے آل واصحاب کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے گھروں میں اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے : "اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ......"(اعراف / ۱۵۷) جو لوگ نبی امی کی اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں...... تفسیر عیاشی میں ہے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ : "اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذکر یعنی نام و صفات کو لکھا ہوا پاتے ہیں۔

تفسیر صافی میں "المجالس" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "ایک یہودی حضرت رسول خداؐ کے پاس آیا اور کہا کہ: "میں نے توریت میں آپ کا تعارف یوں پڑھا ہے کہ وہ محمدؐ بن عبداللہ ہے جس کی جائے پیدائش مکہ، جس کا محل ہجرت طیبہ (مدینہ) ہے، نہ تو بد خلق ہے نہ ہی سخت کلام، نہ زور زور سے بولتا ہے اور نہ بلند آواز سے روتا ہے، نہ کسی کو گالی نکالتا ہے نہ فحش کلامی کرتا ہے اور نہ بد کلامی سے کام لیتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں، یہ ہے میر انظر یہ اس بارے میں اللہ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق آپؐ حکم لگائیے!!"۔

کافی میں ہے حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں جب حضرت موسیٰؑ پر توریت نازل ہوئی تو انہوں نے حضرت محمدؐ کی نوید سنائی۔ اسی طرح ہر نبی یکے بعد دیگرے یہی خوشخبری سناتا آیا، یہاں تک کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو مبعوث فرمایا تو انہوں نے بھی اسی قسم کا مژدہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "یَجِدُوْنَهٗ" یہود و نصاریٰ پاتے ہیں "مَكْتُوْبًا" لکھا ہوا صفات محمدؐ کو "عِنْدَهُمْ" اپنے پاس توریت و انجیل میں۔ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ارشاد فرمایا "وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ" اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

کافی ہی میں مرفوع طریقے سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہوئے کہا: "اے موسیٰ! میں شفیق اور مہربان ذات کی طرح تمہیں بتول کے بیٹے عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ہدایت کرتا ہوں اور اس کے بعد آنے والے سرخ اونٹ والے ایک طیب و طاہر اور مطہر انسان کے بارے میں بھی ہدایت کرتا ہوں، اس کی مثال تمہاری کتاب میں یہ ہے کہ وہ سب کتابوں کا نگران، شاہد اور نگہبان ہے اور وہ رکوع کرنے والا، سجدے کرنے والا، خدا سے لو لگانے والا اور اسی سے ڈرنے والا ہے، اس کے بھائی بند غریب اور مسکین لوگ ہیں اور اس کے یار و انصار کچھ اور لوگ ہوں گے"۔

سرکار رسالتمآبؐ کی ولادت باسعادت

(از مترجم: کیا ہی حسن اتفاق ہے کہ آج ۱۷ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ بروز پنجشنبہ روز ولادت باسعادت منجی عالم بشریت حضرت سرکار رسالتمآبؐ کے مبارک اور مسعود موقع پر بھی مجھے آپ کی ولادت باسعادت کے احوال لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، خدایا تیرا شکر۔ محمد علی فاضل، کراچی ۱۲ جولائی ۱۹۹۸ء)

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ فرماتے ہیں (وقت ولادت، مبارک اور مسعود تھا) چنانچہ علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:

"ابن ابی معشر کے بقول آپ کا طالع ولادت کچھ اس طرح ہے: "جب آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس وقت جدی بیسویں درجے میں تھا، زحل اور مشتری عقرب میں تھے، مریخ اپنے گھر حمل میں اور شمس بھی شرف حمل میں تھا، زہرہ حوت کے شرف میں تھا، عطارد بھی حوت میں تھا، قمر اول میزان میں، راس جوزا میں اور ذنب قوس میں"۔

نیز یہ بھی روایت ہے کہ حکماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سرکار رسالت کا طالع مشتری، عطارد، زہرہ اور مریخ ہیں اور وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ مشتری کی نظر اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ علم، حکمت، دانائی، زیرکی اور سرداری کے حامل ہیں، جبکہ عطارد کی نظر اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ لطافت، ظرافت، ملاحت، فصاحت اور حلاوت کی نشانی ہیں۔ زہرہ کی نظر اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ صباحت، سرور، بشاشت، حسن، پاکیزگی، جلال اور جمال کے آئینہ دار ہیں۔ جبکہ مریخ کی نظر آپؐ کی شجاعت، مضبوطی

اعضاء، جنگ وجدال اور قہر وغلبہ کی غماز ہے۔

آپؐ کی تاریخ ولادت

کلینیؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی ولادت باسعادت ۱۲ ربیع الاول سنہ عام الفیل بروز جمعۃ المبارک بوقت زوال آفتاب ہوئی۔ ایک اور روایت کے مطابق بعثت سے چالیس سال قبل ۱۲ ربیع الاول عام الفیل (۱) میں طلوع فجر کے وقت ہوئی جبکہ آپؐ کی مادر گرامی کے صدف عصمت میں آپؐ کا نور ایام تشریق میں جمرہ وسطٰی کے نزدیک منتقل ہوا تھا۔ اس وقت وہ عبداللہ بن عبد المطلب کے گھر میں تشریف فرما تھیں اور آپؐ کی ولادت شعب ابی طالب میں محمد بن یوسف (۲) والے گھر کے بائیں کونے میں ہوئی اور ہارون الرشید کی خلافت کے زمانے میں اس کی والدہ خیزران نے اس گھر کو محمد بن یوسف کے گھر سے علیحدہ کر کے مسجد بنا دیا، جس میں آج تک لوگ نماز پڑھتے آ رہے ہیں۔

قول مؤلف: علامہ یعقوب کلینیؒ نے آپؐ کی جو تاریخ ولادت لکھی ہے وہ جمہور مسلمین کے نزدیک مشہور ہے، ممکن ہے انہوں نے تقیہ کے طور پر ان کی ہم نوائی کی ہو حالانکہ بعض اہل سنت حضرات کے نزدیک آٹھ ربیع الاول اور بعض اوروں کے نزدیک دس ربیع الاول بھی ہے جبکہ ایک نہایت ہی ناقابل اعتناء قول یہ ہے کہ آپؐ کی ولادت ماہ رمضان المبارک میں ہوئی۔

ہماری اخبار و روایات کے مطابق مشہور بلکہ اگر کہا جائے کہ اجماع ہے کہ آپؐ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول کو ہوئی...

بہر صورت سرکار رسالتمآبؐ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول کو ہوئی اور بعثت ۲۷ رجب کو ہوئی جبکہ اس وقت آپؐ کی عمر مبارک چالیس برس کی تھی۔

بعثت کے وقت عالم عرب کی کیفیت

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اس وقت زمین پر بسنے والوں کے مسالک جدا جدا تھے خواہشیں متفرق و پراگندہ اور راہیں الگ الگ تھیں، یوں کہ کچھ اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے تھے، کچھ اس کے ناموں کو بگاڑ دیتے تھے اور کچھ اسے چھوڑ کر اوروں کی طرف اشارہ کرتے تھے)۔

علامہ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ: "علماء کا کہنا ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ کی بعثت اس وقت ہوئی جب لوگوں نے مختلف دین اپنائے ہوئے تھے۔ یہود، نصاریٰ، مجوسی، صابی، بت پرست، فلاسفہ اور زندیق قسم کے لوگ تھے، لیکن جس امت کی طرف

---

(۱) یعنی جس سال ابرہہ اپنے ساتھ ہاتھیوں کا لشکر لے کر خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا، ایک قول کے مطابق آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت، اصحاب الفیل کی ہلاکت کے پچپن دن بعد ہوئی جبکہ دوسرے قول کے مطابق پینتالیس دن بعد اور ایک اور قول کے مطابق انہی کی ہلاکت کے دن (واللہ اعلم)۔

(۲) یہ بات لائق یاد رکھنے والی ہے کہ آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت اپنے ہی گھر میں ہوئی جسے بعد میں عقیل بن ابی طالب کو دے دیا گیا اور عقیل نے وہ گھر حجاج بن یوسف ثقفی کے بھائی محمد بن یوسف کو بیچ دیا تھا جسے اس نے اپنے گھر میں شامل کر لیا، حالات بدلتے رہے اور یہ گھر ہارون الرشید کی والدہ کے پاس آ گیا اور اس نے ہارون کی خلافت کے دور میں اس گھر کو محمد بن یوسف کے گھر سے جدا کر کے مسجد بنا دیا اور آج تک وہ مسجد کی صورت میں ہے۔

آنحضرت کو مبعوث کیا گیا وہ امت عرب تھی اس وقت عرب بھی کئی قسموں میں بٹی ہوئے تھے ۱۔ معطلہ ۲۔ غیر معطلہ اور پھر معطلہ میں سے کچھ وہ تھے جو خالق، زندگی بعد از موت اور دوبارہ اٹھائے جانے کے منکر تھے، انہی کے متعلق خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلاَّ حَيٰوتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيىٰ وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلاَّ الدَّهْرُ" (جاثیہ / ۲۴) یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں جیتے اور مرتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے۔

چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک انہیں عالم وجود میں لانے والی چیز "طبیعت" یا نیچر ہے اور انہیں زمانہ ہلاک کرتا ہے۔ اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو خالق سبحانہ کا اقرار تو کرتے تھے لیکن معاد (قیامت) کا انکار کرتے تھے انہی کے بارے میں خداوند جل و علا فرماتا ہے: "قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ" (یٰس / ۷۸) وہ کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ وہ بھی تھے جو خالق کا اقرار بھی کرتے تھے اور کسی حد تک معاد کے بھی قائل تھے لیکن انبیاء اور رسولوں کے منکر تھے، بت پرستی کیا کرتے تھے اور یہ گمان کیا کرتے تھے کہ یہ بت اللہ کے نزدیک آخرت میں ان کی شفاعت کریں گے۔ وہ ان کیلئے حج بھی کرتے تھے، قربانی بھی کرتے تھے، نذرانے اور چڑھاوے بھی چڑھاتے تھے اور منتیں بھی اتارتے تھے ان کیلئے حلال و حرام کے قائل بھی تھے اور یہ عمومی طور پر جمہور عربوں کا عقیدہ تھا اور انہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ" (فرقان / ۷) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چکر بھی لگاتا ہے۔

البتہ یہ لوگ بت پرستی میں ایک دوسرے سے مختلف تھے ان میں سے کچھ تو وہ تھے جو شریک باری سمجھ کر ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو خدا کا شریک جانتے تھے، کچھ وہ تھے جو شریک کا لفظ تو نہیں کہتے تھے مگر انہیں خالق حقیقی تک رسائی کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے، انہی کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ وہ کہتے تھے: "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلاَّ لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" (زمر / ۳) ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔ اسی طرح عربوں میں "مُشَبِّهَه" اور "مُجَسِّمَه" بھی تھے (مشبہہ جو خدا سے اس کی مخلوق کو مشابہ ٹھہراتے تھے اور مجسمہ جو خدا کے جسم کے قائل تھے، ان کی اکثریت بت پرست تھی) چنانچہ "وَدّ" نامی بت بنی کلب کیلئے تھا جو "دومۃ الجندل" (۱) میں رہتے تھے "سواع" (۲) بت بنی ہذیل کیلئے تھا "نسر" بت حمیر کیلئے "یغوث" ہمدان کیلئے "لات" ثقیف کیلئے تھا جو طائف میں رہتے تھے "عزیٰ" کنانہ، قریش اور بنی سلیم کے بعض افراد کیلئے "مناۃ" غسان، اوس اور خزرج کیلئے تھا، جبکہ "ہبل" جو خانہ کعبہ کی چھت پر تھا صرف اور صرف قریش کیلئے تھا، "اساف" (۳) اور "نائلہ" دونوں بت صفا اور مروہ پر تھے۔

---

(۱) "دومۃ الجندل" مدینہ اور شام کے درمیان ایک قلعہ ہے جو مدینہ کی نسبت شام سے زیادہ نزدیک ہے۔ (۲) "سواع" ایک بت کا نام ہے جس کی پوجا حضرت نوح کے زمانے میں بھی ہوتی تھی اور پھر وہ ہذیل کی قسمت میں آیا۔ (۳) "اساف" "کتاب یا سحاب" کے وزن پر ہے ایک بت کا نام ہے جسے عمرو بن یحییٰ نے صفا پر رکھا تھا اور نائلہ کو مروہ پر اور ان پر کعبہ کی طرف منہ کر کے جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ دراصل یہ دو انسانوں کے نام تھے ایک کا نام اساف بن عمرو اور دوسری عورت تھی جس کا نام نائلہ بنت سہل تھا قبیلہ جرہم سے ان کا تعلق تھا انہوں نے خانہ کعبہ کے اندر فسق و فجور کا ارتکاب کیا اللہ نے انہیں سزا کے طور پر پتھر بنا دیا لیکن قریش ان کی پوجا اس لئے کرتے تھے کہ اگر خدا کو یہ منظور نہ ہوتا کہ اس کے ساتھ ان کی بھی عبادت کی جائے تو انہیں یقیناً پتھر کے بت نہ بناتا (از مجمع البحرین)۔

بعثت کے زمانے میں عربوں کے مذاہب

عربوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا میلان یہودیت کی طرف تھا جن میں بنی تبع کی ایک جماعت بھی تھی اور یمن کے کچھ قبائل۔ اسی طرح کچھ لوگ نصرانیت کی طرف مائل تھے، جیسے بنی تغلب، بنی عباد، عدی بن زید کا قبیلہ اور نصاریٰ نجران اسی طرح ان میں کچھ وہ بھی تھے جو دین "صابی" (۱) کی طرف رجحان رکھتے تھے اور ستارہ پرست تھے۔

جو "معطلہ" نہیں تھے ان کی تعداد بہت کم تھی اور وہی لوگ خدا پرست، متقی، پرہیز گار اور ہر قسم کی برائی سے دور رہتے تھے اور ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی، مثلاً حضرت عبداللہ، حضرت عبد المطلب، حضرت ابو طالب، زید بن عمرو بن نفیل، قس بن ساعدہ ایادی اور اسی طرح کا ایک مختصر گروہ۔

قول مؤلف: جب آپ نے یہ بات سمجھ لی تو اب ہم یہ کہیں گے کہ حضرت امیرؑ کا یہ قول کہ: "کچھ اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے" کا جملہ ان بعض فرقوں کی طرف اشارہ ہے اور مشبہہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور اس کیلئے نت نئی مثالیں گھڑتے اور اس کیلئے صفات جسمانی کے قائل ہیں اور ان کی کئی قسمیں ہیں:

۱۔ "حشویہ": ان کا عقیدہ تھا کہ خدا جسم ہے لیکن دوسرے اجسام کی مانند نہیں، وہ گوشت اور خون کا مجموعہ ہے لیکن عام گوشت اور خون سے مل کر نہیں بنا اس کے اعضاء و جوارح بھی ہیں، وہ اپنے "مخلص بندوں" سے ملتا ہے، انہیں گلے لگاتا ہے اور ان سے ہاتھ ملاتا ہے۔

۲۔ کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ خداوند عالم عرش کی بلند ترین چوٹی پر ہے، چلتا پھرتا ہے اور ادھر ادھر آتا جاتا رہتا ہے، امیہ بن ابی صلت اسی چیز کو بیان کرتا ہے کہ:

مِنْ فَوْقِ عَرْشٍ جَالِسٌ قَدْ حَطَّ　　رِجْلَيْهِ عَلىٰ كُرْسِيِّهِ الْمَنْصُوبِ

یعنی عرش بریں پر منصوب کرسی پر براجمان ہے اور اپنے پاؤں لٹکائے ہوئے ہے۔

۳۔ یہود و نصاریٰ: جو اس بات کے قائل ہیں کہ: "نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَ اَحِبَّائُهٗ" (مائدہ / ۱۸) ہم اللہ کے فرزند اور اس کے دوست ہیں۔ "وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ" (توبہ / ۳۰) یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ "وَ قَالَتِ النَّصَارىٰ الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ" (ایضاً) نصاریٰ کا کہنا ہے کہ عیسیٰ مسیح فرزند خدا ہیں۔ "وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ" (مائدہ / ۶۴) اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ غرض مشبہہ اور مجسمہ نے خداوند سبحانہ کیلئے بزعم خویش ہاتھ اور اولاد تک ثابت کر دیئے ہیں۔

اسی طرح حضرت امیرؑ کا یہ فرمانا "کچھ اس کے ناموں کو بگاڑ دیتے تھے" انہی میں سے ایک اور فرقے کی طرف اشارہ ہے اور

---

(۱) "صابئہ" کو "صَبَأَ فُلَانٌ" سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں فلاں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہو گیا اور "صَبَأَتِ النُّجُوْمُ" کے معنی ہیں ستارے اپنے طلوع ہونے کی جگہ سے نکلے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا اصل دین، دین نوح تھا لیکن وہ اس سے بھی دست بردار ہو گئے۔ ایک اور روایت کے مطابق "صابئون" ایک لقب ہے جس سے کفار کے ایک گروہ کو ملقب کیا گیا ہے جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لوگ چھپ کر ستاروں کی پوجا کرتے تھے (از مجمع البحرین)۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خداوند تعالیٰ کے ناموں کو تبدیل کر کے اپنے من پسند بتوں کے نام رکھ لئے تھے۔ مثلاً "لات" کو "اللہ" سے مشتق کیا، "عزیٰ" کو "عزیز" سے اور "مناۃ" کو "منان" سے، چنانچہ اسی چیز کو مفسر طبرسیؒ نے ابن عباس اور مجاہد سے نقل کیا ہے کہ وہ خداوند عالم کے اس قول کے سلسلے میں فرماتے ہیں "وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَائِهٖ" (اعراف / ۱۸۰) اور اللہ ہی کیلئے اچھے اچھے نام ہیں لہٰذا اسے انہی ناموں کے ذریعہ پکارا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کو بگاڑتے اور ان میں بے دینی سے کام لیتے ہیں۔ علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ: "يُلْحِدُوْنَ" کے سلسلے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ لوگ خدا کو ایسی صفات سے موصوف کرتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہوتیں اور ایسے ناموں سے پکارتے ہیں جن کے ساتھ پکارنا جائز نہیں ہے"۔ اور یہ ایک ایسی وجہ ہے جس کا عمومی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اس میں جبائی کا یہ قول بھی آجاتا ہے کہ "نصاریٰ نے مسیحؑ کا معنی یہ بنالیا ہے کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ نیز اس سے یہ بات بھی حاصل ہوتی ہے کہ خداوند عالم کو صرف انہی ناموں سے پکارنا جائز ہے جو اس نے اپنے لئے خود مقرر فرمائے ہیں"۔ حضرت امیرؑ کا یہ فرمانا: "کچھ اسے چھوڑ کر اوروں کی طرف اشارہ کرتے تھے" یہ دہریوں اور دیگر بت پرستوں کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ اقسام میں داخل نہیں ہیں۔

خلاصہ کلام: بعثت نبویؐ کے وقت لوگوں کے مختلف مذاہب اور ان کی مختلف آراء تھیں، کوئی یہودی تھا، کوئی نصرانی، کوئی مجوسی تھا، کوئی دہریہ اور کوئی بت پرست وغیرہ۔ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (پس خداوند عالم نے انہیں آنحضرتؐ) کے نور وجود (کی وجہ سے گمراہی سے ہدایت کی راہ پر لگایا اور آپؐ کے وجود سے انہیں جہالت) کی تاریکی (سے چھڑایا) جس سے عارف لوگوں کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور پیغمبر کے دین مبین حق کی وجہ سے باطل چالیں ناکام ہو گئیں۔

سترہویں فصل

کتاب خدا کا تفصیلی جائزہ

ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهٗ لِمُحَمَّدٍ لِقَائَهٗ وَ رَضِيَ لَهٗ مَا عِنْدَهٗ فَاَكْرَمَهٗ عَنْ دَارِ الدُّنْيَا وَ رَغِبَ بِهٖ عَنْ مُقَارَنَةِ(مَقَامِ)الْبَلْوٰى فَقَبَضَهٗ اِلَيْهِ كَرِيْمًا وَّ خَلَّفَ فِيْكُمْ مَاخَلَّفَتِ الْاَنْبِيَآءُ فِيْ اُمَمِهَااِذْلَمْ يَتْرُكُوْهُمْ هَمَلاًبِغَيْرِطَرِيْقٍ وَّاضِحٍ وَلَاعَلَمٍ قَائِمٍ كِتَابَ رَبِّكُمْ مُبَيِّنًاحَلَالَهٗ وَحَرَامَهٗ وَفَضَائِلَهٗ وَفَرَائِضَهٗ وَ نَاسِخَهٗ وَمَنْسُوْخَهٗ وَرُخَصَهٗ وَعَزَائِمَهٗ وَخَاصَّهٗ وَ عَامَّهٗ وَ عِبَرَهٗ وَ اَمْثَالَهٗ وَ مُرْسَلَهٗ وَ مَحْدُوْدَهٗ وَ

پھر اللہ سبحانہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو اپنے لقاء و قرب کیلئے چنا، اپنے خاص انعامات آپؐ کیلئے پسند فرمائے اور دار دنیا کی بود و باش سے آپؐ کو بلند تر سمجھا اور زحمتوں سے گھری ہوئی جگہ سے آپؐ کے رخ کو موڑا اور دنیا سے باعزت آپؐ کو اٹھالیا حضرتؐ تم میں اسی طرح کی چیز چھوڑ گئے جو انبیاء اپنی امتوں میں چھوڑتے جاتے آئے تھے۔ اس لئے کہ وہ طریق واضح اور نشان محکم قائم کئے بغیر یوں ہی بے قید و بند انہیں نہیں چھوڑتے تھے۔ پیغمبرؐ نے تمہارے رب کی کتاب تم میں چھوڑی ہے۔ اس حالت میں کہ انہوں نے کتاب کے حلال و حرام، مستحبات و واجبات، ناسخ و منسوخ، رُخص و عزائم، خاص و

مُحْكَمَهُ وَ مُتَشَابِهَهُ مُفَسِّرًا جُمَلَهُ وَ مُبَيِّنًا غَوَامِضَهُ بَيْنَ مَأْخُوذٍ مِيثَاقُ عِلْمِهِ وَ مُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِي جَهْلِهِ وَ بَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهُ وَ مَعْلُومٍ فِي السُّنَّةِ نَسْخُهُ، وَ وَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ أَخْذُهُ وَ مُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهُ وَ بَيْنَ وَاجِبٍ لِوَقْتِهِ وَ زَائِلٍ فِي مُسْتَقْبَلِهِ وَ مُبَايَنٍ بَيْنَ مَحَارِمِهِ مِنْ كَبِيرٍ أَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيرَانَهُ أَوْ صَغِيرٍ أَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ وَ بَيْنَ مَقْبُولٍ فِي أَدْنَاهُ وَ مُوَسَّعٍ فِي أَقْصَاهُ.

عام، عبر و امثال، مقید و مطلق، محکم و متشابہ کو واضح طور پر بیان کر دیا مجمل آیتوں کی تفسیر کر دی انکی گتھیوں کو سلجھا دیا، اس میں کچھ آیتیں وہ ہیں جن کے جاننے کی پابندی عائد کی گئی ہے اور کچھ وہ ہیں کہ اگر اس کے بندے ان سے ناواقف رہیں تو مضائقہ نہیں، کچھ احکام ایسے ہیں جن کا وجوب کتاب سے ثابت ہے اور حدیث سے اس کے منسوخ ہونے کا پتہ چلتا ہے کچھ احکام ایسے ہیں جن پر عمل کرنا حدیث کی رو سے واجب ہے لیکن کتاب میں ان کے ترک کی اجازت ہے، اس کتاب میں بعض واجبات ایسے ہیں جن کا وجوب وقت سے وابستہ ہے اور زمانہ آئندہ میں ان کا وجوب برطرف ہو جاتا ہے۔ قرآن کے محرمات میں بھی تفریق ہے، کچھ کبیرہ ہیں جن کیلئے آتش جہنم کی دھمکیاں ہیں اور کچھ صغیرہ ہیں جن کیلئے مغفرت کے توقعات پیدا کئے ہیں، کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا تھوڑا سا حصہ بھی مقبول ہے، اور زیادہ سے زیادہ اضافہ کی گنجائش رکھی ہے۔

تشریح

"رَغِبَ" بروزن "عَلِمَ" اگر "فِی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں چاہنا، رغبت کرنا اور اگر "مِن" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی ہیں منہ موڑنا، بے رخی کرنا۔ "بلوی" اور "بلاء" دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ "خَلَّفُوا" جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ "هَمَل" پہلے دونوں حروف کے مفتوح (زبر والا) ہونے کے ساتھ، جب اونٹ کو شتر بے مہار بنا کر چراگاہ میں چھوڑ دیا جائے اور اس کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ "عَلَمْ" کے معنی ہیں علامت اور نشانی کے جب کوئی چیز رستے میں اس لئے نصب کی جائے کہ مسافر اس کے ذریعہ منزل کا پتہ چلا سکیں جیسے کوئی اونچی اور بلند چیز یا مینارہ وغیرہ۔ "رُخَص" جمع ہے "رُخْصَةٌ" کی جس طرح "غُرَف" جمع ہے "غُرْفَةٌ" کی۔ رخصت کے معنی ہیں کسی امر میں چھوٹ دینا، اور "عزائم" جمع ہے "عَزِيمَةٌ" کی جس کی اہل لغت نے "فَرِيضَةٌ" کے ساتھ تفسیر کی ہے جبکہ قرینہ سے ظاہر یہ ہے کہ یہ "رُخَص" کے مقابلے میں ہے جس کے معنی ہیں ایسے فرائض جو تنگی کی حیثیت بھی رکھتے ہوں اور کوشش کے ساتھ انہیں ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہو۔ اور "عِبَر" جمع ہے "عبرت" کی جس کے معنی ہیں گزشتہ لوگوں کے انجام سے نصیحت حاصل کرنا۔ "محکم" ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کی دلالت واضح ہوتی ہے جبکہ "متشابہ" اس کے برعکس ہے۔ "غَمْض" کے معنی ہیں مخفی، نامعلوم۔ اور "مُبَايَن" "یا" کے فتحہ (زبر) کے ساتھ اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں جدا شدہ۔ اور "أَرْصَدَ لَهُ" کے معنی ہیں اسے پلٹا دیا، روگردان کر دیا۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (پھر) جب حضرت محمد مصطفیؐ نے رسالت کے فرائض مکمل کر لئے، امانتیں ادا کر دیں،

دین کو پایہ تکمیل تک پہنچادیا، نعمتوں کی تکمیل کر دی، امت کو گمراہی سے ہدایت کی طرف لے آئے اور جہالت کی تاریکیوں سے باہر نکال لیا تو (اللہ سبحانہ نے) اس وقت (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے لقاء و قرب کے لئے چنا اور اپنے خاص انعامات ان کیلئے پسند فرمائے) ایسے انعامات کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا نہ ہی ان کی تعریف کسی کان نے سنی اور نہ ہی کسی فرد بشر کے دل میں اس کا تصور ہوا۔ (تو دار دنیا کی بود و باش سے آپ کو بلند تر سمجھا اور) دکھوں اور (زحمتوں سے گھری ہوئی جگہ سے آپ کے رخ کو موڑا اور دنیا سے باعزت آپؐ کو اٹھالیا، اللہ کی آپؐ پر اور آپؐ کی آل پر رحمتیں اور درود ہوں)

کتاب کافی کے مطابق آپ کی وفات تریسٹھ (۶۳) برس کی عمر میں بارہ ربیع الاول کو ہوئی۔ جبکہ سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ آپ کی وفات حسرت آیات ۲۸ صفر کو ہوئی۔ جب تک آنحضرتؐ نے لوگوں کیلئے دین کی تمام معلومات بیان نہیں کر دیں، ان کیلئے تمام راستوں کی وضاحت نہیں کر دی اس وقت تک اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی امت کو بے یار و مددگار یا شتر بے مہار کی مانند نہیں چھوڑ گئے۔ بلکہ ان کی ہدایت ور ہنمائی کے لئے دو گرانقدر چیزیں یعنی قرآن و عترت جیسے ہادی اپنا جانشین بنا کر یہاں سے روانہ ہوئے۔ جس پر فریقین کی متواتر حدیثیں دلالت کر رہی ہیں۔ انشاء اللہ اس کی مکمل تفصیل خطبہ ۸۶ کی تفسیر میں بیان ہو گی۔ البتہ یہاں پر تبرکاً ایک حدیث نقل کی جاتی ہے؛

شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں احمد بن حسن قطان نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہمیں حسن بن علی بن حسین سکری نے بیان کیا وہ محمد بن زکریا جوہری سے نقل کرتے ہیں وہ جعفر بن محمد بن عمارہ سے نقل کرتے ہیں وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں وہ امام جعفر صادقؑ اور آپؑ اپنے والد امام محمد باقرؑ سے آپؑ اپنے والد امام زین العابدینؑ سے آپؑ اپنے والد امام حسینؑ سے آپؑ اپنے والد حضرت علی بن ابی طالبؑ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: "اِنِّيْ مُخْلِفٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ وَ اِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ كَهَاتَيْنِ (وَ ضَمَّ بَيْنَ سَبَّابَتَيْهِ)" میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور ایک میری عترت اہل بیت۔ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی بلکہ مجھ تک حوض کوثر پر پہنچ جائیں گی بالکل اسی طرح (اس موقع پر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی دونوں انگشت سبابہ کو باہم ملا کر اشارہ کیا)۔ اس وقت حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ عِتْرَتُكَ؟" یارسول اللہ! آپ کی عترت کون لوگ ہیں؟ تو آنجنابؐ نے فرمایا: "عَلِيٌّ وَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ وَ الْاَئِمَّةُ مِنْ وُّلْدِ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" وہ علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور اولاد حسین علیہ السلام سے قیامت تک آنے والے ائمہ ہیں۔

لہذا اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (حضرتؐ تم میں اسی طرح کی چیزیں چھوڑ گئے جو) گزشتہ (انبیاء) اور رسول (اپنی امتوں میں) نبوت و رسالت کے آثار و علائم (چھوڑتے جاتے آئے تھے اس لئے کہ وہ طریق واضح اور نشان محکم قائم کئے یوں بے قید و بند انہیں نہیں چھوڑتے تھے) کہ جس طرح اونٹ کو شتر بے مہار بنا کر چراگاہ اور جنگل و بیابان میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ نہیں بلکہ اسے قرب و وصال کے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں ہلاکت و تباہی سے اسے نجات مل گئی۔

قرآن واہل بیتؑ کی ضرورت

قول مؤلف : آپ ابھی سولہویں فصل میں اچھی طرح جان چکے ہیں کہ خدا کے پیغمبروں اور حجتوں کی بعثت کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ خلق خدا کو حکمت و موعظہ کے ساتھ حق کی طرف بلائیں اور ان کی معاشی اور اخروی امور کا بندوبست کریں کیونکہ وہ خدا کی طرف سے قانون عدل اور شریعت مطہرہ کے حامل ہوتے ہیں، اسی لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ خداوند سبحانہ کی طرف سے اپنے ساتھ ایسی کتاب اور نشانی لائیں جو ایک مبعوث پیغمبر کے زمانے سے دوسرے کی دوسرے کی بعثت کی مدت تک قائم وبر قرار رہیں، تاکہ اس طرح سے لوگوں کو خدا کی یاد دلائی جاتی رہے اور نبی کی رحلت کے بعد زمین سے آثار نبوت مٹ نہ جائیں۔ اور لوگ وہ چیزیں بھلانہ دیں جو انہیں انبیاء نے یاد دلائی ہیں اور غافل وبے مہار اونٹ کی طرح آوارہ نہ ہو جائیں کہ جدھر کو جی آیا ادھر منہ اٹھا کر چل دیئے، یا پھر پست گروہ کی مانند ہر پکارنے والے کے پیچھے نہ دوڑتے پھریں۔

چونکہ ہمارے پیغمبرؐ کی شریعت تا قیام قیامت باقی ہے لہذا ضروری تھا کہ آپؐ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ایسی چیزیں چھوڑ جائیں جو اس طویل ترین عرصے کیلئے امت کو آپؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم ودائم اور برقرار رکھیں۔ چنانچہ آپؐ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی طرف سے دو گرانقدر اور وزنی چیزیں چھوڑی ہیں، ایک ثقل اکبر (قرآن مجید) ہے جس کے ساتھ ثقل اصغر آپؐ کے اہل بیتؑ ہیں۔ ثقل اکبر آسمان زمین تک کے درمیان موجود رسی ہے جسے مضبوطی کے ساتھ تھامنے سے ہلاکتوں سے نجات ملتی ہے۔ اور جو اسے نہیں تھامتا وہ ہلاک، تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ اس میں حلال و حرام، حدود واحکام غرض ہر اس چیز کو بیان فرمایا ہے جس کی لوگوں کو کسی بھی زمانے میں ضرورت درپیش آسکتی ہے۔

یہ کتاب بھی اسی طرح "خاتم الکتب" ہے جس طرح خود آنحضرتؐ "خاتم الرسل" ہیں۔ جس طرح آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے کا اسی طرح اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی۔ اس میں جو چیزیں حلال کی گئی ہیں وہ قیامت تک حلال ہیں اور جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ بھی قیامت تک کیلئے حرام ہیں۔ اسی میں تمہارے رب کی شریعت ہے اور گزشتہ و آئندہ لوگوں کے تذکرے ہیں۔

حلال و حرام کا بیان

اور وہ (تمہارے رب کی کتاب ہے) اور اسے پیغمبرؐ نے اپنی امت کے درمیان باقی رہنے والی نشانی اور سیدھے راستے کی صورت دے دی ہے۔ اور اس کی حالت یہ ہے کہ (اس نے بیان کردیا ہے حلال و حرام کو) جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: "اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو" (بقرہ / ۲۷۵) خدا نے تجارت کو تو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔

واجب اور مندوب کا بیان

بعض اوقات مباح اور مکروہ کو بھی حلال کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور یہی بات امام علیہ السلام کے قول میں ہے کہ (اور مستحبات و واجبات کو بیان کردیا ہے) اور یہ اشارہ ہے ان "احکام خمسہ" کی طرف جن پر فقہ اسلامی کا دارومدار ہے، اسی لئے "فضائل" "مستحبات کی طرف اشارہ ہے اور "فرائض" "واجبات کی طرف۔ اور اس کی مثال قرآن مجید میں ہے: "فَاِذَا قَضَیْتُمْ

الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلیٰ جُنُوْبِکُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا "(نساء / ۱۰۳)اس کے بعد جب یہ نماز مکمل ہو جائے تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہمیشہ خدا کو یاد کرتے رہو اور جب اطمینان حاصل ہو جائے تو باقاعدہ نماز قائم کرو کہ نماز صاحبان ایمان کیلئے ایک معین وقت کے ساتھ فریضہ ہے۔ یہاں پر نماز کی تکمیل کے بعد خدا کی یاد مستحبات میں داخل ہے اور اطمینان کے بعد نماز کی بجاآوری ایک معین وقت کا فریضہ ہے۔

ناسخ اور منسوخ کا بیان

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں (اور ناسخ و منسوخ کو بیان فرمایا ہے) چنانچہ ناسخ سے مراد وہ حکم ہے جو کسی ثابت حکم کو نص کے ذریعے بر طرف کر دے، لہذا بر طرف کرنے والے کو ناسخ اور بر طرف ہونے والے کو منسوخ کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :"وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ"اور ان اہل کتاب کی پاکدامن اور آزاد عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ جبکہ یہ حکم اس قرآنی حکم کے مطابق منسوخ کر دیا گیا ہے :"وَ لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ" (بقرہ / ۲۲۱)اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرنا جب تک کہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور "وَ لَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ "(ممتحنہ / ۱۰)اور کافر عورتوں کی عصمت کو پکڑ کر نہ رکھو یعنی ان سے نکاح نہ کرو۔ جبکہ اسی پر کافی کی روایت دلالت کرتی ہے۔ حسن بن جہم کہتے ہیں کہ : مجھ سے حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے پوچھا"اے ابو محمد !اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو مسلمان بیوی کے باوجود کسی نصرانی عورت سے نکاح کرتا ہے ؟"میں نے عرض کیا :"میں آپؑ کے قربان جاؤں آپؑ کے سامنے میری کیا جرأت ہو سکتی ہے ؟"امامؑ نے فرمایا :"ضرور بتاؤ اس لئے کہ پھر میں بھی تمہیں بتاؤں گا"تو میں نے عرض کیا :"مسلمان یا غیر مسلمان عورت کے ہونے کی بات کیا جبکہ نصرانیہ کے ساتھ عقد نکاح جائز ہی نہیں ہے!"امامؑ نے پوچھا :"کیوں ؟"تو میں نے عرض کیا :"قرآن کہتا ہے"وَ لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ "(بقرہ / ۲۲۱)اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرنا جب تک کہ ایمان نہ لے آئیں۔ اس پر امامؑ نے فرمایا :"تو پھر اس آیت کے بارے میں کیا کہو گے جب قرآن تو اس کی اجازت دے رہا ہے کہ :"وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُومِنَاتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ"(مائدہ / ۵) پاکدامن اور آزاد مؤمن عورتیں اور ان اہل کتاب کی پاکدامن اور آزاد عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ تو میں نے عرض کیا :"حضور والا!"وَ لَا تَنْکِحُوا...... "والی آیت نے اسے منسوخ قرار دیدیا ہے"۔ یہ سن کر امامؑ مسکرا دیئے اور خاموش ہو گئے۔

رخص و عزائم کا بیان

امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اس نے رُخص و عزائم کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے)"عزائم "کیا ہیں ؟ تو جیسا کہ ظاہر میں ہے عزائم سے مراد وہ احکام ہیں جن کی مخالفت کسی بھی حالت میں جائز نہیں، جیسے اعتقاد کا وجوب اور توحید کا اقرار وغیرہ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :"فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ "(محمدؐ / ۱۹)جان لو کہ خدا کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں۔ اور "رُخص "سے مراد وہ احکام ہیں جن کی مخالفت کی اجازت ہے اور انہیں ترک کر دینا جائز ہوتا ہے بشرطیکہ خاص ضروری حالات میں ایسی مخالفت کے اسباب موجود

ہوں، جیسے مجبوری کی حالت میں مردار کے کھانے کی اجازت ہے، اسی پر قرآنی آیت بھی دلالت کر رہی ہے: "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لاَ عَادٍ فَلاَ اِثْمَ عَلَيْهِ "(بقرہ / ۱۷۳) اس نے تمہارے اوپر بس مردار، خون، سؤر کا گوشت اور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے، اس کو حرام قرار دیا ہے پھر بھی اگر کوئی مضطر ہو جائے اور حرام کا طلبگار اور ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا نہ ہو تو اس کیلئے کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک قول یہ بھی ہے کہ "رُخص" وہ احکام ہیں جن کی بجا آوری کی اجازت ہوتی ہے جبکہ انہیں مجبوری اور اہم ضرورت ہو جیسے حرام کرنے والے اسباب موجود ہوتے ہیں، اور "عزائم" وہ شرعی احکام ہیں اپنے شرعی سبب کی بنا پر جاری ہوتے ہیں۔

قول مؤلف: اس کی بہترین مثال ماہ رمضان المبارک کے روزوں کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان میں "رخصت" بھی ہے یعنی جس حاملہ کے وضع حمل کی مدت نزدیک ہو یا جو عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو اور اس کا دودھ کم ہو، بوڑھے افراد ہیں تو ان کیلئے روزے ترک کرنے کی اجازت ہے اور مریض اور مسافر کیلئے روزے نہ رکھنا واجب ہے اور ان کیلئے افطار "عزیمت" بھی ہے۔ جبکہ مذکورہ افراد کے علاوہ شرائط پر پورا اترنے والے لوگوں پر واجب ہیں اور ان کیلئے روزے رکھنا "عزیمت" ہے۔ ارشاد باری ہے: "يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَاكُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اَيَّامًامَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًااَوْ عَلٰى سَفَرٍفَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌطَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًافَهُوَ خَيْرٌ لَهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌلَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"(بقرہ ۱۸۴) اے صاحبان ایمان تمہارے اوپر روزے اسی طرح لکھ دیئے گئے ہیں کہ جس طرح تمہارے سے پہلے والوں پر لکھے گئے تھے۔ شاید تم اس طرح متقی بن جاؤ۔ یہ روزے صرف چند دن کے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی کوئی شخص مریض ہے یا سفر میں ہے تو اتنے ہی دن دوسرے زمانے میں رکھ لے گا۔ اور جو صرف شدت اور مشقت کی بنا پر روزے نہیں رکھ سکتے ہیں وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، اور اگر اپنی طرف سے زیادہ نیکی کریں تو اور بہتر ہے۔ لیکن روزہ رکھنا بہر حال تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانو تو۔

دیکھا آپ نے روزہ مؤمنین کے حق میں "عزیمت" ہے۔ اور مریض اور مسافر کیلئے اس کے ترک کی "رخصت" ہے اور افطار واجب ہے۔ اسی طرح جائز طور پر ان لوگوں کے لئے بھی رخصت ہے جن میں طاقت ہے لیکن ان کیلئے وسعت نہیں ہے جیسے وہ عورت جس کے وضع حمل کے ایام نزدیک ہیں۔ یا بچے کو دودھ پلانے والی عورت کہ جس کا دودھ کم ہے یا بوڑھے افراد۔ تو اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" یعنی جو طاقت رکھتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو افطار کی رخصت ہے۔ اور اختیار حاصل ہے خواہ روزہ رکھیں یا فدیہ دیدیں، لیکن اگر روزہ رکھیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے بشرطیکہ وہ اس بات کو جانتے ہوں۔

عام اور خاص کابیان

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اور خاص اور عام کو واضح طور پر بیان فرمایا) تو اس موقعہ پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ عام اور خاص کی

وضاحت کی جائے۔ چنانچہ "عام" وہ لفظ موضوع ہے جو اپنے تمام اجزاء پر یا جزئیات پر یکساں بولا جائے، جبکہ "خاص" اس کے برعکس ہے۔ عام کی مثال ملاحظہ فرمایئے، ارشاد باری ہے: "اَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوْا الزَّكٰوةَ" (بقرہ / ۴۳) نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور "أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ" (مائدہ / ۴) تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں۔ خاص کی مثال: "وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ" (یٰس / ۲۰) اور شہر کے ایک حصے سے ایک شخص آیا۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "عام" سے مراد ایک ایسا لفظ ہے جو عموم کیلئے وضع کیا جائے اور اس سے مراد بھی عموم ہی ہو خدا فرماتا ہے: "وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" (بقرہ / ۲۸۲) اللہ ہر شئے کا جاننے والا ہے۔ "خاص" سے مراد ایک ایسا لفظ جو وضع تو عموم کیلئے کیا جائے لیکن اس سے مراد عموم نہ ہو، جیسے قرآن مجید میں بلقیس کی زبانی بتایا گیا ہے: "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" (نمل / ۲۳) اور اسے دنیا کی ہر چیز حاصل ہے۔ حالانکہ لفظ عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے کیونکہ اسے بہت سی چیزیں نہیں مل پائی تھیں، مثلاً آلہ مردانگی داڑھی وغیرہ۔ اسی طرح ارشاد خداوندی ہے: "يٰبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ" (بقرہ / ۴۷) اے بنی اسرائیل! ہماری ان نعمتوں کو یاد کرو جو ہم نے تمہیں عنایت کی ہیں اور ہم نے تمہیں عالمین سے بہتر بنایا۔ اس آیت میں لفظ عام ہے لیکن معنی خاص ہے اس لئے کہ انہیں صرف اپنے زمانے کے لوگوں پر بعض مخصوص چیزوں کی وجہ سے فضیلت حاصل تھی۔

امثال وعبر کا بیان

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اور عبر و امثال کو واضح طور پر بیان کر دیا) "عبر" کیا ہے؟ یہ لفظ "عبرت" کی جمع ہے، جو "عبور" سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں جسم کا ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہونا۔ اور اس کا اصطلاحی معنی ہے "مختلف اسباب میں سے کسی ایک سبب کے ذریعے انسانی ذہن کا ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہونا" جیسے انسان کسی مصیبت زدہ اور غم کے مارے ہوئے کو دیکھتا ہے تو اس سے فوراً اپنی طرف منتقل ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسی مصیبتیں مجھ پر نازل ہو سکتی ہیں، لہٰذا اس طرح سے اس میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف رجحان و میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرعون کے انجام کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ کیونکر دنیا اور آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوا اور اس واقعہ میں ان لوگوں کیلئے عبرت ہے جن کے دل میں خوف خدا ہے اور اس پر شقاوت، قساوت اور سنگدلی کے پردے نہیں پڑے ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: "فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى" (نازعات / ۲۵) تو خدا نے اسے دنیا و آخرت دونوں کے عذاب کی گرفت میں لے لیا۔

اس قسم کے موقعوں پر "عبرت" کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات کسی صنعت اور قدرت کے آثار دیکھ کر ذہن فوراً صانع و قادر کے وجود اور اس کی صفات کمال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: "يُقَلِّبُ اللّٰهُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ" (نور / ۴۴) اللہ ہی رات اور دن کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور یقیناً اس میں صاحبان بصیرت کیلئے سامان عبرت ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے: "وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِيْنَ" (نحل / ۲۶) اور تمہارے لئے حیوانات میں بھی عبرت کا سامان ہے کہ ہم ان کے شکم

ے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ نکالتے ہیں جو پینے والوں کیلئے انتہائی خوشگوار ہے۔

اسی طرح "امثال" کی بات ہے، جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے: "مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوْا التَّوْرٰيةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا" (جمعہ / ۵) ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھا نہ سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ نیز فرماتا ہے: "مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِاَةُ حَبَّةٍ" (بقرہ / ۲۶۲) جو لوگ راہ خدا میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں ان کے عمل کی مثال اس دانہ کی ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔

مُرسل اور محدود یا مطلق اور مقید کا بیان

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اور مطلق اور مقید...... کو بیان فرمایا) یعنی حضرت نے فرمایا کہ خداوند عالم نے قرآن کے مرسل اور محدود کو بیان فرمایا ہے، یہاں پر "مُرسل" سے مراد "مطلق" ہے جس کی تعریف اکثر علمائے علم اصول نے یوں کی ہے کہ: "مطلق ایسا لفظ ہے جو عمومی طور پر اپنی جنس کے تمام افراد پر دلالت کرتا ہے" جبکہ شہید علیہ الرحمہ نے "التمہید" میں "مطلق" اور "عام" کے درمیان اس طور فرق بیان فرمایا ہے کہ: "مطلق وہ ماہیت ہے جو لا بشرط شئے ہوتی ہے، یعنی مطلق غیر مشروط ماہیت کو کہتے ہیں جبکہ "عام" کثرت کے ساتھ مشروط ماہیت کا نام ہے"۔ اس کی مزید تفصیل کیلئے علم اصول کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ البتہ حضرت کے کلام میں موجود لفظ "محدود" سے مراد "مقید" ہے، چنانچہ قرآن پاک میں دونوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ مُرسل یا عام کی مثال کہ خداوند فرماتا ہے: "وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" (بقرہ / ۶۷) اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰ نے قوم سے کہا کہ خدا کا حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔

محدود یا مقید کی مثال، قرآن کہتا ہے: "قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا" (بقرہ / ۷۱) حکم ہوا کہ ایسی گائے جو کاروباری نہ ہو نہ زمین جوتے نہ کھیت سینچے ایسی صاف ستھری کہ اس میں کوئی دھبہ بھی نہ ہو۔

محکم اور متشابہ کا بیان

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اور محکم و متشابہ کو واضح طور پر بیان فرمادیا ہے) چنانچہ قرآن مجید میں ہے: "هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ" (آل عمران / ۷) اس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیات محکم اور واضح ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں، اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں۔

لفظ "محکم" کو "اَحْكَمْتُ" بمعنی "رَدَدْتُ" اور "مَنَعْتُ" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یعنی میں نے پلٹا دیا اور روک دیا۔ اور

"حاکم" کو اس لئے حاکم کہتے ہیں کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکتا اور باز رکھتا ہے۔ اور "حکمت" کو اس لئے حکمت کہتے ہیں کہ وہ ناشائستہ امور کے اپنانے سے باز رکھتی ہے۔ جبکہ "متشابہ" کو "تشابہ" سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں "دو چیزوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم شکل و شباہت ہونا کہ ذہن ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے سے عاجز آجائے۔" جیسا کہ قرآن مجید میں بنی اسرائیل کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ :"اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا"(بقرہ / ۷۰) گائے ہمارے نزدیک مشتبہ ہو گئی ہے (ایسی بہت سی گائیں ہیں)۔

حضرت رسول اکرمؐ فرماتے ہیں :"حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی روشن ہے اور "شبہات" ان کے درمیان درمیان ہوتے ہیں۔" چونکہ آپس کے دو متشابہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا لہذا ہر وہ چیز جس تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی "متشابہ" کہلاتی ہے۔ گویا سبب کا نام مسبب کو دیا جاتا ہے، عامہ اور خاصہ محققین نے محکم اور متشابہ کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ :"کسی معنی کیلئے موضوع ایک لفظ کے بارے میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور معنی کے لئے بھی موضوع ہو گا، یا احتمال نہیں ہو سکتا، اگر احتمال نہیں ہو سکتا تو اسے "نص" کہتے ہیں اور اگر کسی اور معنی کا بھی احتمال ہو سکتا ہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں سے ایک معنی "راجح" ہے اور دوسرا "مرجوح" یا نہیں بلکہ دونوں کیلئے یکساں استعمال ہوتا ہے لہذا پہلی صورت میں "راجح" کو "ظاہر" اور "مرجوح" کو "مؤوّل" کہیں گے۔ اگر اس کا استعمال دونوں کیلئے ہے تو اسے "مشترک" یا "مجمل"۔ چنانچہ "نص" اور "ظاہر" میں قدر مشترک "محکم" ہے اور "مجمل" اور "موول" میں قدر مشترک "متشابہ" ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ محکم وہ ہوتا ہے جس کی دلالت واضح ہو اور متشابہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کی تحقیق ہم نے "قوانین الاصول" پر اپنے حواشی میں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے وہاں پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، بہر صورت محکم کی مثال قرآن مجید میں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَايَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا"(یونس / ۴۴) اللہ انسانوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔ اسی طرح فرماتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ"(نساء / ۴۰) اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ متشابہ کی مثال :"اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى"(طہ / ۵) وہ رحمٰن عرش پر اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔ اسی طرح "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ"(بقرہ / ۲۲۸) مطلقہ عورتیں تین قروء تک انتظار کریں گی۔ دوسری آیت میں "مشابہت"، "اشتراک کی بنا پر پائی جاتی ہے اور پہلی میں حقیقت کے مشکل اور مجازی قرینہ کے مخفی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے تمام "حروف مقطعات" جو بعض سورتوں کے اوائل میں ہیں کا شمار بھی "مُتَشَابِهَات" میں ہوتا ہے۔

مفسر اور مجمل کا بیان

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (مجمل آیتوں کی تفسیر کر دی) خطبے میں مذکور "جُمَل" سے مراد وہ مجمل اور مختلف احتمالات کے حامل الفاظ ہیں جن کیلئے تفسیر اور بیان کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "وَ الْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ"(بقرہ / ۲۲۸) مطلقہ عورتیں تین قروء تک انتظار کریں گی۔ چنانچہ اس آیت میں مذکور لفظ "قروء" دو معانی کا حامل ہے

ا۔ حیض ۲۔ طہر (حیض سے پاکیزگی کی حالت)۔

اسی طرح بعض لوگوں کے مذہب کے مطابق وہ آیات بھی مجمل ہیں جن کیلئے تفسیر کی ضرورت ہوتی ہے ا۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْمُ أُمَّهٰتُكُمْ "(نساء / ۲۳) ۲۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ "(مائدہ / ۳) تمہارے اوپر مردار اور خون حرام کردیا گیا ہے۔ ۳۔ "أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الاَنْعَامِ "(مائدہ /۱) تمہارے اوپر چوپائے حلال کئے گئے ہیں۔ اور اس جیسی کئی اور آیات کہ جن میں "حلت" یا "حرمت" کی نسبت ان کی عین کی طرف دی گئی ہے۔ کیونکہ ان میں حقیقی معنی مراد لینا ناممکن ہے اور مجازی معانی کئی ہیں۔ اسی لئے لفظ حقیقت کی نسبت مجمل ہوتا ہے اور متعدد مجازی معنی کی نسبت محتمل ہوتا ہے۔

بہر حال مولا فرماتے ہیں (اور اس کی گتھیوں کو سلجھادیا ہے) یعنی اس کے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو احسن طریقے سے سلجھایا گیا ہے۔

کتاب خدا کی ایک اور طرح کی تقسیم

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ کتاب خدا کی ایک اور طرح کی تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (ان میں کچھ آیتیں وہ ہیں جن کے جاننے کی پابندی عائد کی گئی ہے) یعنی ہر ایک پر اس حد تک پابندی عائد کی گئی ہے کہ اس سے چشم پوشی اور بے اعتنائی ناقابل معافی جرم ہے، جیسے صانع (خالق لایزال) کی معرفت اور اس کی توحید کا اقرار اور معرفت۔ چنانچہ اس بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى "(اعراف / ۱۷۲) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرزندان آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر انہیں خودان کے اوپر گواہ بنا کر سوال کیا کہ میں تمہارا خدا ہوں؟ تو سب نے کہا کہ بے شک ہم اس کے گواہ ہیں۔ (اور کچھ وہ ہیں کہ اگر اس کے بندے ان سے ناواقف ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں) جیسے وہ متشابہات کہ جن کا علم "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" کے ساتھ مخصوص کردیا ہے، اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وَ مَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ "(آل عمران / ۷) اور اس کی تاویل کو صرف خدا اور وہ لوگ جانتے ہیں جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں۔

کتاب کا سنت کے ذریعہ منسوخ ہونا

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (کچھ احکام ایسے ہیں جن کا وجوب کتاب سے ثابت ہے اور حدیث سے اس کے منسوخ ہونے کا پتہ چلتا ہے) یہ کلام اس بات پر نص صریح ہے کہ کتاب میں احادیث متواترہ سے منسوخی واقع ہوئی ہے، جب احادیث متواترہ سے منسوخی واقع ہوسکتی ہے تو پھر جواز بھی عمل میں آسکتا ہے۔ کیونکہ وقوع، امکان سے اخص ہوتا ہے اور یہ علمائے امامیہ، معتزلہ اور اشاعرہ کے متکلمین کا موقف ہے۔ اور حضرت ابو حنیفہ اور مالک کے پیروکاروں کا بھی یہی موقف ہے جبکہ شافعیوں اور "نہایہ" کے بقول اکثر ظاہریہ نے اور دو میں سے ایک روایت کے مطابق حنبلیوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور یہ مسئلہ علم اصول میں بڑی حد تک معرکۃ الآراء ہے اور اس کے وقوع پذیر ہونے کا سبب یہ قرآنی آیت ہے: "وَ اللّٰتِيْ يَاتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ

سَبِيْلاً وَ اللَّذَانِ يَاتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَئَاذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا" (نساء / ۱۵۔۱۶) اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں ان پر اپنوں میں سے چار گواہوں کی گواہی لو اور جب گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں بند کر دو یہاں تک کہ موت آجائے یا خدا ان کیلئے کوئی راستہ مقرر کر دے اور تم میں سے جو آدمی بدکاری کریں انہیں اذیت دو۔ پھر اگر توبہ کرلیں اور اپنے حال کی اصلاح کرلیں تو ان سے اعراض کرو کہ خدا بہت توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

چنانچہ پہلی آیت میں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو عورتیں بدکاری کی مرتکب ہوں انہیں تادم مرگ گھروں میں قید رکھا جائے۔ اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والوں کو ایذا دی جائے۔ لیکن یہ دونوں سزائیں (گھروں میں قید و بند اور ایذا رسانی) بعد میں منسوخ ہو گئیں، چنانچہ غیر شادی شدہ مرد اور عورت کیلئے تو قرآن مجید کی اس آیت کی رو سے سو کوڑوں کی سزا تجویز کی گئی: "اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ" (نور / ۲) زناکار مرد اور عورت دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ جبکہ شادی شدہ مرد اور عورت کیلئے سنگساری کی، اور وہ سنت نبویہؐ کی رو سے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلی آیت تو کوڑوں والی آیت کی وجہ سے منسوخ ہے اور حدیث کی رو سے سنگساری کی سزا اس پر اضافہ ہے اسے منسوخ نہیں کر رہی ہے جبکہ دوسری آیت اپنے حال پر باقی ہے اور منسوخ نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ جو زناکار "حد" کا مستحق ہوتا ہے پہلے تو اس کی مذمت کی جاتی ہے اور اس پر سختی کی جاتی ہے پھر اس پر حد جاری کی جاتی ہے۔ لہذا دونوں آیتیں سنت کے ذریعہ منسوخ نہیں ہیں۔ اس کیلئے جواباً عرض ہے کہ یہ بات تو مسلّم ہے کہ کوڑوں کی سزا کے ساتھ سنگساری کی سزا نہیں ہے اور سنگساری کے ساتھ کوڑوں کی سزا نہیں ہے، اور دونوں سزاؤں کا بیک وقت اجرا بالکل ممنوع ہے۔ اور سزاؤں کا اجرا یوں ہوتا ہے کہ بعض بدکار عورتیں صرف کوڑوں کی مستحق ہوتی ہیں، بعض فقط سنگساری کی جبکہ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو کوڑوں اور سنگساری کی (ملاکر) مستحق ہوتی ہیں۔ اس کی مکمل تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

شارح بحرانی کا موقف اور اس کی تردید

مرحوم بحرانی "شارح نہج البلاغہ، اپنے مدعا پر شاہد پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اوائل اسلام میں اگر کوئی شادی شدہ عورت بدکاری کا ارتکاب کرتی تو اسے تادم مرگ گھر میں قید رکھا جاتا تھا جبکہ غیر شادی شدہ کو باتوں کے ذریعہ اذیت پہنچائی جاتی، جیسا کہ آیات بالا بتارہی ہیں۔ لیکن بعد میں شادی شدہ کے بارے میں سنگساری کا حکم اور غیر شادی شدہ کے بارے میں کوڑوں اور سنت کی رو سے تعزیر کا حکم آجانے سے مذکورہ سزائیں منسوخ ہو گئیں"۔

حالانکہ مرحوم کا یہ بیان کئی وجوہات کی بنا پر اشکال سے خالی نہیں۔

۱۔ پہلی آیت کا حکم صرف شادی شدہ عورت ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ غیر شادی شدہ کیلئے بھی ہے۔ ہاں البتہ اگر یہ کہا جائے کہ شادی شدہ ہونا ایک اضافی چیز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زوجیت کی طرف اضافت دی ہے لہذا اگر غیر شادی شدہ

ہوتیں تو "مِنْ نِسَائِكُمْ" کی بجائے "مِنَ النِّسَاءِ" استعمال ہوتا۔ تو پھر اس وقت غیر شادی شدہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوں گی۔

۲۔ حدیث کی رو سے سنگساری کی سزا صرف ان شادی شدہ عورتوں ہی کیلئے نہیں کہ جن کے شوہر فوت ہو گئے ہوں بلکہ شوہر دار عورتوں کیلئے بھی یہی سزا ہے۔

۳۔ کنواری عورتوں کیلئے کوڑوں کی سزا حدیث کی رو سے نہیں بلکہ قرآنی آیات کے ذریعے مقرر کی گئی ہے۔ اور یہاں پر یہ بات بھی نہیں کی جاسکتی کہ قرآن مجید سے بدکاری کی زیادہ سے زیادہ سزا صرف سو کوڑے ہی ثابت ہے اور یہ سزا غیر شادی شدہ دوشیزہ کیلئے ہے۔ اور یہ حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ لہٰذا غیر شادی شدہ کنواری عورت کیلئے سو کوڑوں کی سزا کا حکم سنت کی رو سے ثابت ہے لہٰذا سنت ناسخ ہو گی نا کہ کتاب۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ناسخ ہر حالت میں کتاب ہی ہے البتہ سنت اس ناسخ کی مراد کی وضاحت کر رہی ہے۔ بات اچھی طرح سمجھنے والی ہے۔

۴۔ مرحوم کے کلام سے جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ کہ پہلی آیت شادی شدہ عورتوں کے بارے میں ہے اور دوسری غیر شادی شدہ دوشیزاؤں کے متعلق، حالانکہ اخبار و روایت کی رو سے ایسا سمجھنا غلط ہے، کیونکہ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ پہلی آیت عورتوں کے بارے میں ہے اور دوسری مردوں کے متعلق ہے۔ علی بن ابراہیم قمیؒ ان دونوں آیات کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرد بدکاری کا ارتکاب کرتا تو اسے ایذا پہنچائی جاتی اور عورت کو گھر میں مقید کر دیا جاتا۔ یہاں تک کہ اس کی موت وہیں پر واقع ہو جاتی۔ پھر یہ سزائیں اس آیت کے ذریعے منسوخ ہو گئیں: "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ......"۔

کتاب وسائل الشیعہ میں سید مرتضیٰؒ کی کتاب "رسالۃ المحکم والمتشابہ" سے منقول ہے اور تفسیر نعمانی سے اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؑ "ناسخ و منسوخ" کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی شریعت میں یہ تھا کہ جب کوئی عورت زنا کی مرتکب ہوتی تو اسے گھر میں نظر بند کر دیا جاتا اور اس پر سخت پابندیاں لگائی جاتیں یہاں تک کہ وہ لقمہ اجل بن جاتی۔ اور اگر مرد ایسی برائی کا ارتکاب کرتا تو معاشرہ اسے اپنے تئیں دھتکار دیتا، اس پر گالی گلوچ، سب و شتم اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر دی جاتی اور اسے "زانی" کے علاوہ کسی اور نام سے نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا جب اسلام آیا تو اس نے اوائل میں یہی کہا کہ: "وَ الّٰتِيْ يَاتِيْنَ ...... تَوَّابًا رَّحِيْمًا" (نساء / ۱۵۔۱۶) اور جب مسلمانوں کی کثرت ہو گئی، اسلام مضبوط ہو گیا اور جاہلی دور کے امور سے وحشت کی جانے لگی تو خداوند عالم نے یہ حکم نازل کیا "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ...... مِائَةَ جَلْدَةٍ" (نور / ۲) تو اس آیت نے مذکورہ دونوں سزاؤں (عمر قید اور ایذا رسانی) کو منسوخ کر دیا"۔

قول مصنفؒ: اس آیت کے منسوخ کرنے سے شاید آپؑ کی مراد غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت کی سزاؤں کی منسوخی ہے اور اس لحاظ سے یہ روایت ہماری مذکورہ تصریحات کے منافی نہیں ہے۔

سنت کی رو سے واجب اور کتاب کی رو سے اجازت

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اور کچھ احکام ایسے ہیں جن پر عمل کرنا حدیث کی رو سے واجب ہے لیکن کتاب میں ان کے ترک

ی اجازت ہے) اور یہ کلام سابقہ گفتگو میں بیان ہونے والے حکم کے برعکس ہے، یعنی پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ کتاب کے حکم کو حدیث کے ذریعہ منسوخ کیا گیا ہے اور یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ "حدیث یا سنت کو کتاب کے ذریعے منسوخ کیا گیا ہے" اور اس جواز کے قائل امامیہ اشاعرہ، معتزلہ اور تمام اہل سنت فقہا ہیں، صرف شافعی مذہب اس کا مخالف ہے۔ چنانچہ ہم اس موقف پر چند شاہد پیش کرتے ہیں:

ا۔ ابتدائے اسلام میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم صرف اور صرف سنت کے ذریعے تھا کیونکہ کتاب میں اس کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں۔ لیکن اس حکم کو قرآن مجید نے یہ کہہ کر منسوخ کردیا: "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (بقرہ / ۱۴۴) آپؐ اپنا رخ مسجد الحرام کی جہت کی طرف موڑ دیجئے۔

۲۔ ماہ رمضان کی راتوں میں عورتوں کے ساتھ مباشرت سنت کی رو سے حرام تھی، کتاب میں اس کا کوئی حکم نہیں ہے لیکن اس حکم کو قرآن نے یہ کہہ کر منسوخ کردیا کہ: "فَالآنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" (بقرہ / ۱۸۷) اب تم باطمینان مباشرت کرو اور جو خدا نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے اس کی آرزو کرو۔

۳۔ عاشورا (دسویں محرم کے دن) کا روزہ سنت کے ذریعے واجب تھا لیکن کتاب نے یہ کہہ کر اسے منسوخ کردیا: "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" (بقرہ / ۱۸۵) اور تم میں سے جس نے بھی اس مہینہ کو پایا تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ جیسا کہ وسائل الشیعہ میں حارث عطار سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے عاشورا کے دن کے روزے کے متعلق سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: "یہ روزہ ماہ رمضان کی وجہ سے متروک ہو چکا ہے اور متروک کو بجالانا بدعت ہے"۔

وسائل ہی میں زرارہ بن اعین اور محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ انہوں نے مل کر حضرت امام محمد باقرؑ سے روز عاشورا کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا: "ماہ رمضان المبارک کے روزوں سے پہلے تھا لیکن ماہ رمضان کے روزوں کے وجوب کے ساتھ یہ متروک ہو گیا"۔

بعض اور قسم کے واجبات

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اس کتاب میں بعض واجبات ایسے ہیں جن کا وجوب وقت سے وابستہ ہے اور زمانہ آئندہ میں ان کا وجوب برطرف ہو جاتا ہے) جیسے وقت مقررہ کیلئے نذر عہد اور قسم ہے، چنانچہ اسی بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے "وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً" (بنی اسرائیل / ۳۴) اور اپنے عہد کو پورا کرنا کہ عہد کے بارے میں سوال ہوگا۔ نیز فرماتا ہے: "وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَ لاَ تَنْقُضُوْا الاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلاً" (نحل / ۹۱) اور جب کوئی عہد کرو تو اسے پورا کرو اور اپنی قسموں کو استحکام کے بعد ہرگز مت توڑو جبکہ تم اللہ کو کفیل اور نگران بنا چکے ہو۔

شارح بحرانیؒ کی تردید

اس مرحلے پر شارح بحرانیؒ نے جو مثال پیش کی ہے وہ یہ کہ "جیسے زندگی میں حج صرف ایک بار واجب ہے" بے محل اور بے معنی ہے، کیونکہ حج اگرچہ زندگی میں صرف ایک مرتبہ واجب ہے لیکن اگر اسے اسی سال نہ بجالایا جائے تو سال آئندہ اس کی بجاآوری واجب رہتی ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں عمر بھر اس کی قضا واجب رہتی ہے

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "شاید حضرت امیرؑ کی "زمانہ آئندہ میں اس کا وجوب بر طرف ہو جاتا ہے" سے مراد "واجب کی بجا آوری کے بعد وجوب بر طرف ہو جاتا ہے" ہو تو پھر اس لحاظ سے مرحوم بحرانی کی مثال صحیح ہوگی"۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بنا اسی بات پر ہے تو پھر اس میں حج کو کیا خصوصیت حاصل ہے ؟اس لحاظ سے تو تمام واجبات اسی نوعیت کے ہیں کہ ان کی ادائیگی زندگی میں خواہ ایک مرتبہ ہو یا روزانہ ہو، کیونکہ جب انہیں ادا کر دیا جائے تو ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے اور وجوب باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ عام طور پر اس کا مشاہدہ ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے حج کے وجوب اور نماز ظہر وغیرہ جیسے دوسرے وجوب میں کوئی فرق نہیں اور اس فرق سے انکار نا ممکن ہے۔ کیونکہ حج زندگی میں صرف ایک مرتبہ واجب ہے جبکہ دیگر واجبات تکراری ہوتے ہیں، یعنی حج کو صرف ایک ہی مرتبہ بجالانے سے شرعی فریضہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ نماز ظہر وغیرہ جیسے فرائض کی آج ادائیگی سے کل کا فریضہ ختم نہیں ہو جاتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک غلط فہمی ہے کیونکہ اگر تو اس سے مراد یہ ہے کہ کل کیلئے بجالائی جانے والی نماز ظہر اس لئے بجالائی جا رہی ہے کہ آج وہ ساقط نہیں تھی تو پھر اس لحاظ سے یہ بات ثابت ہوگی کہ وہ ہے ہی بالکل ساقط، اس لئے کہ ایک فرض کی بجا آوری کے بعد پھر اسے بجالانے کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ کل کے زوال آفتاب کے بعد واجب ظہر کا وجوب ساقط نہیں تو پھر یہ بات ثابت ہوگی کہ وہ مستقبل کیلئے واجب ہے۔ لہذا اسطرح سے اس کے وجوب میں اور اپنے وقت میں آج کی نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد اس کے وجوب کے سقوط میں کوئی فرق نہیں۔ یہ بات قابل غور ہے اور اسے خوب سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

پھر یہ کہ مرحوم بحرانی سے یہ بات بھی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حج کو اوقات معینہ میں ادائیگی کے قابل فریضہ قرار دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر مرحوم اس موقعہ پر نماز جمعہ کی مثال دیتے تو بھی کوئی بات ہوتی جس طرح شارح معتزلی ابن ابی الحدید نے اس موقعہ پر یہی مثال پیش کی ہے۔

گناہان صغیرہ اور کبیرہ کی تفصیلی بحث

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اور قرآن کے محرمات میں بھی تفریق ہے، کچھ کبیرہ ہیں جن کیلئے آتش جہنم کی دھمکیاں دی ہیں اور کچھ صغیرہ ہیں جن کیلئے مغفرت کے توقعات پیدا کئے ہیں) حضرتؑ نے گناہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جن کیلئے آتش جہنم کی دھمکیاں ہیں اور دوسرے وہ جن کیلئے مغفرت کی توقعات ہیں اسی بات کی تصریح تقریباً بہت سی احادیث میں کی گئی ہے، مثلاً :

۱۔ شیخ مفیدؒ نے عباد بن کثیر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے گناہان کبیرہ کے متعلق سوال کیا کہ "وہ کیا ہوتے ہیں ؟" تو آپؑ نے فرمایا: "ہر وہ گناہ جس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی دی ہے گناہ کبیرہ ہے۔"

۲۔ وسائل الشیعہ میں ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بھائی حضرت علی بن جعفر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے تحریری

طور پر سوال کیا کہ گناہان کبیرہ کیا ہوتے ہیں؟ کہ جن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ" (نساء / ۳۱) اگر ان میں سے تم گناہان کبیرہ سے بچے رہو تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں سے بھی درگزر کریں گے۔ تو امامؑ نے تحریر فرمایا: "وہی کہ جن کے ارتکاب پر اللہ نے جہنم واجب کر دی ہے۔" اسی طرح کی اور بھی کئی احادیث ہیں۔ بعض روایات میں ان کی تعداد سات ذکر کی گئی ہے، جیسا کہ کافی میں ابن محبوب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میرے ساتھ میرے بعض دوستوں نے حضرت ابو الحسن (موسیٰ بن جعفرؑ) کی خدمت میں ایک خط تحریر کیا کہ ہمیں "گناہان کبیرہ" کی تعداد بتائیں تو انہوں نے لکھا "گناہان کبیرہ وہ ہوتے ہیں جن کے ارتکاب پر اللہ نے جہنم کی دھمکی دی ہے اور اگر مومن ان سے اجتناب کرے گا تو اسکے دوسرے گناہ مٹا دیئے جائیں گے اور وہ سات ہیں: ۱۔ جس کا خون اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل کرنا یعنی ناجائز قتل۔ ۲۔ والدین کی نافرنی۔ ۳۔ سود خواری ۴۔ ہجرت کے بعد بادیہ نشینی۔ ۵۔ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت۔ ۶۔ یتیم کا مال کھانا اور ۷۔ میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا"۔

اسی طرح سات کی تعداد کا ذکر "ثواب الاعمال" کی روایت میں بھی ہے جو اسناد کے ساتھ محمد بن عمر حلبیؒ کے ذریعہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے بیان کی گئی ہے، جبکہ بعض دوسری روایات میں سات سے زیادہ کی تعداد کا تذکرہ بھی ہے۔

تعداد میں اختلاف "درحقیقت گناہ کی نوعیت کے اعتبار سے ہے، یعنی بعض گناہوں کو "کبیرہ" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بعض دوسرے گناہوں کی نسبت بڑے ہوتے ہیں۔ اور "صغیرہ" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بعض گناہوں کی نسبت چھوٹے ہوتے ہیں، اسکی مثال یوں سمجھئے کہ نامحرم کے بوسے لینا بھی گناہ ہے، اس کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے اور اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی گناہ اب اگر نسبت کو دیکھا جائے تو بوسہ، نگاہ کرنے کی نسبت صغیرہ ہے اور نگاہ کرنا بوسے لینے کی نسبت کبیرہ ہے لیکن زنا کی نسبت صغیرہ ہے، وغیرہ۔

اس بارے میں شیخ صدوقؒ نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "کبیرہ گناہوں کے بارے میں روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ "شرک" کے بعد ہر گناہ "کبیرہ" ہے البتہ اپنے سے چھوٹے کی نسبت ہے۔ اور کبیرہ گناہ "صغیرہ" ہے البتہ شرک کی نسبت سے"۔ تفسیر مجمع البیان میں اللہ تعالیٰ کے اس قول: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ" (نساء / ۳۱) اگر ان میں سے تم گناہان کبیرہ سے بچے رہو تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں سے بھی درگزر کریں گے۔ کی تفسیر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ: "کبیرہ" کے معنی میں بہت سے اختلافات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہر وہ گناہ کہ جس کے ارتکاب پر اللہ نے آخرت میں عذاب کی دھمکی دی ہے اور دنیا میں اس کیلئے حد مقرر کی ہے وہ کبیرہ ہے"۔ یہ تعریف سعید بن جبیر اور مجاہد سے مروی ہے، جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ "ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے نہی کی ہے وہ کبیرہ ہے"۔ یہ تعریف ابن عباس نے کی ہے اور یہی موقف ہمارے علما کا بھی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ: "ہر گناہ برائی ہونے کی حیثیت سے کبیرہ ہے، لیکن ان میں کچھ وہ ہیں جو دوسرے کی نسبت بڑے ہیں، جبکہ صغیرہ کوئی گناہ نہیں ہے البتہ اسے اس سے بڑے کی نسبت دیکھا جائے تو صغیرہ ہے لیکن سزا دونوں کیلئے ہے کسی کیلئے زیادہ اور کسی کیلئے کم"۔ اکثر روایات اسی چیز کو حاوی ہیں۔ جیسا کہ شیخ صدوقؒ نے اسناد کے ساتھ اور طبری

نے مجمع البیان میں، اور سب نے مل کر حضرت عبد العظیم بن عبد اللہ حسنی (شاہ عبد العظیم علیہ السلام) سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے والد گرامی سے سنا ہے اور انہوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ارشاد فرماتے سنا کہ :"عمرو بن عبید حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام عرض کیا اور بیٹھ گیا، بیٹھتے ہی اس نے اس آیت کی تلاوت شروع کر دی" وَ الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ "(شوریٰ / ۳۷) اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچے رہتے ہیں...... پھر خاموش ہو گیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا : "خاموش کیوں ہو گئے ہو ؟" اس نے کہا :"میں (آپؑ کی زبانی) کتاب اللہ کی رو سے "گناہان کبیرہ" سننا چاہتا ہوں کہ وہ کتنے اور کون کون سے ہیں ؟" اس پر امامؑ نے فرمایا :"ہاں عمرو! تو سنو! سب سے بڑا اور تمام کبیرہ گناہوں سے بزرگتر گناہ خدا کے ساتھ شرک کرنا ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے :" مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ "(مائدہ / ۷۲) جس نے خدا کا شریک بنایا، خدا نے اس پر بہشت کو حرام کر دیا۔ اس کے بعد خدا کی رحمت سے ناامیدی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے :" لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ "(یوسف / ۸۷) خدا کی رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی ناامید نہیں ہوتا۔ اس کے بعد خدا کی گرفت اور اس کے عذاب سے بے خوف ہو جانا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے :" فَلَا یَاۡمَنُ مَکۡرَ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ "(اعراف / ۹۹) خدا کے عذاب سے صرف نقصان اٹھانے والے ہی بے خوف رہتے ہیں۔ پھر والدین کی نافرمانی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے نافرمان کو "جبار شقی" قرار دیا ہے۔ اور پھر کسی مؤمن کو ناحق قتل کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :" وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡہَا "(نساء / ۹۳) جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا، جیسا کہ فرماتا ہے :" لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ "(نور / ۲۳) تہمت لگانے والوں پر دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت ہے اور ان کیلئے بڑا سخت عذاب ہے۔ یتیم کا مال کھانا، جیسا کہ فرماتا ہے : "اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا "(نساء / ۱۰) وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب جہنم واصل ہوں گے۔ میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا، جیسا کہ فرماتا ہے :" وَمَنۡ یُّوَلِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَہٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ "(انفال / ۱۶) اور جو شخص بھی اس دن ان (کفار) کی طرف اپنی پیٹھ پھیرے گا وہ یقیناً خدا کے غضب میں آ گیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔ سود کھانا، جیسا کہ فرماتا ہے : "اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ "(بقرہ / ۲۷۵) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے لپٹ کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ جادوگری، جیسا کہ فرماتا ہے :" وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ "(بقرہ / ۱۰۲) وہ یقیناً جان چکے تھے کہ جو شخص ان برائیوں کا خریدار ہوا وہ آخرت میں بے نصیب ہے۔ زنا، جیسا کہ فرماتا ہے :" وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ یَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا "(فرقان / ۶۸) اور جو شخص ایسا کرے گا وہ آپ اپنے گناہ کی سزا بھگتے گا کہ قیامت کے دن عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور اس میں ہمیشہ ذلیل و خوار رہے گا۔ جان بوجھ کر قسمیں کھانا، جیسا کہ فرماتا ہے :

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلاً اُوْلٰئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ ......" (آل عمران / ۷۷) بے شک جو لوگ اپنے عہد اور قسم جو خدا سے کیا تھا اس کے بدلے تھوڑا معاوضہ لے لیتے ہیں انہی لوگوں کے واسطے آخرت میں کچھ حصہ نہیں......۔خیانت کاری، جیساکہ فرماتا ہے :"وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" (آل عمران / ۱۶۱) اور جو شخص خیانت کرے گا تو جو چیز خیانت کی ہے قیامت کے دن وہی چیز (بعینہ خدا کے سامنے) لانا ہوگا۔واجب زکوٰۃ کی عدم ادائیگی ،جیساکہ فرماتا ہے :"فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ" (توبہ / ۳۵) پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی۔ جھوٹی گواہی دینا اور سچی گواہی کو چھپانا، جیساکہ فرماتا ہے :"وَمَنْ یَكْتُمْهَافَاِنَّهٗ آثِمٌ قَلْبُهٗ" (بقرہ / ۲۸۳) اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا تو یقیناً اس کا دل گناہ گار ہے۔شراب خواری بھی گناہ کبیرہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے ویسے ہی منع کیا ہے جس طرح بت پرستی سے روکا ہے۔نماز یا کسی اور فریضہ الٰہی کو جان بوجھ کر ترک کردینا، کیونکہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :"جو شخص نماز کو جان بوجھ کر ترک کرتا ہے وہ خدا اور رسولؐ کے ذمہ سے بری ہے"۔وعدہ شکنی اور قطع رحمی بھی گناہ کبیرہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :"لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ" (رعد / ۲۵) ان کیلئے لعنت ہے اور برا گھر (جہنم) ہے"۔یہ سن کر عمرو نے ایک درد بھری چیخ ماری اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا :"تباہی ہو اس شخص کیلئے جو اپنی رائے کے مطابق بات کرتا ہے اور آپ لوگوں سے علم و فضل میں مقابلہ کرتا ہے"۔

تھوڑا عمل بھی مقبول ہے اور زیادہ کی بھی گنجائش ہے

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (کچھ اعمال ایسے ہیں جس کا تھوڑا حصہ بھی مقبول ہے اور زیادہ سے زیادہ اضافہ کی گنجائش ہے) جیسے نماز تہجد کیلئے کھڑا ہونا کہ اس کا تھوڑا حصہ بھی مقبول ہے اور زیادہ سے زیادہ اضافہ کی گنجائش بھی ہے، جیساکہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :"یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلاَّ قَلِیْلاً نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلاً اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاً" (مزمل / ۱) اے چادر لپیٹنے والے !رات کو کھڑے ہو، مگر (پوری رات نہیں) تھوڑی رات، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کردو یا اس سے کچھ بڑھادو اور قرآن کو باقاعدہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔اسی طرح فرماتا ہے :"اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ وَ اللهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْكُمْ فَاقْرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ" (مزمل / ۲۰) اے رسول! تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ تم اور تمہارے چند ساتھ کے لوگ (کبھی) دو تہائی رات (کبھی) آدھی رات ،(کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہو۔اور خدا ہی رات اور دن کا اچھی طرح اندازہ کرسکتا ہے اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اس پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہوسکتے، تو اس نے تم پر مہربانی کی تو جتنا آسانی سے ہوسکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو یعنی نماز شب جتنا میسر ہوسکے پڑھو، تو یہاں پر "نماز" کو "قرآن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس لئے کہ نماز شب قرآن مجید کو اپنے اندر لئے ہوتی ہے۔اور قرائت قرآن کی مانند ہے، اور قرآن مجید نماز میں پڑھا جائے تو دل کو زیادہ بھاتا ہے۔اور اس کا تعلق ایسی قربۃً الی اللہ عبادات سے ہے جن کا قلیل حصہ بھی مقبول ہے۔اور لوگوں کیلئے زیادہ سے زیادہ کی گنجائش بھی اس کے اندر رکھی گئی ہے اور

آخری آیت کی دو تفسیروں میں سے ایک میں یہی تفسیر کی گئی ہے۔ چنانچہ مجمع البیان میں حضرت امام رضاؑ سے روایت ہے، انہوں نے اپنے آباءواجداد سے روایت کی ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں: "مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ" کی تفسیر یہ ہے کہ جو کچھ قرآن سے میسر ہو، تمہارے لئے اس میں قلبی خشوع بھی ہے اور صفائے باطن بھی"۔

﴿ تتمہ ﴾

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس فصل کے تتمہ کے طور پر چند مفید امور کا تذکرہ کیا جائے تاکہ قارئین کرام کی بصیرت میں اضافہ ہو۔

امر اول:

قرآن مجید کی تعریف و توصیف

یہاں پر ہم قرآن مجید کے نازل کرنے کے فوائد اور اس کے انداز، رموز و اشارات اور اسماء والقاب کے بارے میں گفتگو کریں گے: تو خداوند عالم آپ کا بھلا کرے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید اصل میں مکتوبی صورت میں تھا جیسا کہ اس کا اپنا ہی فرمان ہے: "فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ لاَّ يَمَسُّهٗ اِلاَّ الْمُطَهَّرُوْنَ" (واقعہ / ۷۹) جو کتاب محفوظ میں ہے، اس کو تو بس وہی لوگ مس کرتے ہیں جو پاک ہیں۔ نہ تو صحیفے کی صورت میں تھا اور نہ کاغذ اور اوراق میں۔ اس لئے کہ یہ اس وقت وجود میں آیا جب ابھی "انفس" اور "آفاق" کا نام ونشان ہی نہیں تھا۔ اور ہم اپنی ابتدائی وجودی زندگی میں کمزور عقل اور ضعیف آنکھوں کے مالک تھے۔ اور ہماری قوت بصارت کی رسائی اس کی تحریروں اور اس کے باعظمت کلمات کے اطراف واکناف تک نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کے حروف بڑے باعظمت اور اس کے کلمات بڑے ہی بلند وبالا تھے۔ تو ہم نے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی زبان احتیاج سے بڑے عجز و نیاز سے یہ عرض کیا: "اے ہمارے معبود! ہمارے حال پر رحم فرما! ہمارے قصور سے درگزر فرما! ہمیں اپنی رحمتوں اور بخشش کی وسعتوں سے مایوس نہ فرما! ہمیں ایسے راستے کی رہنمائی فرما کہ جس کے ذریعے ہم تیرے کلمات کا مطالعہ کر سکیں اور اس طرح سے تیری جنت اور رضوان تک رسائی حاصل کر سکیں"۔

تو ہمارے رب نے ہم پر اپنی عمومی عنایت، اپنی حکمت کاملہ، اپنی رحمت واسعہ اور اپنی قدرت بالغہ کے صدقے میں رحم فرمایا اور ہمیں اپنی مجموعی کتب کے اسرار کا ایک مختصر نسخہ اور اپنے کلمات تامہ کے معانی کا ایک مختصر سا مجموعہ عنایت فرمایا۔

وہ قرآن کریم، صراطِ مستقیم، نازل کردہ از طرف پروردگارِ عزیز ورحیم ہے۔ جو نبی امین کے دل پر اتارا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے بندوں کو نفسانی خواہشات کی زنجیروں اور شیطان ملعون کے وسوسوں کی گرفت سے نجات دلائے۔ اگر اس کے مقدس چہرے سے عزت کی نقاب اور عظمت وکبریائی کے پردے ہٹا دئے جائیں تو ہر بیمار کو شفا بخشے، ہر پیاسے کی تشنگی بجھائے اور اخلاق ذمیمہ کی مرض کے شکار دلوں اور تباہ کن جہالتوں کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کا علاج کرے۔ تعلقات کی زنجیروں میں جکڑے قیدیوں اور

اہل و عیال اور خواہشات کی محبت سے دلوں کو مزین کرنے والوں کا نجات دہندہ ہے۔

بایں ہمہ خصوصیات :وہ اپنی قدر و منزلت کی عظمتوں، اپنی شان کی بلندیوں اور اپنی رفعتوں کے آسمانوں پر سر فراز و سر بلند ہے۔ اس کے باوجود اس نے ہماری ہدایت کا سامان فراہم کرنے کیلئے حروف واصوات اور الفاظ و عبارات کا لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ اور یہ ذاتِ کردگار کا اپنے بندوں پر احسان اور اپنی مخلوق پر مہربانی ہے۔ تاکہ یہ مقدس کلام اس کے بندوں کے اذہان وافہام سے قریب تر ہو اور ان کے ذوق کی تسکین کرے۔ ورنہ کہاں ہم خاک کے پتلے اور کہاں وہ رب الارباب۔ یہ اس کی شفقت، مہربانی اور عین عنایت ہے کہ ایسا کلام ہمیں عطا فرمایا جس کے ہر ایک حرف میں ہزاروں رموز و اشارات اور ہر لفظ میں لاکھوں اسرار و کنایات پوشیدہ ہیں۔

یہی وجہ کہ ہے کہ کافی میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے، آپؑ فرماتے ہیں کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا: "لوگو! تم اس وقت امن و سکون کے گھر میں ہو اور سفر کی پیٹھ پر سوار ہو اور تمہیں تیزی سے چلایا جارہا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ رات اور دن اور سورج اور چاند، ہر جدید کو فنا کے گھاٹ اتار رہے ہیں اور ہر دور کو نزدیک سے نزدیک تر لا رہے ہیں۔ اور وعدہ کردہ چیز کو پہنچا رہے ہیں۔ لہٰذا تم اپنے لئے سامان سفر باندھ لو اس لئے کہ تمہیں دور دراز کا سفر در پیش ہے"۔ اس پر حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہو گئے اور بارگاہ رسالتؐ میں عرض کیا: "حضور! یہ امن و سکون کا گھر کونسا ہے؟" فرمایا: "یہی ملنے اور جدا ہونے کا گھر، لہٰذا جب فتنے تمہارے لئے تاریک رات کے ٹکڑوں کی مانند تمہیں اپنی تاریکی کی لپیٹ میں لے لیں تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے دامان سے وابستہ ہو جاؤ، کیونکہ یہ ایک ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت قبول ہوگی۔ اور ایسا مدعی ہے جس کی باتیں صداقت پر مبنی ہیں۔ جو اسے اپنا پیشوا قرار دے گا اسے وہ بہشت تک جا پہنچائے گا۔ اور جو اسے پیٹھ دے گا اسے وہ جہنم کی طرف لے جائے گا۔ یہ ایک ایسا رہنما ہے جو بہترین راہ دکھاتا ہے۔ ایسی کتاب ہے جس میں تفصیل، بیان اور تحصیل ہے۔ حق اور باطل کے درمیان حد فاصل ہے، اس میں کوئی بے مقصد بات نہیں۔ اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اس کا ظاہر بڑا دلفریب اور باطن بڑا گہرا ہے۔ اس کی کئی سرحدیں ہیں اور پھر ان کی کئی اور سرحدات ہیں(۱)۔ اس کے عجائبات کا کوئی شمار نہیں، اس کے غرائب کبھی بوسیدہ نہیں ہوتے۔ اس میں ہدایت کے چراغ اور حکمت کے مینار ہیں، جو اس کی صفت کو جان لیتا ہے اسے وہ معرفت کی رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ اپنی نظروں کو ہر طرف دوڑائے۔ اور اپنی نظروں کو اس کی صفت تک پہنچائے اس طرح وہ ہلاکتوں سے نجات پا جائے گا اور تباہی کی دلدل سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔ کیونکہ اس میں غور و فکر کرنے سے صاحبان بصیرت کے دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ بالکل ویسے جیسے کوئی تاریکیوں میں نور کا چراغ لے کر چلتا ہے۔ لہٰذا تم پر ضروری ہے کہ اچھے انداز میں اسے فوراً اپنانے کی کوشش کرو اور انتظار مت کرو۔"

یہ اپنی انتہائی عظمت اور جلالت قدر کی وجہ سے مختلف ناموں سے موسوم اور لاتعداد القاب سے ملقب ہے، کیونکہ جب جلالت اور رفعت کے لحاظ سے کسی چیز میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی شان اور تعریف میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے ناموں میں سے :

(۱) بعض نسخوں میں لفظ "نجوم" ہے جس کے معنی ہیں ستارے۔ جس کی تفسیر علامہ مجلسیؒ نے اپنی کتاب " عین الحیٰوۃ "میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے کی ہے۔

۱۔ایک نام "اَلْکِتَاب" ہے۔جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ" (بقرہ / ۲) یہ وہی کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

۲۔ "قرآن" ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ" (واقعہ / ۷۷) بے شک یہ بڑے مرتبے کا قرآن ہے۔

۳۔ "فرقان" ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کے درمیان حد فاصل ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ" (بقرہ / ۱۸۵) حق وباطل کے درمیان تمیز کیلئے روشن نشانیاں ہیں۔

۴۔ "نور" ہے کیونکہ یہ نور عقلی ہے جس کے ذریعہ مبدا ومعاد کے حالات ظاہر ہوتے ہیں، اسی کے ذریعہ سے چیزوں کی حقیقتوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اجسام کے بیابانوں اور بحر نفوس کی تاریکیوں میں ہدایت کی راہیں حاصل کی جاتی ہیں، آخرت کی راہوں پر چلنے والوں کیلئے جنت اور جہنم کی راہیں نظر آتی ہیں ارشاد خداوند عالم ہے: "قَدْ جَائَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" (مائدہ / ۱۵) تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور صاف بیان کرنے والی کتاب (قرآن کی صورت میں) آچکی ہے۔

۵۔ "حکمت" ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (جمعہ / ۲) اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ جبکہ "حکمت" نام ہے اس افضل ترین علم کا جس کی معلومات پختہ، مضبوط اور ٹھوس ہوتی ہیں۔ اور اس زیور سے صرف وہی لوگ آراستہ ہوتے ہیں جو بشریت کے پردوں سے پیراستہ اور اس جہان دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" کے بعد فرمایا ہے: "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَ اللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" (جمعہ / ۴) یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور خدا بڑے فضل وکرم کا مالک ہے۔

۶۔ "روح" ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "يُلْقِي الرُّوْحَ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ" (مؤمن / ۱۵) وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح (وحی) نازل کرتا ہے تاکہ وہ (بندہ) لوگوں کو ملاقات (قیامت) کے دن سے ڈرائے۔

۷۔ "حق" ہے، کیونکہ اس کی حقیقت ابدی ہے اس میں کبھی تغیر وتبدل واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ "حق" کا معنی ہے ہی ثبوت وپائیداری۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ایسا صادق ہے جو واقعہ کے مطابق ہوتا ہے، اسے شک وتردید کی گرد کبھی میلا نہیں کرتی۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِنْ نَّذِيْرٍ" (سجدہ / ۳) بلکہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے "حق" ہے تاکہ تم ان لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ جن کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا نہیں۔

۸۔ "ہدایت" ہے، کیونکہ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور خداوند عالم فرماتا ہے: "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" (بقرہ / ۲) متقین کیلئے ہدایت ہے۔ ایک اور جگہ پر فرماتا ہے: "ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ" (انعام / ۸۸) یہ خدا کی ہدایت ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی وجہ سے راہ راست پر لائے۔

۹۔ "ذکر" ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ" (زخرف / ۴۴) اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کیلئے ذکر (نصیحت) ہے اور عنقریب تم لوگوں سے اس کی بازپرس کی جائے گی۔ اس کا نام ذکر اس لئے ہے

کہ یہ امور آخرت اور مبدا و معاد کے احوال کی یاددہانی کراتا ہے۔

۱۰۔ "نباء عظیم" ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی عظیم خبر ہے جو غیب اور غائبین کے عالم کی خبریں دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "قُلْ هُوَ نَبَاءٌ عَظِيمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ" (ص / ۶۷ / ۶۸) اے رسول کہ دیجئے کہ یہ (قرآن) ایک بڑی خبر ہے جس سے تم لوگ خواہ مخواہ منہ پھیرتے ہو۔

۱۱۔ "شفاء" ہے کیونکہ اس سے امراض نفسانیہ اور اسقام باطنیہ سے شفا ملتی ہے جیساکہ خداوند عالم فرماتا ہے: "قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا هُدًى وَّشِفَآءٌ" (فصلت / سجدہ / ۴۴) اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ یہ (قرآن) ہدایت اور (ہر مرض) کی شفاء ہے۔

۱۲۔ "رحمت" ہے۔ ارشادِ پروردگار ہے: "وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ" (نحل / ۶۴) اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) تو اسی لئے نازل کی تاکہ جن باتوں میں یہ جھگڑا کرتے ہیں ان کو تم صاف صاف بیان کرو اور علاوہ ازیں یہ (کتاب) ایمانداروں کیلئے از سر تا پا ہدایت و رحمت ہے۔

۱۳۔ "علیٌ حکیم" ہے، جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ" (زخرف / ۴) اور بے شک یہ قرآن اصل کتاب میں (بھی جو) ہمارے پاس ہے۔ یقیناً بڑے رتبے کی اور پر از حکمت ہے۔ "علی" اس لئے کہ اس کی اصل عالم علوی سے ہے اور "حکیم" اس لئے کہ اس کی حکمت کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسکے اور بھی بہت سے نام ہیں مثلاً:

۱۴۔ تنزیل ۱۵۔ بشیر ۱۶۔ نذیر ۱۷۔ عزیز ۱۸۔ موعظہ حسنہ ۱۹۔ مجید۔

یہ اسماء مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پیش کئے گئے ہیں ورنہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ اسامی اور اوصاف کی کثرت مسمّیٰ اور موصوف کی عظمت و جلالت پر دلالت کرتی ہے اور خداوند عالم خود ہی اپنے کلام کی جلالت شان اور اپنی کتاب کے مرتبہ و مقام کی رفعتوں کو بہتر جانتا ہے۔

امر ثانی:

کیا یہ وہی قرآن ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے؟

ایک ضروری گزارش

قارئین کرام سے ایک نہایت ہی ضروری گزارش ہے کہ مندرجہ بالا عنوان ایک نہایت ہی معرکۃ الآرا بحث کا موضوع ہے اور اسلام کے تمام فرقوں نے اس پر اچھی خاصی طبع آزمائی کی ہے۔ مصنف "منہاج البراعہ" نے بھی اس موضوع پر تفصیل اور دلائل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور بحث کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اس پر مدلل طریقے سے خامہ فرسائی کا حق ادا کیا ہے۔ چونکہ بحث بہت عمدہ اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی نازک اور پیچیدہ نکات پر مشتمل ہے لہذا اسے آخر تک پڑھنے سے پہلے اپنی رائے قائم کر کے کسی قسم کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ تحقیق کا حق ہر ایک کو حاصل ہے، لہذا دلیل کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مترجم۔

مقدمہ :

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جو قرآن روح الامینؑ حضرت سید المرسلین صلوات اللہ علیہ و آلہ اجمعین کے پاس لے کر آئے آیا یہ وہی ہے جو دو دفتیوں (جلدوں) کے درمیان ہمارے پاس موجود ہے یا نہ ؟ بلکہ جو ہمارے پاس موجود ہے وہ اس قرآن کا ایک حصہ ہے اور اصل قرآن جسے جبرائیل امین آنحضرتؐ کے پاس لائے اس میں تحریف، تبدیلی اور کمی بیشی واقع ہو چکی ہے ؟ تو اس بارے میں صاحبان نظر کی مختلف آراء ہیں :

اخباریوں کا موقف : اکثر اخباری حضرات کا موقف کہ جسے سید نعمت اللہ جزائری نے اپنے رسالہ "منبع الحیات" اور کتاب "انوار نعمانیہ" میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ "قرآن مجید میں تحریف، کمی اور زیادتی کی گئی ہے"۔ یہ موقف علی بن ابراہیم قمیؒ، ان کے شاگرد رشید محمد بن یعقوب کلینیؒ، شیخ احمد بن ابی طالب طبرسیؒ اور محدث جلیل القدر علامہ مجلسی رحمہم اللہ کا ہے۔

اصولیوں کا موقف : بنابر منقول سید مرتضیٰؒ، اسی طرح شیخ صدوقؒ اپنے رسالہ اعتقادات صدوق میں، شیخ طوسیؒ التبیان میں اور مفسر طبرسیؒ مجمع البیان میں مذکورہ نظریئے کے برعکس رائے رکھتے ہیں اور اسی بات کی نسبت جمہور مجتہدین کی طرف بھی دی گئی ہے بلکہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کے نظریہ کے مطابق اسی پر علماء و مجتہدین امامیہ کا اجماع ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب "اعتقادات صدوق" میں فرماتے ہیں :

شیخ صدوقؒ کا نظریہ "قرآن مجید کے بارے ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے جو قرآن اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل کیا ہے وہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیان موجود اور لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ اس سے زیادہ نہیں ہے،...... (یہاں تک کہ کہتے ہیں) اور جو شخص ہماری طرف اس بات کی نسبت دیتا ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن اس سے زیادہ ہے تو وہ جھوٹا ہے"۔

شیخ طوسیؒ کا نظریہ اسی طرح شیخ طوسیؒ بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ اس میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ان سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں : "رہی یہ بات کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس میں بیشی یا اضافہ کے بارے میں اس بات پر اجماع ہے کہ ایسی بات بالکل جھوٹی ہے، البتہ کمی کے بارے میں بھی ظاہر یہی ہے کہ مسلمانوں کا موقف اس کے برعکس ہے۔ اور یہی بات مذہب کے بھی بالکل مطابق ہے۔ اور سید مرتضیٰؒ بھی اسی بات کی حمایت کرتے ہیں اور اور روایات سے بھی یہی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں البتہ عامہ و خاصہ (سنی اور شیعہ) کی طرف سے بہت سی ایسی روایات ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "قرآن مجید کی بہت سی آیات میں کمی واقع ہوئی ہے"۔ لیکن ان روایات کا شمار آحاد میں ہوتا ہے جو علم اور یقین کا موجب نہیں بن سکتیں، لہذا بہتر یہی ہے کہ ان سے روگردانی کر لی جائے اور ان سے کام نہ رکھا جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی تاویل کی جائے"۔

مفسر طبرسیؒ کا موقف

مفسر طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں اسی موقف کی تائید کی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: "اس میں کسی قسم کے اضافے کی بات تو اجماعی طور پر باطل ہے۔ البتہ اس میں کمی کے بارے میں ہمارے علماء میں سے بعض حضرات اور اہل سنت کے بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس میں تبدیلی اور کمی واقع ہوئی ہے جبکہ ہمارے علماء کا صحیح موقف یہ ہے کہ تبدیلی اور کمی واقع نہیں ہوئی"۔ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں "اسی موقف کی حمایت سید مرتضیٰؒ نے کی ہے اور اس بارے میں انہوں نے "المسائل الطرابلسیات" کے جواب میں اس بات کا حق ادا کر دیا ہے اور بعض دیگر مقامات پر فرمایا ہے کہ قرآن پاک کی صحت نقل کے بارے میں اسی قدر علم ویقین ہے جس قدر ملکوں، شہروں، بڑے بڑے واقعات، عظیم حوادث، مشہور کتب اور تحریر شدہ اشعار وغیرہ کے بارے میں علم ویقین ہے۔ کیونکہ شدت کے ساتھ خاص توجہ اور فراوانی کے ساتھ اسباب وعلل اس کی نقل اور حفاظت پر خاص دلیل ہیں اور اس حد تک خاص توجہ اور اسباب وعلل کی فراوانی کسی اور چیز کے بارے میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن پاک نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور مسلم علماء نے اس کی حفظ وحراست میں اپنی آخری کوششیں تک صرف کر دی ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس کے اعراب، قرائت اور حروف وآیات میں جو اختلاف دیکھا اسے بھی بیان کیا ہے تو پھر اس قدر شدید توجہ اور سچی کوششوں کے ہوتے ہوئے اس میں کس طرح تبدل وتغیر یا کمی بیشی ہو سکتی ہے؟" ....

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "سید مرتضیٰؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں جو بھی شخص اختلاف کرے خواہ اس کا تعلق امامیہ سے ہو یا دوسرے عوام الناس سے تو ان کے اس اختلاف کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور اسے قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ اس بارے میں صرف اہل حدیث (اخباری حضرات) ہی نے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے ضعیف حدیثوں کا سہارا لیا ہے اور انہیں نقل کر کے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ صحیح حدیثیں ہیں.........." (منقول از مجمع البیان)

خلاصۂ کلام

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اور اس قسم کی دوسری عبارتیں جو اوپر گزر چکی ہیں اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ: "جو قرآن اس وقت دو دفتیوں کے درمیان ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں کسی قسم کی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے"۔ ہاں البتہ اس بات پر اجماع کے دعوے میں اختلاف ہے، اور جیسا کہ آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں شیخ صدوقؒ نے یہ بات کی ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے واقع نہ ہونے کا اجماع ہے اور اس کی نسبت امامیہ عقیدے کی طرف دی ہے۔ ابھی ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ شیخ طوسیؒ اور مفسر طبرسیؒ نے اس بات کو اچھی طرح صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ "اس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہے"۔

محقق کاظمیؒ کیا کہتے ہیں

متاخرین میں سے سید محقق کاظمیؒ اس بارے میں ان کے ہم نوا ہیں اور وہ اپنی کتاب "شرح وافیہ" میں کہتے ہیں: "تمام حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے اور کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں ہے کہ قرآن پاک میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہے، اور روایات بھی اس پر شاہد ناطق ہیں۔ اور سید مرتضیٰؒ نے اگرچہ اس پر اجماع کا دعویٰ تو نہیں کیا، لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس بات پر علم ضروری کی حد تک شدید مصر ضرور ہیں"۔

مصنف کی رائے

مصنف مرحوم فرماتے ہیں کہ جب آپ یہ سب باتیں جان چکے ہیں تو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس

بارے میں میرا جو نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اضافہ تو نہیں البتہ کمی ضرور ہے۔اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر فریقین کے دلائل کوذکر کیا جائے تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ توسب سے پہلے ہم ان لوگون کے دلائل کوذکر کریں گے جو قرآن مجید میں تحریف، کمی یازیادتی کی نفی کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ اپنے مدعامیں کس حد تک بر حق ہیں۔اس کے بعد ان لوگوں کے دلائل ذکر کریں گے جو تحریف کے قائل ہیں۔ توسب سے پہلے تحریف کی نفی کرنے والوں کے دلائل پیش کرتے ہیں :

﴿منکرین تحریف کے دلائل﴾

ان دلائل میں سے کچھ تووہ ہیں جو مطلقاً تحریف کی نفی کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو صرف اضافے یازیادتی کاانکار کرتے ہیں :

۱۔ سابقہ گفتگو میں شیخ صدوقؒ ، شیخ طوسیؒ اور مفسر طبرسیؒ کے کلام سے اجماع کا ثبوت گزر چکا ہے۔

تبصرہ :اگر ہم اجماع منقول کی حجیت کو تسلیم بھی کرلیں تو بھی اس اجماع کی حجیت ظن (گمان) کا فائدہ دے رہی ہے اور وہ اس قطع (یقین) کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو اخبار واحادیث متواترہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے جو قرآن مجید میں کمی کی نشاندہی کرتی ہیں، البتہ اس بارے میں عنقریب آپ کو بہت کچھ معلوم ہوجائے گا انشاء اللہ۔ ہاں البتہ یہ اجماع ان لوگوں پر حجت ہوسکتا ہے جو قرآن میں زیادتی کے قائل ہیں، کیونکہ جو ظن اس اجماع سے حاصل ہوتا ہے ان دلائل پر حاوی ہے جو قرآن مجید میں اضافے کی نشاندہی کرتی ہیں۔

۲۔ سید مرتضیٰؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلام مجید کے حفظ وحراست اور اسے بچانے اور محفوظ رکھنے کیلئے کافی کوششوں سے کام لیا گیا اور ہمیشہ اس کی حفاظت ، نگرانی اور ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کیلئے مسلسل کوششیں چلی آرہی ہیں اس لئے یہ آج تک ہر قسم کی تحریف اور کمی زیادتی سے محفوظ چلا آرہا ہے۔ اس لئے کہ یہ معجزہ نبوتؐ ہے، علوم شرعیہ کا ماخذ ہے اور احکام دینیہ کا اس پر دارومدار ہے۔

تبصرہ :اس دلیل میں دوباتیں بتائی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ قرآن مجید اعجاز اور چیلنج کی حیثیت کا حامل ہے اور دوسرے یہ کہ علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے۔ تو اس طرح سے وہ اپنے مدعا کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اگر نبوت کے ثبوت کا انحصار صرف اسی پر ہوتا جس طرح کہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے ثبوت کا انحصار طب میں تھا یعنی وہ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کر دیتے تھے جس کی وجہ سے ان کی نبوت ثابت ہوئی تھی۔ یا جس طرح حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا انحصار ان کے عصا اور ید بیضاء جیسے معجزات پر تھا۔ پھر تو ہم کہہ سکتے تھے کہ آنحضرتؐ کی نبوت کے ثبوت کا انحصار چونکہ قرآن مجید پر تھا اس لئے یہ ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ لیکن قرآن تو حضورؐ کے دیگر معجزات کی طرح ایک معجزہ تھا اور فقط اس پر آپؐ کی نبوت کا دارومدار نہیں تھا، لہذا اگر اس میں کوئی تصرف ہوا بھی ہے تو اس سے جنابؐ کی نبوت میں کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس کے علاوہ بھی آپؐ کی نبوت کے ثبوت کیلئے دیگر معجزات موجود تھے۔

ایک سوال اور اس کا جواب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ آپؐ کا صرف یہی ایک معجزہ نہیں تھا، دوسرے

معجزات بھی تھے لیکن یہ ان سب سے اظہر من الشمس، قوی ترین اور مضبوط ترین معجزہ تھا۔ لہذا اس کی حفاظت کیلئے کثرت سے اہتمام کیا گیا ہے۔

(پہلی بات کا جواب): تو اس کا جواب یہ ہے کہ اعجاز جس طرح کل کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح بعض کے ساتھ بھی تو حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے اعجاز کا سرچشمہ اس کی فصاحت و بلاغت، اچھوتا اسلوب اور حسن نظم ہے۔ تو وہ ابھی تک اپنی حالت پر باقی ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور اس میں تحریف ہونے نے اسے نبوت و رسالت کی دلیل ہونے سے خارج نہیں کیا، بلکہ بالفرض عیاذاباللہ اس کی تمام آیات بھی اعجاز کی اہمیت کھو دیں پھر بھی اس کی ایک آیت ہمارے لئے معجزے سے کم نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ" (قصص / ۷) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے پاس یہ وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلالو پھر جب اس کی نسبت تم کو کوئی خوف ہو تو اس کو (ایک صندوق میں رکھ کر) دریا میں ڈال دو اور اس پر تم کچھ نہ ڈرنا اور نہ خوف کھانا، یقیناً ہم اسے پھر تمہارے پاس پہنچادیں گے اور اسے اپنا رسول بنائیں گے۔ کیونکہ اس کے مختصر ہونے کے باوجود اس میں دو امر ہیں، دو نہی ہیں، دو خبریں ہیں اور دو بشارتیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی شخص نے ایک بدو عورت کو کچھ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا: "خدا تمہارا بھلا کرے تم کس قدر فصاحت کی مالک ہو!" اس نے کہا: "میں کیا ہوں! فصاحت تو خدا ہی کی ہے" پھر اس نے یہ آیت تلاوت کی اور کہا: "آیت کس قدر فصاحت کی حامل ہے، ارشاد ہوتا ہے"، "وَ قِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآئَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَاءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ" (ہود / ۴۴) اور جب خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اے زمین! اپنا پانی جذب کرلے اور اے آسمان! برسنے سے تھم جا اور پانی گھٹ گیا اور لوگوں کا کام تمام کر دیا گیا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری۔ "کیونکہ اس میں فصاحت کی کئی وجوہ پائی جاتی ہیں(۱) جس سے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ قریش میں سے جو کوئی بھی فصیح کلام بولتا تھا تو فخر و مباہات کے طور پر اسے خانہ کعبہ پر لٹکا دیتا تھا، لیکن جب یہ آیت نازل نازل ہوئی تو وہ سب رات کی تاریکی میں گئے اور اپنے معلق کلاموں کو وہاں سے اتار لیا تاکہ مزید رسوائی سے بچ جائیں۔ تفسیر مجمع البیان میں روایت ہے کہ کفار قریش نے قرآن مجید کے مقابلے کی ٹھان لی اور گندم کے نشاستے دنبوں کے گوشت اور خالص انگوروں کی شراب کا چالیس دن کا بندوبست کیا اور اس کے

---

(۱) ان وجوہات میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ ۱۔ اس میں لفظ "قیل" ہے جس کے معنی ہیں "کہا گیا" اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خداوند سبحانہ اپنے جلال و عظمت اور سربلندی کے مقام پر ہے اور ذہنی تبادر اور فکری توجہ اس کے سوا کسی اور "قائل" کی طرف نہیں جا سکتی۔ یعنی کہنے والا صرف وہی پروردگار ہے۔ ۲۔ زمین اور آسمان سے بھی اس انداز سے خطاب کیا جا رہا ہے جس انداز سے صاحبان عقل سے خطاب کیا جاتا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین و آسمان جمادات ہونے کے باوجود خضوع و خشوع، اطاعت اور تکوینی امور کے قبول کرنے میں صاحبان عقل کی مانند ہیں جو تکلیفی امور کو قبول کرتے ہیں۔ اور خدا کا حکم ان میں بھی نافذ العمل ہے اور وہ خدا کے قہر و غلبہ اور قدرت و طاقت کے تحت مقہور و مغلوب ہیں۔ خواہ شدت اور قوت و عظمت کے لحاظ سے سب مخلوق سے زیادہ ہی کیوں نہیں۔ ۳۔ "قُضِيَ الْاَمْرُ" اس بات کی دلیل ہے کہ خالق کائنات نے ازل سے جو قضا و قدر متعین کی ہے وہ حتمی اور لازمی ہے اس سے کسی کو مجال نہیں، اور وہ واقع ہو کر رہتی ہے۔ اس کے فیصلوں کو کوئی نہیں ٹھکرا سکتا، اور نہ زمین و آسمان میں اس کے حکم کو ہونے سے کوئی روک سکتا ہے۔ ۴۔ الفاظ کے تقابل اور معنی کے اختلاط میں ایک طرح کا حسن پایا جاتا ہے ۵۔ صورت حال کی تصویر کشی میں حسن پایا جاتا ہے۔ ۶۔ اختصار تو اس حد تک لیکن کوئی بھی ضروری بات کہنے سے رہ نہیں گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں جو صاحبان غور و تدبر کو حاصل ہو سکتی ہیں۔

مقابل کا کلام تیار کرنے کیلئے سر جوڑ کر بیٹھے، لیکن جب یہ آیت (و قیل یا ارض ......) سنی تو ان کے ذہن چکرا گئے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر منتشر ہو گئے۔

بہر صورت، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں اگر تحریف واقع ہوئی ہے تو اسے اعجاز کی حد سے نہیں نکالا کہ نبوت خاصہ کسی دلیل کے بغیر رہ جائے۔ اس لئے کہ اس میں فصاحت اپنے حال پر باقی ہے بلکہ اعجاز کی دیگر وجوہ بھی اس کے اندر موجود ہیں جیسے اس کا قصص و حکایات اور غیب کی خبروں پر مشتمل ہونا اور اس کے طوالانی ہونے کے باوجود اس میں کسی قسم کے اختلاف کا نہ ہونا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات ہیں۔

(دوسری بات کا جواب): اب رہی دوسری بات کہ احکام دینیہ اور مدارک شرعیہ کا اسی قرآن پاک ہی پر دارومدار ہے اسے بھی ہم تسلیم کرتے ہیں، لیکن جو بات اخبار و روایات کی رو سے یقینی ثبوت کی حامل ہے وہ یہ کہ تحریف صرف ان آیات میں ہوئی ہے جو اہل بیت اطہار کے فضائل اور اہل نفاق کی رسوائیوں پر مشتمل تھیں۔ رہیں وہ آیات جو احکام پر مشتمل ہیں ان کے بارے میں ابھی تک کوئی ایسی روایت نہیں مل سکی جو یہ بتائے کہ ان میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ لہذا قطعی دلائل جو ان کے ظواہر پر عمل کو جائز قرار دیتی ہیں اور احکام شرعیہ کے استنباط کو صحیح قرار دیتی ہیں وہ تو محکم ہی ہیں اور ان کے بارے میں کوئی مانع ثابت نہیں۔ لہذا اس کے تقاضوں سے دستبرداری نہیں کی جاسکتی اور مانع کے وجود کا صرف احتمال تقاضوں سے ہاتھ کھینچ لینے کیلئے کافی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن مجید کا احکام شرعیہ کا ملاک و ماخذ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آیات احکام میں تحریف اور نقص واقع نہیں ہوا اور فقط انہی آیات کے بارے میں کثرت سے اسباب کا وجود ثابت ہوتا ہے نا کہ مطلقاً تمام آیات میں۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم بالکل ہی اپنے موقف سے ہٹ کر بات کریں ورنہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ قرآن مجید کا احکام شرعیہ کیلئے ملاک و ماخذ ہونے کا تقاضا ہے کہ اس کی ہر لحاظ سے حفاظت کی جائے اور وہ ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہو لیکن یہ بات اس وقت صحیح ہو گی جب کوئی مانع موجود نہ ہو اور خود بندے لطف پروردگار کو اپنے سے دور نہ بھگائیں، کیونکہ یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ لوگوں نے یا تو اسے ضائع کر دیا یا اسے چھپا دیا۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ اسے محفوظ رکھتے اور اس کا اعلان کرتے۔ اس کی عمدہ اور بہترین مثال "امام" کا وجود ہے۔ اس لئے کہ حضرت رسالتمابؐ نے امام کی حفاظت اور اعانت کی وصیت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ امام اللہ کی مخلوق پر حجت خدا ہوتا ہے، خدائی احکام و شریعت کی اصل اور بنیاد ہوتا ہے، وغیرہ۔ کہ جن کی بنیاد پر امام کی حفاظت ضروری تھی، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کیلئے ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ اسے پردہ غیبت اختیار کرنا پڑا اور اس کا وجود ہماری دسترس سے باہر ہو گیا، کیا ہی بہتر کہا ہے صاحب تجرید نے کہ:

"امام کا وجود لطف پروردگار ہے اور اس کا تصرف ایک اور لطف ہے لیکن وہ ہماری دسترس سے باہر ہے"

اگر یہ بات بالفرض ثابت بھی ہو جائے کہ آیات احکام میں بھی تحریف اور کمی واقع ہوئی ہے تو یہ غیبت امام سے بڑھ کر زیادہ بعید نہیں ہے۔ جس طرح خدا کے بندے ہی غیبت امام کا سبب ہوئے ہیں اور انہیں تبلیغ احکام اور ان کی طرف رجوع کرنے سے مانع

ہوئے ہیں حالانکہ امامؑ احکام الٰہی کی بنیاد اور اسلام کا ستون ہوتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں تحریف اور کمی کر کے قرآن سے اسلامی احکام اور شرعی مسائل کے استنباط سے مانع ہوئے ہیں۔

۳۔ اللہ عالیٰ فرماتا ہے: "وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ" (سجدہ / ۴۱۔۴۲) اور یہ (قرآن) جو یقیناً ایک عالی مرتبہ کتاب ہے کہ باطل نہ تو اس کے آگے ہی بھٹک سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ چونکہ تحریف ایک امر باطل ہے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ باطل اس کے پیچھے سے آگیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے باطل سے محفوظ رہنے کی خبر دی ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ قرآن تحریف سے محفوظ ہے۔

تبصرہ: اس آیت میں یہ مراد ہے کہ قرآن نے ماضی کے بارے میں جو خبریں دی ہیں نہ تو وہ باطل ہیں اور نہ وہ جو مستقبل کے بارے میں دی ہیں وہ باطل ہیں، بلکہ اس کی دی ہوئی تمام خبریں صحیح، سچی اور برحق ہیں۔ اسی بات کو مفسر طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کی زبانی ذکر کیا ہے نیز تفسیر قمی میں ابوالجارود، حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں، امامؑ نے فرمایا: "اس کے پاس نہ تو توریت کی طرف سے باطل آسکتا ہے اور نہ ہی انجیل و زبور کی طرف سے، نہ اس کے پیچھے یعنی اس کے بعد کوئی اور کتاب آئے گی جو اسے باطل کرے"۔

۴۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (حجر / ۹) یقیناً ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم خود ہی قرآن کا محافظ ہے لہذا اس کیلئے ضروری ہے کہ ہر قسم کی تحریف و تغییر سے محفوظ رہے۔

حضرت فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ: "یہ آیت پختہ طریقے پر دلالت کر رہی ہے کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہر سورت کا جزو ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور قرآن مجید کسی بھی کمی یا بیشی سے نہ بچا رہے تو حفاظت بے معنی ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کا حصہ نہ ہوتی تو قرآن تحریف سے محفوظ تھا اور نہ ہی زیادتی سے۔

تبصرہ: یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جو قرآن جبرائیل امین، حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئے وہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے پاس محفوظ ہے اور ائمہ ہی اللہ کے علم کے خزانہ دار اور اس کی کتابوں کیلئے جائے پناہ ہیں اور یہی بات آیت کی صداقت کیلئے کافی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بھی محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم آخر الزمان تک اس کا اس لحاظ سے محافظ ہے کہ وہ ہر دور میں ایک نہ ایک ایسی جماعت بھیجتا رہے گا جو اس کی حفاظت کرتی رہے گی، اسے پڑھتی اور پڑھاتی رہے گی، لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کرتی رہے گی تو اس طرح سے یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا تاکہ ایک تو خلق خدا پر حجت قائم رہے اور دوسرے نبوت کا معجزہ بھی قائم و دائم رہے۔

یہ سب اس وقت ہے جب ہم "لَهٗ" کی ضمیر "پیغمبر اکرمؐ" کی طرف لوٹانے سے آنکھیں بند کر لیں ورنہ "فراء" کے بقول سارے استدلالات ہی دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ چنانچہ "ابن انباری" کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جہاں پر

"نازل کرنے"کاذکر کیا ہے وہاں پر "نازل کرنے والے"کاذکر بھی کیا ہے اور "نازل ہونے والی چیز"کا بھی اور یہ ضمیر اس کیلئے دلالت کر رہی ہے "جس پر نازل کیا گیا" ہے۔ اور یہ ایک حسین کنایہ ہے۔ اس لئے کہ یہاں پر اگر یہ کہا جائے کہ اس سے پہلے آنجناب کاذکر تو نہیں کہ ضمیر کو اسی طرف پلٹایا جائے تو جواب یہ ہے کہ جس طرح "اِنَّا اَنزَلنٰهُ فِي لَيلَةِ القَدرِ "(قدر /۱) ہم نے یقیناً اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔ میں ضمیر کو اس لئے "قرآن" کی طرف پلٹا رہے ہیں کہ ایک معلوم سی بات ہے، تو وہاں پر بھی "لہٗ" کی ضمیر آنجناب ہی کی طرف پلٹائیں گے کہ معلوم سی بات ہے۔

۵۔ بہت سی اخبار و روایات قرآن سے تمسک کرنے کو واجب قرار دے رہی ہیں اور ساتھ ہی قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دے رہی ہیں، جیسے "حدیث ثقلین" ہے جو فریقین کے نزدیک متواتر ہے۔ یا اسی طرح کی کئی اور احادیث ہیں۔ اور وہ روایات بھی موجود ہیں جو اس بات کی راہنمائی کر رہی ہیں کہ باہم متصادم احادیث کو قرآن سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ جیسے عمر بن حنظلہ کی مقبول روایت ہے کہ :

الف: "جس کا حکم کتاب و سنت کے حکم کے مطابق ہو لیکن عوام الناس کے مخالف ہو تو اسے لے لیا جائے گا اور جس کا حکم کتاب و سنت کے حکم کے مخالف ہو لیکن عوام الناس کے مطابق ہو تو اسے ترک کر دیا جائے گا"

ب: سکونی حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: حضرت رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ :یاد رکھو! ہر حق کے اوپر ایک حقیقت ہوتی ہے اور ہر بہتری کے اوپر ایک نور ہوتا ہے تو جو چیز کتاب خدا کے مطابق ہو اسے لے لیا کرو اور جو کتاب اللہ کے مخالف ہو اسے چھوڑ دیا کرو"۔

ج: عبدالرحمان بن ابی عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ :"جب تمہارے پاس دو مختلف حدیثیں پہنچیں تو انہیں کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو کتاب اللہ سے مطابقت رکھتی ہو اسے لے لو اور جو اس کی مخالف ہو اسے رد کر دو" اسی قسم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کی تعداد حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے یا اس کے قریب قریب ہے"۔

طریق استدلال

جس کتاب سے تمسک کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور اس کی طرف رجوع کرنے کا ہمیں پابند بنایا گیا ہے اور آپس میں مختلف احادیث کو اس کے ساتھ مطابقت دینے کا مشورہ دیا گیا ہے اگر تو وہ نازل شدہ کتاب ہے جو ہر طرح سے محفوظ اور تحریف اور کمی بیشی سے بچی ہوئی ہے اور تحریف کے دعویداروں کے بقول وہ حضرت ائمہ اطہار علیہم السلام کے پاس موجود ہے تو پھر یہ تمسک، یہ رجوع اور یہ احادیث کا اس سے مطابقت دینا سب کچھ ہمارے بس سے باہر ہے کیونکہ وہ اب حجیت سے ساقط ہے، اور وثوق و اطمینان اس پر باقی نہیں رہا، لہذا ضروری ہے کہ جو کتاب اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ ہر طرح سے سالم اور محفوظ ہو۔ شیخ علیہ الرحمہ کے بارے میں بتایا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ :"ہماری روایات کافی حد تک اس کے پڑھنے کی رغبت دلاتی اور اس سے تمسک کرنے کا حکم دیتی ہیں۔ اور جن احادیث میں اختلاف پایا جاتا ہے انہیں قرآن کے سامنے پیش کرنے کیلئے کہتی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہیں کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اس پر عمل کیا جائے اور جو اس کے مخالف ہو اس سے اجتناب کیا جائے اور اس کی طرف توجہ نہ کی جائے"۔

حدیث ثقلین سے استدلال

حضرت رسولخداؐ سے حدیث بیان کی گئی ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اور وہ یہ ہے: "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب ہے اور میری عترت میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے حتی کہ مجھ تک حوض کوثر پر پہنچ جائیں گے"۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ قرآن مجید ہر دور اور ہر زمانے میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ بات ہرگز جائز نہیں ہو سکتی کہ پیغمبر ہمیں ایسی چیز سے تمسک کرنے کا حکم دیں جو ہمارے بس سے اور مقدور سے باہر ہو۔ جس طرح کہ اہل بیت اور جن لوگوں کے قول کی اتباع ہم پر واجب ہے وہ ہر وقت ہماری دسترس میں ہیں"۔

خلاصہ کلام: ان روایات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو قرآن مجید اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اس میں کسی قسم کی تحریف و تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان روایات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ ہم پر قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا واجب ہے اور اگر وہ ہماری دسترس سے باہر ہو یا وہ قرآن ہو ہی نہ تو پھر اس کی طرف رجوع کیسا؟ پس ضروری ہے کہ اسے ہر قسم کے خلل اور نقصان سے محفوظ رہنا چاہیے۔ ورنہ اس پر وثوق و اطمینان باقی نہیں رہے گا۔ اور ایسی صورت میں اس کی طرف رجوع کرنے کے حکم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔

تبصرہ ۱: اس بارے میں بیان کی جانے والی روایات دو طرح کی ہیں۔ یا تو:

الف: حضرت رسول اکرمؐ کی طرف سے بیان کی گئی ہیں، جیسے حدیث ثقلین ہے یا بعض ایسی روایات ہیں جن میں احادیث کو قرآن کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یا:

ب: ائمہ اطہار علیہم السلام سے مروی ہیں۔

پہلی قسم کی روایات کہ جن کا تعلق حضرت رسالتمابؐ سے ہے تو یہ اس مدعا پر قطعاً دلالت نہیں کرتیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے ہمیں کتاب اللہ کی اتباع اور احادیث کو اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم اس وقت دیا تھا جب تحریف نے کتاب اللہ کا رخ ہی نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ہمیں اہل بیت اطہارؑ اور عترت رسولؐ کی اتباع، ان سے احکام الٰہی کے لینے اور ان کے نور سے روشنی حاصل کرنے کا اس وقت حکم دیا تھا جب ان پر مصائب و آلام کے وہ پہاڑ نہیں ٹوٹے تھے۔ یہ سب تبدیلیاں تو اس وقت رونما ہوئیں جب پیغمبر اکرمؐ کو اللہ نے اپنے حضور بلا لیا، پھر لوگوں نے اپنے لئے لطف الٰہی کی راہیں بند کر دیں وہ یوں کہ پیغمبرؐ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ گئے، کتاب اللہ کی کیفیت کو بدل کر رکھ دیا، اسے پس پشت ڈال دیا۔ اسی طرح عترت و اہل بیت پیغمبرؐ کے ساتھ وہ برا سلوک کیا کہ انہیں ہمیشہ کیلئے ترک کر دیا، ان کو ان کے مقام و مرتبے سے گرا دیا اور انہیں جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔ اور نوبت غیبت کبریٰ تک جا پہنچی۔

جس طرح غیبت امامؑ، ائمہ اطہارؑ کو ان کے مناصب و مراتب سے جدا کر دینا، ان سے تمسک کی عدم دسترسی اور ان سے احکام شرعیہ کا عدم حصول یہ سب کچھ لوگوں کے برے کرتوتوں کی وجہ سے ہے اور حضرت رسول پاکؐ کے فرمان پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح آنحضرتؐ پر نازل شدہ قرآن تک عدم دسترسی اس کی عدم اتباع اور اس کے ساتھ عدم تمسک سے بھی آنجنابؐ کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ سرکار رسالت مآبؐ نے حدیث ثقلین کو ارشاد ہی اس لئے فرمایا تھا کہ: لوگ کتاب

خدا کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں جو انہوں نے کیا اور آل و عترت کے حق میں وہ کوتاہی نہ برتیں جس کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔
رہیں دوسری قسم کی احادیث یعنی جو ائمہ اطہار علیہم السلام سے مروی ہیں، تو بھی ان میں اس قسم کی کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ ائمہؑ نے ہمیں اس کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور جو تحریف کا شکار اور کمی سے دوچار ہو چکی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف تقیہ اور اپنی اور اپنے شیعوں کی جانوں کا خوف تھا۔..............۔

تبصرہ ۲: اس بارے میں وہی جواب دیا جائے گا جو صاحب تفسیر صافی نے دیا ہے، وہ یوں کہ انہوں نے شیخ کا کلام جسے ہم بیان کر چکے ہیں نقل کرنے کے بعد فرمایا: "ہر دور میں اس کے وجود کیلئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ سارے کا سارا جیسا کہ اللہ نے نازل فرمایا خدا کے پاس محفوظ ہے اور جتنا ہمیں اس کے وجود کی ضرورت تھی وہ ہمارے پاس ہے اگرچہ ہمیں تمام تک رسائی حاصل نہیں۔ یہی کیفیت امامؑ کی ہے، گویا "ثقلین" کا حال ایک جیسا ہے"۔

محقق کاظمیؒ کا اعتراض

اس پر محقق کاظمیؒ ان پر یہ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ائمہ اہل بیتؑ سے تمسک کے معنی ہیں ان سے محبت کرنا اور ان کے بتائے ہوئے رستوں پر چلنا اور یہ تو امامؑ کی غیبت کے زمانے میں بھی ممکن ہے۔ جبکہ قرآن سے تمسک اس کے برعکس ہے یعنی اس کی موجودگی میں ہی اس سے اخذ کرنا اور باخبر رہنا، لہذا فرق صاف ظاہر ہے"۔

قول مصنفؒ:

انصاف کی بات یہ ہے کہ روایت میں موجود لفظ "تَمَسَّكْتُمْ" سے اگر "تمسک تفصیلی" مراد لیا جائے یعنی جب بھی ضرورت پڑے فوراً امام تک رسائی حاصل کی جا سکے اور ان سے احکام وصول کئے جا سکیں، تو ایسا تو غیبت کبریٰ کے دور میں ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس بارے میں علم کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ بلکہ ائمہؑ کے ظہور کے زمانے میں بھی جبکہ علم کے دروازے کھلے ہوئے تھے ایسا ہونا محل کلام ہے، جیسا کہ ہم علم اصول میں اس پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

لیکن اگر اس سے "تمسک اجمالی" مراد ہے یعنی جہاں تک ہمارے امکان میں ہے ان تک رسائی حاصل کریں اور ان کی طرف رجوع کریں، لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا یعنی ان تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اپنا سر تسلیم خم کئے رہیں اور یہی عزم اپنے اندر لئے رہیں کہ جب بھی موقع ملے گا اور توفیق شامل حال ہو گی ان کی طرف رجوع کریں گے، اور حق بات یہ ہے کہ ثقلین کا یہی حال ہے اور اس بارے میں دونوں برابر ہیں۔

قصہ مختصر، غیبت کبریٰ کے زمانے میں قرآن و اہل بیتؑ سے تفصیلی تمسک ناممکن ہے جبکہ اجمالی تمسک کا امکان موجود ہے کہ ان کی تصدیق کی جائے، ان کو تسلیم کیا جائے اور بقدر امکان ان سے احکام حاصل کئے جائیں۔ اور یہ فرق قائم کرنا کہ "ثقل اکبر" سے تمسک کو "تمسک اجمالی" اور "ثقل اصغر" سے تمسک کو "تمسک تفصیلی" قرار دینا مناسب نہیں ہو گا۔

تبصرہ ۳: چونکہ اہل بیتؑ کو علم تھا کہ قرآن مجید کی آیات احکام میں تحریف واقع نہیں ہوئی، لہذا انہوں نے ہمیں اس بارے میں اس کی طرف رجوع کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہے۔ ان کے اس اقدام سے ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آیات تحریف یا

کسی کمی بیشی سے محفوظ ہیں۔ البتہ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے ہمیں یا تو اس وجہ سے رخصت دی ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس بارے میں رجوع کیا جارہا ہے اگر اس بارے میں کوئی حکم ساقط ہے تو دوسرا حکم ثابت موجود ہے جو اس کے قائم مقام ہے۔

حرف آخر : یہ تمام گفتگو ان لوگون کی تھی جو قرآن مجید میں عدم تحریف کے قائل ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ اپنے مدعا کو صحیح معنوں میں ثابت نہیں کر پائے۔

﴿تحریف قرآن کے دلائل﴾

جو لوگ تحریف قرآن کے قائل ہیں ان کے بھی بہت سے دلائل ہیں جن میں سے بعض کا تعلق مطلقاً تحریف سے ہے، بعض کا کمی اور بیشی سے اور کچھ کا تعلق صرف کمی سے ہے۔ تو گویا دلائل کی تین قسمیں ہیں :

پہلی قسم :وہ دلائل ہیں جو مطلقاً تحریف اور تبدیلی پر دلالت کرتے ہیں۔

دوسری قسم :وہ دلائل ہیں جو کمی اور بیشی پر دلالت کرتے ہیں۔

تیسری قسم :وہ دلائل ہیں جو صرف کمی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اب ہم پہلی قسم کے دلائل کو بیان کرتے ہیں :

﴿پہلی قسم کے دلائل﴾

ا۔ وہ دلیل ہے جسے سید نعمت اللہ جزائریؒ نے ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ : قرآن مجید وقفے وقفے سے حالات وواقعات کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ اور اس وقت "وحی کے کاتب" چودہ صحابی تھے، جن کے سردار امیر المؤمنین علی علیہ السلام تھے۔ وہ سب حضرات اغلب طور پر صرف ان آیات کو لکھا کرتے تھے جن کا تعلق احکام سے ہوتا تھا پھر جو وحی آنحضرت پر بھری محفلوں اور مجمعوں میں نازل ہوتی تھی۔ اور جو کچھ آپؐ پر خلوتوں میں یا گھر میں نازل ہوتا تھا وہ سوائے امیر المؤمنینؑ کے کوئی نہیں تھا جو قلبند کرتا۔ اس لئے کہ آپؑ جناب پیغمبر خداؐ کی جلوتوں اور خلوتوں میں ساتھ ہوتے تھے۔ لہذا آپؑ کا "مصحف" دوسرے تمام "مصاحف" سے زیادہ جامع تھا۔

جب سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے محبوب حقیقی کی دائمی ملاقات کیلئے اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیا والوں کی نیتوں میں تبدیلی واقع ہو گئی تو حضرت امیر علیہ السلام قرآن مقدس کو اس کی "نزولی ترتیب" کے ساتھ جمع کر کے ایک چادر میں باندھ کر مسجد نبوی میں تشریف لے آئے۔ اور لوگوں سے فرمایا : "یہ تمہارے رب کی کتاب ہے جس طرح نازل ہوئی ہے" اس پر حضرت عمر نے کہا : "ہمیں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس "مصحف عثمان" موجود ہے"۔ یہ سن کر امیر المؤمنینؑ نے فرمایا : "اب کے بعد تم اسے ہرگز نہیں دیکھ پاؤ گے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور امام مھدی آخر الزمانؑ کے ظہور تک کوئی اسے نہیں دیکھ پائے گا۔

تبصرہ : سید جزائری کا یہ فرمانا : "حضرت امیرؑ کا مصحف دوسروں کے مصاحف سے زیادہ جامع تھا" تو اس پر مندرجہ ذیل

روایت شاہد ہے۔ کافی میں اسناد کے ساتھ جابر بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق ؑ سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ : "جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورے قرآن کو اسی طرح جمع کیا ہے جس طرح کہ وہ نازل ہوا ہے۔ وہ جھوٹا ہے، کیونکہ اسے جس طرح اللہ نے نازل کیا ہے اسی طرح علی بن ابی طالب ؑ اور ان کے بعد کے ائمہ اطہار ؑ نے محفوظ اور جمع کیا ہے، ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا نہیں کیا"۔

سید جزائری کا یہ فرمانا کہ : "امیر المؤمنین ؑ وہ کتاب، مسجد میں لے آئے، اس پر یہ روایت دلالت کر رہی ہے جسے طبرسیؒ نے "الاحتجاج" میں ابوذر غفاریؓ سے نقل کیا ہے۔ ابوذر کہتے ہیں : "جب سرکار رسالتمآب ؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت علی ؑ تمام قرآن جمع کر کے مہاجرین و انصار کے پاس آئے اور ان کے سامنے پیش کیا۔ کیونکہ آپ ؑ کو سرکار رسالتمآب ؐ نے اس بات کی وصیت کی تھی۔ جونہی حضرت ابوبکر نے اس کا پہلا صفحہ کھولا تو اس میں کچھ خاص لوگوں کی نکوہش تھی، اس پر حضرت عمر نے جھپٹ کر کہا : "یا علی ! آپ ؑ اسے لے جایئے ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ حضرت علی ؑ نے وہ لیا اور واپس آ گئے۔ اس کے بعد زید بن ثابت کو (دربار خلافت میں) بلایا گیا جو کہ قاری قرآن تھے، انہیں حضرت عمر نے کہا : "علی ؑ ہمارے پاس ایسا قرآن لائے جس میں کچھ مہاجرین و انصار کی نکوہش تھی، ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لئے ایسا قرآن جمع کرو جس میں سے مہاجرین و انصار کی ہتک و نکوہش نکال دو" زید بن ثابت نے ان کی حامی بھر لی البتہ یہ ضرور کہا کہ اگر میں بھی آپ کے کہنے کے مطابق قرآن جمع کر کے فارغ ہو جاؤں اور علی ؑ بھی اپنا جمع کردہ قرآن پھر لے آئیں تو پھر تمہاری ساری تدبیریں ناکام نہیں ہو جائیں گی ؟" حضرت عمر نے کہا "پھر کیا کیا جائے ؟" زید نے کہا "آپ ہی کوئی بہتر تدبیر نکال سکتے ہیں !" حضرت عمر نے کہا "اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں کہ انہیں قتل کر کے گلو خلاصی حاصل کی جائے" چنانچہ انہوں نے خالد بن ولید کے ذمہ یہی کام لگایا، لیکن یہ اور بات ہے کہ خالد اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب حضرت عمر خلیفہ بنے تو یہ بات ٹھان لی کہ "علی ؑ کے جمع کردہ قرآن میں تحریف کر دی جائے" چنانچہ انہوں نے حضرت علی ؑ سے کہا : "یا ابا الحسن ؑ ! اگر آپ حضرت ابوبکر کے پاس وہ قرآن لائے تھے، ہمارے پاس بھی لایئے تاکہ ہم بھی اسی پر اجماع کر لیں" حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا : "اب وہ بات کہاں ! میں اسے نہیں لا سکتا، کیونکہ میں اس وقت ابوبکر کے پاس اس لئے لایا تھا تاکہ تم پر حجت قائم ہو جائے اور قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے بے خبر تھے، یا یہ نہ کہہ سکو کہ : "علی ؑ ! تم اسے ہمارے پاس نہیں لائے تھے، یاد رکھو جو قرآن میرے پاس ہے اسے طاہر اور مطہر لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہاتھ لگا سکتا اور وہ میرے بعد میرے اوصیاء ہیں جو میری اولاد سے ہوں گے"۔ اس پر حضرت عمر نے کہا : "آیا اس کے ظاہر کرنے کا کوئی وقت مقرر ہے ؟" فرمایا : "ہاں ! جب میرا فرزند قائم (آل محمد ؐ) ظہور کرے گا تو اسے لوگوں کے سامنے لے آئے گا اور لوگوں کو اسی پر عمل کرنے کیلئے آمادہ کرے گا اور اسی کے ذریعہ ہی سنت کا اجراء ہو گا، صلوات اللہ علیہ "

۲۔ طبرسیؒ نے احتجاج میں ایک روایت درج کی ہے کہ کسی زندیق نے حضرت امیر المؤمنین ؑ سے کچھ سوال کئے تاکہ آپ ان کی وضاحت فرمائیں، تو آپ ؑ نے تفصیل کے ساتھ ان سوالات کی وضاحت فرمائی۔ مثلاً اس نے انبیاء کی عصمت کے سلسلے میں کچھ سوال کئے کہ وہ معصوم ہیں لیکن قرآن میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو ان کی لغزشوں اور گناہوں کی نشاندہی کرتی ہیں مثلاً حضرت آدم ؑ کے

بارے میں ہے: "وَ عَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی" (طٰہٰ / ۱۲۱) اور آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تو وہ راہ صواب سے بے راہ ہو گئے۔ اور اسی طرح کے اور بھی بہت سے سوالات تھے جن کے آپؑ نے تسلی بخش جواب دیئے۔ اس کے بعد اس نے یہ سوال کیا کہ: "جن لوگوں نے خلق خدا کو دھوکے دیئے، انہیں فتنوں میں ڈالا، خود بھی گمراہ ہوئے اوروں کو بھی گمراہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے نام نہیں بتائے بلکہ اشاروں کنایوں میں ان کا ذکر کیا، مثلاً: "یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ" (فرقان / ۲۷) اور جس دن ظالم اپنے ہاتھ (مارے افسوس کے) کاٹنے لگے گا۔ اور اس طرح کی بعض بہت سی دوسری مثالیں ہیں۔ تو اس کا جواب امیر المؤمنینؑ نے یوں دیا: "قرآن مجید میں بڑے بڑے جرائم کے مرتکب منافقین کے نام کی بجائے کنایوں کا استعمال خدا کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے قرآن میں تحریف اور تبدیلی کی ہے اور قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور دین کے عوض دنیا کو خرید لیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے "فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا" (بقرہ / ۷۹) پس وائے ہو ایسے لوگوں پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ تاکہ اس طرح سے وہ تھوڑی سی قیمت (دنیوی فائدہ) حاصل کریں۔ نیز فرماتا ہے: "وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْکِتٰبِ" (آل عمران / ۷۸) اور ان میں سے بعض ایسے ضرور ہیں جو کتاب میں اپنی زبانیں مروڑ مروڑ کر (کچھ کا کچھ پڑھ) جاتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے: "اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَالَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ" (نساء / ۱۰۸) جب وہ لوگ راتوں کو بیٹھ کر ان باتوں کے مشورے کرتے ہیں جن سے خدا راضی نہیں (اور خدا تو ان کی سب کرتوتوں کو علم کے احاطہ میں گھیرے ہوئے ہے) یعنی پیغمبرؐ کی وفات کے بعد، اور وہ اپنے باطل کی کجی کو سیدھا نہیں کر سکے۔ جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے بعد توریت و انجیل میں تحریف کر دی اور کلمات کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر لے گئے، خداوند عالم فرماتا ہے: "یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَی اللّٰهُ اِلَّا اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ" (توبہ / ۳۲) اور لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے پھونک مار کر خدا کے نور کو بجھا دیں اور خدا اس کے سوا نہیں مانتا ہی نہیں کہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے۔ یعنی انہوں نے کتاب میں وہ چیز داخل کر دی ہے جو خدا نے نہیں کہی تاکہ اس طرح سے اللہ کی مخلوق کو مغالطوں میں ڈالے رکھیں، جس کے نتیجے میں اللہ نے ان کے دلوں کو اندھا کر دیا، انہوں نے کتاب میں وہ کچھ شامل کر دیا جو اپنی طرف سے گھڑا اور اس میں تبدیلی پیدا کر دی، اسی لئے خداوند تعالیٰ نے ان کی افتراء پردازیوں اور دسیسہ کاریوں کو یوں بیان کیا ہے کہ: "لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ" (آل عمران / ۷۱) تم کیوں حق و باطل کو آپس میں ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو؟ اسی طرح ان کیلئے یہ مثال بھی بیان کی ہے کہ: "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ" (رعد / ۱۷) اور جھاگ باطل کی تو خشک ہو جاتی ہے اور جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے وہ (پانی بن کر) زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ تو یہاں پر "جھاگ" سے مراد ملحدین کا کلام ہے جو انہوں نے قرآن میں داخل کر دیا ہے، لیکن وہ بوقت ضرورت گھل اور پگھل جاتا ہے اور منتشر ہو جاتا ہے۔ اور جس کلام سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ تنزیل حقیقی ہے جو خدا کا کلام ہے، باطل جس کے نہ تو آگے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے اور دل جسے قبول کر لیتے ہیں، اور اس آیت میں "زمین" سے مراد علم کا مقام اور قرار گاہ ہے۔ اور تقیہ کے دور میں قرآن میں ردوبدل اور تحریف کرنے والوں کے

ناموں کی صراحت نہیں کی جا سکتی، اور نہ ہی ان اضافوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے آیات خداوندی میں داخل کر دیئے ہیں، کیونکہ اس طرح سے اہل تعطیل، کفار اور مسلمانوں کے قبلہ سے منحرف اقوام و ملل کے دلائل کو تقویت پہنچے گی۔ اور یہ ظاہری علم کہ جس کی وجہ سے کچھ لوگ سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور اوامر و نواہی کی پابندی اختیار کئے ہوئے ہیں ملیامیٹ ہو جائے۔ اور اس لئے بھی چونکہ ہر دور میں اہل باطل کی تعداد اہل حق سے زیادہ رہی ہے اور اس لئے بھی چونکہ انبیاء الٰہی پر خدا کی طرف سے صبر کی پابندی لازمی ہے جیسا کہ پیغمبرؐ سے ارشاد الٰہی ہے: "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ "(احقاف / ۳۵) اے پیغمبرؐ! جس طرح اولوا العزم (عالی ہمت) پیغمبروں میں سے صبر کرتے رہے تم بھی صبر کرو۔

اسی طرح اولیاء اللہ اور اہل طاعت کیلئے پیغمبرؐ کی تاسی لازمی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "(احزاب / ۲۱) اور تمہارے لئے خود رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کے بعد امام علیؑ نے فرمایا: "اس بارے میں اسی قدر جواب کو کافی سمجھو کیونکہ تقیہ کی شریعت اس سے زیادہ کی متقاضی نہیں ہے"۔

۳۔ علی بن ابراہیم قمیؒ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے اس آیت "لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ "(رعد / ۱۱) اس کیلئے کچھ خدائی مامورین ایسے ہیں جو سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے باری باری بچاتے ہیں۔ کے متعلق فرمایا "کوئی چیز امر الٰہی سے کیسے بچا سکتی ہے اور کون اس کے آگے پیچھے ہو سکتا ہے؟" کسی نے پوچھا: "فرزند رسولؐ وہ کیسے؟" امامؑ نے فرمایا: "یہ آیت یوں نازل ہوئی ہے "لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ خَلْفِهِ وَ (رَقِيْبٌ) مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" اس کیلئے پہرے دار ہیں پیچھے سے اور محافظ ہیں سامنے سے جو اسے حکم خدا کے ساتھ باری باری بچاتے ہیں"۔

۴۔ علی بن ابراہیم ہی حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے اس آیت "لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ "(توبہ / ۱۱۷) البتہ خدا نے نبی اور مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کی۔ کے متعلق ارشاد فرمایا، آیت یوں نازل ہوئی ہے: "لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ (بِالنَّبِيِّ) عَلَى الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ "اللہ نے نبیؐ کے ذریعے مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کی۔

۵۔ علی بن ابراہیم ہی روایت بیان کرتے ہیں کہ: حضرت امام جعفر صادقؑ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی "وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ جَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا "(فرقان / ۷۴) اور وہ لوگ جو (ہم سے) عرض کیا کرتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ امامؑ نے فرمایا: "انہوں نے تو اللہ سے بڑے ہی عظیم امر کا سوال کیا ہے کہ "انہیں متقی لوگوں کا امام بنائے" کسی نے کہا: "فرزند رسولؐ! تو پھر بات کیسے بنے گی؟" امامؑ نے فرمایا: "آیت یوں اتری تھی "وَ اجْعَلْ (لَنَا مِنَ الْمُتَّقِيْنَ) اِمَامًا" ہمارے لئے متقی لوگوں میں سے امام بنا دے۔

۶۔ علی بن ابراہیم ہی ابن ابی عمیر سے اور وہ ابن سنان سے یوں روایت کرتے ہیں کہ: میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے سامنے یہ آیت پڑھی: "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ "(آل عمران / ۱۱۰) تم کیا اچھی امت ہو جو لوگوں کیلئے منظر عام پر

لائی گئی ہو۔ یہ سن کر امامؑ نے فرمایا: "یہی اچھی امت ہے جس نے امیر المؤمنینؑ اور ان کے فرزند حسنؑ اور حسینؑ کو شہید کر دیا؟" سوال کیا گیا: "آپؑ کے قربان جاؤں تو یہ آیت کیسے نازل ہوئی ہے؟" فرمایا: "یوں نازل ہوئی ہے "کُنْتُمْ خَیْرَ (اَئِمَّۃٍ) اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (آل عمران / ۱۱۰) تم کیا ہی بہترین ائمہ ہو جو لوگوں کیلئے منظر عام پر لائے گئے ہو۔ کیا نہیں دیکھتے ہو کہ خداوند آگے چل کر ان کی مدح و ثناء یوں کر رہا ہے: "تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" "تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

۷۔ سید معتمد سید ہاشم بحرانیؒ صاحب شرح نہج البلاغہ شیخ مفیدؒ کی کتاب "الاختصاص" سے روایت کرتے ہیں کہ: جابر جعفی کی روایت ہے کہ ایک رات میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا تو میں نے آپؑ کے سامنے یہ آیت پڑھی "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ......" (جمعہ / ۹) اے ایماندارو! جب جمعہ کے دن نماز کیلئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (نماز) کی طرف دوڑ پڑو اور ...... ۔ تو امامؑ نے فرمایا: "جابر! کیا پڑھ رہے ہو؟" یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ" پڑھ رہے ہو نا؟" میں نے عرض کیا: "قربان جاؤں! تو پھر کس طرح پڑھوں؟" امامؑ نے فرمایا: "جابر! یہ تحریف ہے، اصل میں یوں ہے" ...... فَامْضُوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ" اور اسی طرح ہی نازل ہوئی ہے، کیونکہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے کہ انسان نماز کیلئے دوڑتا دوڑتا جائے"۔

پھر فرمایا: "اچھا جابر! یہ تو بتاؤ کہ "جمعہ" کو "یوم جمعہ" کیوں کہا جاتا ہے؟" میں نے عرض کیا: "اللہ مجھے آپؑ پر قربان کرے آپؑ ہی مجھے بتائیے!" تو امامؑ نے فرمایا: "کیا تمہیں اس کی "تاویل اعظم" نہ بتاؤں؟" میں نے عرض کیا: "قربان جاؤں ضرور بتائیے!" فرمایا: "جابر! اللہ نے "جمعہ" کا نام اس لئے "جمعہ" رکھا ہے کہ اس دن اللہ نے اولین و آخرین کو، تمام خلق اللہ کو، چاہے وہ جن تھے یا انسان یا کوئی اور مخلوق، آسمان، زمین، سمندر، دریا، جنت، جہنم غرض کہ ہر مخلوق کو اکٹھا کر کے ان سے اپنی ربوبیت، محمد مصطفیٰؐ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت کا اقرار اور میثاق لیا۔ اور اسی دن اس نے آسمان اور زمین سے فرمایا: "اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ" (سجدہ / ۱۱) تم دونوں آؤ خوشی سے خواہ کراہت سے، تو دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی حاضر ہیں۔ اسی لئے اللہ نے اس دن کا نام "جمعہ" رکھا۔ کیونکہ اس دن اللہ نے تمام اولین و آخرین کو یکجا کیا پھر فرمایا: "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ" "اے ایماندارو! جب تم کو جمعہ کے دن "صلوٰۃ" کیلئے پکارا جائے" "مِنْ یَّوْمِكُمْ هٰذَا الَّذِیْ جَمَعَكُمْ فِیْهِ" تمہارے اس دن کہ جس میں اللہ نے تمہیں جمع کیا ہے۔ اور صلوٰۃ سے مراد ولایت علی بن ابی طالبؑ ہے۔ اور یہی "ولایت کبریٰ" ہے۔ اور اسی دن انبیاء، رسل، ملائکہ، اللہ کی تمام مخلوق، ثقلین یعنی جن و انس، تمام آسمان و زمین اور سارے مومنین "لَبَّیْكَ لَبَّیْكَ" کہہ کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ لہٰذا اس دن تم بھی "فَامْضُوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذِكْرِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ" "اللہ کے ذکر اور امیر المومنین کے ذکر کی طرف چل پڑو" "وَذَرُوا الْبَیْعَ" "اور پہلے کو چھوڑ دو" "ذٰلِكُمْ" "امیر المومنینؑ کی بیعت اور خلافت" "خَیْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَیْعَۃِ الْاَوَّلِ وَوِلَایَتِهٖ" "تمہارے لئے پہلے کی بیعت اور ولایت سے بہتر ہے۔" "اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" "اگر تم جانتے ہو۔" "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ" "جب صلوٰۃ مکمل ہو جائے یعنی "بَیْعَۃُ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ" "تو" "فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ" "زمین میں پھیل جاؤ، یعنی ان

اوصیاء کے پاس چلے جاؤ جن کی اطاعت اور ولایت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان کی اطاعت اور ولایت بھی اللہ نے اسی طرح فرض کی ہے جس طرح رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر کنایہ کے طور پر ان کے ناموں کی بجائے "الاَرْض" کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ" خدا کے فضل کو تلاش کرو۔ اس موقعہ پر جابر نے پوچھا "سرکار! یہ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہ کیا ہے؟" امام علیہ السلام نے فرمایا: "اس میں بھی تحریف کی گئی ہے، اصل میں یوں نازل ہوا" وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَی الاَوْصِیاءِ وَ اذکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" اور اللہ نے اوصیاء رسول پر جو فضل کیا ہے اس کو حاصل کرو اور خدا کو زیادہ یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے پیغمبرؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا "اے محمدؐ! فَاِذَا رَاَوْا" جب شکی مزاج اور منکر لوگ دیکھتے ہیں "تِجَارَۃً" "تجارت یعنی پہلے کو "اَوْ لَھْوًا" لہو یعنی دوسرے کو "اِنْصَرَفُوْا اِلَیْھَا" ان کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ راوی نے کہا میں نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا "اِنْصَرَفُوْا" نہیں بلکہ "اِنْفَضُّوْا" ہے تو امامؑ نے فرمایا: "یہ تحریف ہے اصل میں "اِنْصَرَفُوْا" ہی نازل ہوا ہے" وَتَرَکُوْکَ مَعَ عَلِیٍّ قَائِمًا" اور اے پیغمبرؐ! آپ کو علیؑ کے ساتھ کھڑا ہوا چھوڑ گئے۔ "قُلْ یَامُحَمَّدُ مَاعِنْدَاللّٰہِ مِنْ وِّلَایَۃِ عَلِیٍّ وَّالاَوْصِیاءِ خَیْرٌ مِنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ" اے محمدؐ! کہہ دیجئے کہ اللہ کے پاس علیؑ اور ان کے اوصیاء کی جو ولایت ہے وہ لہو اور تجارت سے بہتر ہے، یعنی "بَیْعَۃِ الاَوَّلِ وَالثَّانِی لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا" یعنی متقی افراد کیلئے پہلے اور دوسرے کی بیعت سے بہتر ہے، راوی نے کہا: "میں نے عرض کیا "لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا" تو اس میں نہیں ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "ہے اور آیت اسی طرح ہی نازل ہوئی ہے، اور تم ہی وہ متقی افراد ہو۔" واللہ خیر الرازقین "اور اللہ سب سے بہترین روزی دینے والا ہے۔

۸۔ شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب "التوحید" میں اسناد کے ساتھ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ راوی نے کہا: "میں نے حضرت باری تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں آپؑ سے پوچھا: "ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلاَّ یَاتِیَھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلاَئِکَۃُ" (بقرہ / ۲۱۰) کیا وہ لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ سفید ابر کے سائبانوں کی آڑ میں خدا اور (عذاب کے) فرشتے ان پر آہی جاویں؟ تو امامؑ نے فرمایا کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی ہے "ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلاَّ اَنْ یَاتِیَھُمُ اللّٰہُ بِالْمَلٰئِکَۃِ فِیْ ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ" کیا وہ لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ سفید ابر کے سائبانوں کی آڑ میں خدا فرشتوں کو لے آئے؟ لیکن تعجب ہے کہ شیخ صدوقؒ نے اس روایت کے ہوتے ہوئے تحریف کے واقع ہونے کا کیونکر انکار کیا ہے۔

﴿دوسری قسم کے دلائل﴾

دلائل کی دوسری قسم وہ ہے جو قرآن میں کمی یا بیشی کی نشاندہی کرتی ہیں:

۱۔ تفسیر صافی میں تفسیر عیاشی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: "اگر کتاب خدا میں کمی یا بیشی نہ کر دی گئی ہوتی تو ہمارا حق کسی بھی عقلمند پر مخفی نہ ہوتا"۔

۲۔ عیاشی ہی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ: "قرآن مجید سے بہت سی آیات باہر نکال دی گئی ہیں۔ اور اس میں صرف چند حروف کا اضافہ کر دیا گیا ہے جنہیں لکھنے والوں نے غلط کر کے لکھا اور لوگوں کو ان میں وہم رہا"۔

۳۔ علی بن ابراہیم کی تفسیر میں ہے کہ اس آیت "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوْحٍ وَّ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ" (احزاب / ۷) اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پیغمبروں سے اور خاص تم سے اور نوح اور ابراہیم و موسیٰ اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے عہد و پیمان لیا...... ۔امامؑ نے فرمایا: "وَمِنْكَ" میں "و" زیادہ ہے اصل میں ہے "مِنْكَ وَمِنْ نُوْحٍ"۔

﴿تیسری قسم کے دلائل﴾

وہ دلائل ہیں جو صرف کمی کو بیان کرتے ہیں اور وہ تو بہت ہی ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں :

ا۔ کافی میں ہشام بن سالم سے اور وہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ فرماتے ہیں "جو قرآن جبرائیل امینؑ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس لائے اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں"۔ اور اس کی دلالت کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو قرآن مجید ہمارے پاس ہے اس کی سات ہزار سے زیادہ آیات نہیں ہیں۔ جبکہ شیخ طبرسیؒ کے مطابق چھ ہزار دو سو چھتیس آیتیں ہیں۔

۲۔ طبرسیؒ نے احتجاج میں حضرت علیؑ سے اس زندیق کے اعتراض کا جواب نقل کیا ہے جو اس نے قرآن مجید کی بعض ظاہری آیات پر کیا تھا اور کہا تھا کہ ان میں باہمی تناقض پایا جاتا ہے۔ تو امامؑ نے مندرجہ ذیل آیت کے بارے میں اس کے اعتراض کے جواب میں فرمایا: "تو نے جو یہ کہا ہے کہ یہ آیت "وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ" (نساء / ۳) اور اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ نکاح کر کے تم یتیم لڑکیوں کے (رکھ رکھاؤ میں) انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے اپنی مرضی کے موافق...... نکاح کرو۔ تناقض پر مشتمل ہے۔ ایسا نہیں ہے، کیونکہ یتیم لڑکیوں کے نکاح کے بارے میں انصاف سے کام لینا، دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارے میں کوئی شبہ نہیں اور نہ ہی ہر عورت یتیم ہوتی ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس آیت میں بھی منافقین نے دستبرد اور تحریف سے کام لیا ہے۔ اور "فِي الْيَتَامٰى" سے لے کر "نکاح نساء" تک قرآن کی ایک تہائی کے برابر کا حصہ نکال لیا ہے جس میں کئی خطاب اور کئی داستانیں تھیں۔ اسی طرح کئی ایسے مقامات بھی ہیں کہ جہاں پر انہوں نے قطع و برید سے کام لے کر بہت سی چیزوں کو نکال دیا ہے۔ اگر میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دوں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی............"۔

۳۔ کافی میں احمد بن محمد بن ابی نصر سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابوالحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے مصحف عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اسے اندر سے دیکھنا نہیں، لیکن میں نے اسے کھولا تو سب سے پہلے جس آیت پر میری نظر پڑی تو اس میں لکھا ہوا نظر آیا: "لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ......" تو اس کے ساتھ ہی ستر قریشیوں کے نام مع ان کی ولدیت کے لکھے نظر آئے۔ پھر امامؑ نے میری طرف کسی آدمی کو بھیج کر مجھ سے وہ واپس منگوا لیا۔

۴۔ الف۔ ابو عبیدہ اسناد کے ساتھ حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ: "تم میں سے کوئی بھی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے سارا قرآن لے لیا ہے، اسے معلوم نہیں کہ یہ سارا قرآن نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ بلکہ اسے یہ کہنا چاہئے کہ "میں نے ظاہری قرآن کو لے لیا ہے"۔

ب۔ اسی اسناد کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: "پیغمبر خدا کے زمانے میں سورہ

احزاب کی دو سو آیتیں پڑھی جاتی تھیں، لیکن جب سے عثمان نے مصحفوں کو لکھنا شروع کیا تب سے صرف یہی موجودہ آیات ہی باقی رہ گئی ہیں"۔

ج۔ اسی اسناد کے ساتھ زر بن حبیش سے روایت ہے کہ: "مجھ سے ابی بن کعب نے کہا: "سورہ احزاب کی کتنی آیات شمار کرتے ہو؟" میں نے کہا: "باسٹھ یا تریسٹھ!" تو انہوں نے کہا: "اگر یہ اپنی اصلی حالت پر ہوتی تو سورہ بقرہ کے برابر ہوتی"۔

د۔ تفسیر کشاف میں زر بن حبیش ہی سے مذکورہ روایت منقول ہے البتہ اس میں یہ بات بھی ہے کہ: "میں نے کہا تہتر (۷۳) آیتیں ہیں" تو انہوں نے کہا: "مجھے اس کی قسم جس کی قسم ابی بن کعب نے کھائی ہے اگر یہ سورت اپنی اصلی حالت پر ہوتی تو سورہ بقرہ کے برابر ہوتی یا اس سے بھی بڑی۔ ہم نے اسی سورہ (احزاب) میں یہ آیت رجم پڑھی ہے "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" "اگر بوڑھا اور بوڑھی زنا کریں تو دونوں کو ضرور سنگسار کرو یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

(قول مترجم: اسی طرح تقریباً صحاح ستہ کی اکثر کتابوں خاص کر صحیح بخاری میں اس بارے میں بہت سی احادیث مل جائیں گی جن میں حضرت عائشہؓ سے منقول یہ روایات بھی ہیں جو قرآن مجید میں کمی پر دلالت کرتی ہیں)

۵۔ کتاب "تذکرۃ الائمہ" میں "تفسیر کازر" سے روایت کی گئی ہے اور ملا فتح اللہ نے "مصحف ابن مسعود" سے جو آیتیں نقل کی ہیں وہ متعدد سورتوں میں کثیر تعداد میں ہیں۔ مثلاً چند ایک کی مثال:

الف۔ سورہ مائدہ میں ہے: "يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (فِيْ شَانِ عَلِيٍّ) وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" (آیت ۶۷) اے رسولؐ! جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر (علیؑ کی شان کے بارے میں) نازل کیا گیا ہے پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔

ب۔ سورہ رعد میں ہے: "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ (عَلِيٌّ) لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" (آیت ۷) اے رسولؐ! آپؐ تو خدا سے ڈرانے والے ہیں اور (علیؑ) ہر قوم کیلئے ہدایت کرنے والا ہے۔

ج۔ سورہ شعراء میں ہے: "وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (آلَ مُحَمَّدٍ حَقَّهُمْ) اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ" (آیت ۲۲۷) اور جن لوگوں نے (آل محمدؐ کے حق میں) ظلم کیا ہے وہ عنقریب جان لیں گے کہ وہ کس جگہ لوٹائے جائیں گے۔ اسے تفسیر قمی میں بھی حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے۔

د۔ سورہ صافات میں ہے: "وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (فِيْ وِلَايَةِ عَلِيٍّ) مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ" (آیت ۲۴) اور انہیں ٹھہراؤ کہ ان سے (ولایت علیؑ کے بارے میں) کچھ پوچھنا ہے، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

ہ۔ سورہ نساء میں ہے: "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ اِبْرَاهِيْمَ (وَ آلَ مُحَمَّدٍ) الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ آتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا" (آیت ۵۴) یا وہ اللہ کے خاص لوگوں سے اس فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو انہیں اللہ نے دیا ہے (تو اس کا کیا علاج ہے) ہم نے تو ابراہیم کی اولاد (اور محمدؐ کی آل) کو کتاب اور عقل کی

باتیں اور ملک عظیم عطا کیا ہے۔

و۔ سورہ زخرف میں ہے: "فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُوْنَ (بِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ)" (آیت ۴۱) تو اگر ہم تم کو اس دنیا سے لے بھی جائیں تو بھی ان سے (علی بن ابی طالبؑ کے ذریعہ) بدلہ لینا ضرور ہے۔ اسے طبرسیؒ نے بھی جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کی ہے۔

ز۔ سورہ طٰہٰ میں ہے: "وَ لَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ (كَلِمَاتٍ فِيْ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ وَ التِّسْعَةِ مِنْ ذُرِّيَّةِ الْحُسَيْنِ) فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (آیت ۱۱۵) اور ہم نے آدمؑ سے پہلے ہی (محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور اولاد حسینؑ سے نو (ائمہ) کے بارے میں کچھ کلمات کے ذریعہ) عہد لے لیا تھا تو آدمؑ نے اسے ترک کر دیا اور ہم نے اس میں ثبات و استقلال نہ پایا۔

اسے کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے، البتہ اس کے آخر میں "وَ التِّسْعَةِ" کی بجائے "وَ الْاَئِمَّةِ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ" اور جو ان کی ذریت سے امام ہیں، کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: "خدا کی قسم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسی طرح نازل ہوئی ہے"۔

ح۔ سورہ والنجم میں ہے: "فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ (فِيْ عَلِيٍّ لَيْلَةَ الْمِعْرَاجِ) مَا اَوْحٰى" (آیت ۱۰) پس خدا نے اپنے بندے کی طرف (شب معراج میں علیؑ کے بارے میں) وحی بھیجی سو بھیجی۔

ط۔ آیت الکرسی میں ہے: "اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ ......" (بقرہ / ۲۵۵) خدا ہی وہ ذات پاک ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے اور سارے جہانوں کا سنبھالنے والا ہے، اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (اور جو کچھ تحت الثریٰ میں ہے، وہ غیب اور حاضر کو جانتا ہے وہی رحمٰن ورحیم ہے) غرض سب کچھ اسی کا ہے، کون ایسا ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کسی کی سفارش کرے۔

ی۔ سورہ احزاب میں ہے: "وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (بِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ) وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا" (آیت ۲۵) اور اللہ تعالیٰ نے (علی بن ابی طالبؑ کے ذریعہ) مؤمنین کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی اور خدا بڑا زبردست اور غالب ہے۔

ک۔ ایک مستقل سورہ بنام "سورہ ولایت" ہے: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِالنَّبِيِّ وَ الْوَلِيِّ الَّذِيْنَ بَعَثْنٰهُمَا يَهْدِيَانِكُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ نَبِيٌّ وَّ وَلِيٌّ بَعْضُهُمَا مِنْ بَعْضٍ وَ اَنَا الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ اِنَّ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ فَالَّذِيْنَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا كَانُوْا بِآيَاتِنَا مُكَذِّبِيْنَ اِنَّ لَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ مَقَامٌ عَظِيْمٌ نُوْدِيَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَيْنَ الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ لِلْمُرْسَلِيْنَ مَا خَلَفَهُمُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُنْظِرَهُمْ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ عَلِيٌّ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ" اے ایمان والو! نبی اور

دل پر ایمان لے آؤ جنہیں ہم نے بھیجا ہے کہ وہ تمہیں سیدھے راستے کی طرف لے جائیں گے، نبی اور ولی ایک دوسرے سے ہیں اور میں علیم و خبیر ہوں۔ جو لوگ خدا سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں ان کیلئے نعمتوں بھری جنت ہے، اور جن لوگوں کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، یقیناً ان کیلئے جہنم میں بڑا ٹھکانہ ہوگا۔ قیامت کے دن ان کو پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ گمراہ اور رسولوں کو جھٹلانے والے!۔ پیغمبروں نے انہیں اس حال میں چھوڑا کہ وہ حق پر تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ایک قریبی مدت کیلئے بھی مہلت نہیں دے گا۔ پس تو اپنے رب کی تسبیح بیان کر اور علیؑ گواہی دینے والوں میں سے ہے۔

ل۔ "سورہ نُورَین" ہے جس کو ہم نے یہاں پر اس لئے لکھنے سے احتراز کیا ہے کہ ایک تو وہ لمبی سورت ہے اور ساتھ ہی میرے پاس غلطیوں سے پاک کوئی نسخہ موجود بھی نہیں کہ جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔

(قول مترجم: اگر اسی بات کو مان لیا جائے اور حضرت عائشہؓ سے منقول پچھلی روایتوں کو بھی مد نظر رکھا جائے اور کتب تاریخ میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا باوقار صحابی ہونے کے باوجود حضرت عثمان کو مصاحف کے جمع کرنے کے اصرار پر اپنا مصحف نہ دینے، اور نتیجہ کے طور پر حضرت عثمان کا ان پر بہت زیادہ تشدد، جمع مصاحف کے بعد دوسرے مصاحف کو نذر آتش کرنے، قرآن مجید کی متعدد بلکہ سات سے بھی زیادہ قرائت ہونے، قرآن مجید کی آیتوں اور سورتوں کی تعداد میں اختلاف اور جمع مصاحف کے بعد بھی متعدد اسلامی مراکز کے منحصر بفرد مصاحف ہونے جیسے واقعات کو ایک سلسلہ وار تناظر میں دیکھا جائے تو مصنفؒ اور شارحؒ کی بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے، اور ان تمام واقعات کی کڑیوں کو آپس میں ملانے سے بھی ان کے مقاصد واضح ہو جاتے ہیں)

۶۔ جنہیں علی بن ابراہیم قمی نے روایت کیا ہے وہ بھی تعداد میں زیادہ ہیں، جن میں سے چند ایک کو بطور مثال یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے؛

الف۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (فِيْ وِلَايَةِ عَلِيٍّ وَّ الْاَئِمَّةِ مِنْ بَعْدِهٖ) فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا" (احزاب / ۷۱) اور جس شخص نے (علی بن ابی طالب اور ان کے بعد کے ائمہ کی ولایت کے بارے میں) خدا اور رسول کی اطاعت کی تو وہ اپنی مراد کو خوب اچھی طرح پہنچ گیا۔

ب۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ (فِيْ عَلِيٍّ) اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَ الْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُوْنَ" (نساء / ۱۶۶) مگر خدا تو اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ تم پر (علیؑ کے بارے میں) نازل کیا ہے خوب سمجھ بوجھ کر نازل کیا ہے اور فرشتے بھی ان کی گواہی دیتے ہیں۔

ج۔ فرماتا ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (وَ ظَلَمُوْا آلَ مُحَمَّدٍ حَقَّهُمْ) لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ" (نساء / ۱۶۸) بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور (آل محمدؐ کے حق کے بارے میں) ظلم کیا، نہ تو خدا ان کو بخشے گا اور نہ انہیں کسی طرح کی ہدایت کرے گا۔

د۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآؤُكَ (يَا عَلِيُّ) فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ" (نساء / ۶۴) اور جب ان لوگوں نے نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تو (اے علیؑ) اگر تمہارے پاس چلے آتے

اور خدا سے معافی مانگ لیتے اور رسول بھی ان کی مغفرت چاہتے۔........................

۶۔ ارشادالٰہی ہے: "وَلَوْتَرىٰ اِذِالظّٰالِمُوْنَ(آلَ مُحَمَّدٍ حَقَّهُمْ)فِيْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ" (انعام / ۹۳) اور اے رسولؐ! کاش کہ تم دیکھتے (آل محمدؐ کے حق میں) ظلم کرنے والے موت کی سختی میں پڑے ہیں

۷۔ جنہیں تفسیر صافی میں تفسیر عیاشی سے نقل کیا گیا ہے اور وہاں پر امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے، مثلاً خدا فرماتا ہے: "وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ" (آل عمران / ۸۱) اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق لیا۔ یہ آیت یوں نازل ہوئی ہے: "وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ اُمَمِ النَّبِيِّيْنَ" "نبی کی امتوں سے میثاق لیا۔

۸۔ صافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ......" (بقرہ / ۵۹) یوں نازل ہوئی ہے: "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا آلَ مُحَمَّدٍ حَقَّهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا حَقَّهُمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ" "مگر جن لوگوں نے آل محمدؐ پر ان کے حق کے بارے میں ظلم کیا جو بات ان سے کہی گئی تھی اسے بدل دیا، تو ہم نے ان ظالموں پر جنہوں نے آل محمدؐ کے حق کے بارے میں ظلم کیا ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کر دیا۔

۹۔ کافی میں ابوبصیر سے ایک طولانی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ: "........... پھر پیغمبر کی طرف یہ وحی آئی "سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِلْكَافِرِيْنَ(بِوِلَايَةِ عَلِيٍّ)لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ" (معارج / ۱ تا ۳) ایک مانگنے والے نے (ولایت علیؑ کے) منکرین کیلئے ہو کر رہنے والے عذاب کو مانگا جس کو کوئی نہیں ٹال سکتا، جو بلند درجوں والے خدا کی طرف سے تھا"۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: "میں آپؑ کے قربان جاؤں ہم تو اس طرح نہیں پڑھتے!" امامؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم اسی طرح جبرائیلؑ آنحضرتؐ کے پاس لے کر آئے تھے، اور مصحف فاطمہ زہرا علیہا السلام میں بھی اسی طرح درج ہے"۔ یہ اور اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں جو کسی کوشش کرنے والے محقق کو مل سکتی ہیں۔ اور تفاسیر میں سے تفسیر قمی اس بارے میں کافی حد تک مواد کی حامل ہے۔ اب تک بیان کی جانے والی روایات حق کے متلاشی کیلئے کافی ہیں۔ کیونکہ یہ اپنے اختلافات کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کمی ضرور واقع ہوئی ہے اور اسی سے بدیہی علم حاصل ہو جاتا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابھی جن چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انہیں قرآن مجید سے نکال دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ قرآن نہیں بلکہ احادیث قدسی تھیں۔ لیکن ان کا یہ نظریہ حقیقت سے اسی قدر دور ہے جتنا یہ کہ مذکورہ چیزیں قرآن نہیں بلکہ تفسیر اور معانی کی وضاحت کیلئے ذکر ہیں۔ اس لئے کہ ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ اس بارے میں بڑی وضاحت سے کہا گیا ہے کہ فلاں آیت "اسی طرح نازل ہوئی ہے" جبکہ بعض کے متعلق تو ہے کہ "خدا کی قسم اسی طرح نازل ہوئی ہے" اس قدر وضاحت کے باوجود یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کو ہم تفسیر سمجھیں جیسا کہ شیخ صدوقؒ کو اسی بات کا مغالطہ ہوا ہے۔

مصنفؒ کا تبصرہ: انصاف کی بات یہ ہے کہ مذکورہ تفصیلی دلائل اور حد تواتر تک پہنچی ہوئی روایات کے آجانے کے بعد ان لوگوں کے دلائل میں کوئی وزن نظر نہیں آتا جو قرآن مجید میں کمی کا انکار کرتے ہیں۔ اور اس کے

ساتھ اگر ان روایات کو بھی ملایا جائے جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کچھ لوگ حوض کوثر پر جائیں گے تو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے دریافت فرمائیں گے کہ تم نے میرے بعد ثقلین (قرآن واہل بیتؑ) کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو وہ جواب دیں گے ثقل اکبر (قرآن مجید) کو تو جلاڈالا (یا بروایتے بدل ڈالا) اور ثقل اصغر (اہل بیتؑ) کو قتل کر دیا۔ اور اس قسم کی روایات بھی حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، تو ہمارے موقف کو اور تقویت ملتی ہے۔

ایک اہم سوال: جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن مجید میں تحریف سے کام لیا گیا ہے تو پھر ہمارے لئے اس موجودہ قرآن کی قرائت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟ خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ فلاں آیت سے اس قدر حصہ مفقود ہے۔ لہذا ہم پر ضروری ہو جاتا ہے کہ نزولی صورت کے مطابق اس کی تلاوت کی جائے۔

جواب: آئمہ اطہار علیہم السلام نے ہمیں اسی بات کا پابند بنایا ہے کہ اس کی تلاوت اس کی موجودہ صورت کے مطابق کریں اور اس کی نزولی صورت کے مطابق اجازت نہیں دی ہے۔

اس کے دلائل: ہمارے اس دعویٰ کے ثبوت میں روایات موجود ہیں:

چنانچہ کافی میں ہے کہ راوی نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "آپ کے قربان جاؤں ہم بعض اوقات قرآن مجید کی ایسی آیات سنتے ہیں جو ہمارے پاس موجود قرآن میں نہیں ہیں کہ لوگ عام طور پر جن کی تلاوت کرتے ہیں اور نہ ہی ہم اچھا سمجھتے ہیں کہ ان کی تلاوت کریں ہم تو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح آپؑ سے سنا ہے تو کیا ہم گناہگار ہوں گے؟" فرمایا: "نہیں! اسی طرح پڑھو جس طرح سیکھ چکے ہو۔ پس عنقریب تمہارے پاس وہ آئے گا جو تمہیں اس کی تعلیم دے گا"۔ اسی طرح کافی ہی میں اسناد کے ساتھ سالم بن اسلمہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کی جسے میں نے بھی سنا اور اس میں کچھ ایسے حروف بھی سنے عام طور پر لوگ جن کی تلاوت نہیں کرتے۔ یہ سن کر امامؑ نے فرمایا: "کہ کیا پڑھ رہے ہو، اس طرح کی قرائت نہ کیا کرو، اسی طرح پڑھو جس طرح دوسرے لوگ پڑھا کرتے ہیں۔ جب تک کہ قائم (آل محمدؐ) کا ظہور نہ ہو جائے۔ جب ان کا ظہور ہو جائے گا تو وہ کتاب اللہ کو اسی طرح پڑھیں گے جس طرح اس کی اپنی اصل حد ہے۔" پھر آپؑ نے وہ مصحف بھی نکالا جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں کا تحریر کردہ تھا۔

ایک اور سوال: ہم قرآن مجید میں تحریف تسلیم کئے لیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی تصحیح حضرت امیر المؤمنین نے اپنے ایام خلافت میں کیوں نہیں کی تھی جبکہ اس وقت کوئی چیز مانع بھی نہیں تھی۔

جواب: یہ ہے کہ اس وقت بھی تقیہ مانع تھا لہذا آپ ایسا نہیں کر سکے کیونکہ اس طرح سے لوگ سابقہ حضرات کے خلاف ایک اقدام تصور کرتے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، جس طرح آپؑ "نماز چاشت" کو ختم نہیں کر سکے۔ اور متعہ حج اور متعہ نساء کا اجراء نہیں کر سکے، قاضی شریح کو مسند قضا سے نہیں ہٹا سکے۔ معاویہ کو شام سے معزول نہیں کر سکے۔ اس کی مکمل تشریح الاحتجاج میں ایک زندیق کے جواب کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور مصلحت بھی تھی۔ اور وہ کہ اس لحاظ سے بھی قرآن میں

تحریف اور تغیر و تبدل کرنے والوں پر قیامت کے دن حجت تمام ہو۔ اور ان لوگوں کے اس غلط اقدام کا بھانڈا تمام اہل محشر کے سامنے پھوٹے اور وہاں پر ان کو سب کے سامنے رسوا ہونا پڑے۔

وہ یوں کہ رب العزت کی بارگاہ سے امت محمدیہ کو خطاب ہوگا: "جو کتاب میں نے تمہاری طرف نازل کی تھی تم نے اس کی کیونکر قرائت کی؟" تو وہ جواب دیں گے: "ہم نے اس اس طرح اس کی قرائت کی!" ارشاد ہوگا: "ہم نے تو ایسے نازل نہیں کیا تھا، تو تم نے اسے کیوں ضائع کیا؟ اس میں کیوں تحریف کی؟ اور اس میں کس لئے کمی کی؟" تو وہ جواب دیں گے: "پروردگارا! ہم نے اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، نہ ہم نے اسے ضائع کیا اور نہ ہی اور کوئی تبدیلی کی! بلکہ یہ تو ہمارے پاس نازل ہی اسی صورت میں ہوئی تھی!!"

اس پر خداوند عالم حاملین وحی سے مخاطب ہو کر فرمائے گا: "تو کیا تم نے میری وحی کی تبلیغ میں کوتاہی کی اور میری امانت کے پہنچانے میں خیانت سے کام لیا؟" تو وہ جواب دیں گے: "پروردگار! ہم نے تیری وحی میں کچھ بھی کوتاہی نہیں کی بلکہ تیرے پیغمبرؐ کی وفات کے بعد فلاں فلاں لوگوں نے ایسا کیا ہے!" تو اس وقت تمام اہل محشر کے سامنے ان کی ساری بدعملی کی رسوائیاں ظاہر ہو جائیں گی اور اس طرح سے عظیم رسوائی اور دردناک عذاب کا استحقاق حاصل کر لیں گے، اور یہ استحقاق اس کے علاوہ ہوگا جو وہ امر رسالت کے بارے میں کوتاہی اور خلافت کے غصب کرنے کی وجہ سے عذاب و سزا کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔

ایک اور اعتراض: یہ بات ہم مان لیتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام اس کی تصحیح نہیں کر سکے اور اس کے اس حال پر باقی رہنے میں وہی مصلحت ہے جو آپ نے ذکر کی ہے۔ لیکن ائمہ اطہار علیہم السلام نے ایسا کیوں نہ کیا؟ یعنی جو قرآن تحریف سے پاک ان کے پاس تھا انہوں نے وہ کیوں نہ امت کے حوالے کیا؟ ان کے ایسا کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟

جواب: یہ ہے کہ ان کے ایسا نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں مثلاً:

۱۔ اگر اس موجودہ کتاب کی موجودگی میں غیر تحریف شدہ کتاب کو ظاہر کر دیا جاتا تو امت محمدیہؐ کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو جاتا جس سے لوگوں کو ان کے اصلی کفر کی طرف لوٹ جانے اور رجعت قہقری کے بہانے ہاتھ لگ جاتے اور وہ ایسا کرنے میں دیر بھی نہ لگاتے۔

۲۔ اس زمانے میں "نفاق" کا بول بالا تھا اور اس کا طوطی بولتا تھا۔ اگر ائمہ اطہارؑ اسے ظاہر فرما دیتے تو بھی منافقین اس میں اسی طرح کی تبدیلیاں پیدا کر دیتے جس طرح اس سے پہلے کر چکے تھے۔

۳۔ اگر اسے ظاہر کر بھی دیا جاتا تو بھی وہ رائج نہ ہو پاتا۔ اس لئے کہ تحریف شدہ قرآن پہلے سے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی وجوہات ہیں جو اخبار و روایات سے معلوم ہوتی ہیں۔

بہر حال وجہ خواہ کچھ بھی ہو ہماری مذکورہ تصریحات کے مطابق یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ موجودہ قرآن میں تحریف واقع ہو چکی ہے، اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ اور اس میں کمی بھی ہوئی ہے۔ البتہ اس میں بیشی یا اضافے کے بارے میں تردد ہے، لیکن قوی پہلو یہ ہے کہ واقع نہیں ہوئی۔ اس پر بہت سی روایات دلیل ہیں، لیکن اس کے باوجود "اجماع" کو ثابت نہیں کر سکتیں

کہ جس کا دعویٰ شیخ طوسیؒ، شیخ صدوقؒ، مفسر طبرسیؒ اور سید محقق کاظمیؒ نے کیا ہے۔

ایک سوال: ابھی بتایا جا چکا ہے کہ شیخ صدوقؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کمی نہ ہونے پر بھی اجماع ہے۔ اگر اجماع منقول، حجت ہے تو پھر دونوں مقامات پر حجت ہوگا، اور اگر نہیں ہے تو پھر کسی میں بھی نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے تفاوت قائم کرنا، ایک میں حجت ماننا اور دوسرے میں نہ ماننا زیادتی ہوگی۔

جواب: اجماع منقول اس لئے معتبر ہوتا ہے کہ وہ ظن کا فائدہ دیتا ہے۔ اور وہ اس قطع کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا جو ان متواتر اخبار و احادیث سے حاصل ہے۔ جو کمی پر دلالت کرتی ہیں، چونکہ ان روایات سے حاصل ہونے والا ظن زیادہ قوی ہے اس ظن سے جو اضافہ والی دلیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ہم نے اسے اس پر ترجیح دی ہے۔

یہاں پر "تحریف قرآن" کے بارے میں ہماری گفتگو ختم ہوتی ہے ہم نے اپنے فہم اور اپنی دانست کے مطابق اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے جبکہ حقیقت امر کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

(قول مترجم: یہاں پر مصنف نے جو فیصلہ دیا ہے یہ ان کا ذاتی نظریہ ہے جبکہ عموم مسلمین کے نزدیک اور خود قرآن کے قول قرآن مجید کی نگہبان و محافظ ذات پروردگار ہے اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں ہوئی ہے اور جو قرآن پاک اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہ وہی ہے جو صدر اسلام میں تھا البتہ اس کی مختلف قرائتیں اور مختلف تراجم، تفاسیر و تاویلات ہیں کہ جسے ہر کوئی اپنے فہم کے مطابق اخذ کرتا ہے)

تیسرا امر:

علم قرآن۔ ائمہ اطہارؑ سے مخصوص ہے

معلوم ہونا چاہئے کہ عترت طاہرہ اہل بیت علیہم السلام سے تواتر کے ساتھ روایات موجود ہیں اور فرقہ ناجیہ امامیہ کے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد قرآن کے حقیقی وارث حضرت علیؑ اور ان کی طیب و طاہر اولاد یعنی ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔ اور وارث قرآن کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کے محکمات کی تفسیر، متشابہات کی تاویل، اس کے اسرار و رموز کے محافظ اور اس کی آیات اور انوار بینات کے نگہبان ہیں۔ اس بارے میں عقل و نقل ایک دوسرے کے موافق ہیں اور یہی دونوں ائمہ اطہار علیہم السلام کے "علم قرآن" کے بارے میں ایک دوسرے سے بھی متفق ہیں۔

﴿عقلی دلیل﴾

جیسا کہ آپ اسی خطبہ کے (پندرھویں فصل) کے ضمن میں ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر یا آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا روشن طریق کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا"۔ اور زمین کبھی حجت خدا سے خالی نہیں رہی۔ اس لئے کہ ہر دور اور ہر لمحے میں خلق خدا کو اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی ہستی ہو جو انہیں حکمت اور مواعظ حسنہ کے ذریعے خدا سے قریب اور سبیل رب کی طرف راہنمائی کرے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ "وہ حجت"

تمام قرآن کا علم رکھتی ہو، کیونکہ قرآن مجید اپنے نگران اور نگہبان کے بغیر فی نفسہ حجت نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا دعویٰ کے ثبوت کے لئے عرض ہے کہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ قرآن ایسی کتاب نہیں جس کا حقیقی علم عام اہل علم و فضل کے پاس ہو، چہ جائیکہ کسی دوسرے شخص کے پاس صحیح معنوں میں علم ہو۔ اس لئے کہ اکثر ارباب نظر عام حکماء اور اہل فہم کی کتابوں کے مطالعہ سے عاجز ہوتے ہیں۔ مثلاً افلاطون اور ارسطو وغیرہ جیسے صاحبان فہم و حکمت کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے تو وہ قرآن جیسی عظیم کتاب کا علم اور اس کا فہم کیونکر حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ قرآن کتاب آسمانی اور کلام ربانی ہے۔ اس کی نسبت دوسری کتابوں سے ایسی ہے جیسے رب کی نسبت دوسرے مصنفین سے ہے۔ قرآن کوئی عام معمولی کتاب نہیں بلکہ یہ عجیب و غریب اسرار اور رموز اور بطون و نکات پر مشتمل ہے۔ جب تک تائید الٰہی، الہام ربانی اور تعلیم نبویؐ حاصل نہ ہو اس کے نور تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ہم نے آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہو کہ "یہ تمام قرآن کا عالم ہے"۔ لہذا روئے زمین پر پیغمبر اکرمؐ کے بعد اگر کوئی قرآن کا عالم، عارف، نگران اور نگہبان ہے تو وہ صرف اور صرف حضرت علیؑ اور ان کی معصوم اولاد ہے صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ اس کی دلیل یہ ہے، جس طرح کہ کافی میں مذکور ہے۔ منصور بن حازم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں اور بھی بہت سی باتیں کیں اس کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ :"میں نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ حضرت رسول خداؐ اللہ کی مخلوق پر حجت خدا تھے" تو انہوں نے :"کہا ضرور تھے"۔ میں نے کہا :"جب آنحضرتؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپؐ کے بعد خلق خدا پر کون حجت تھا؟" انہوں نے کہا :"قرآن!" میں نے جب غور کیا تو دیکھا کہ مرجیٔ، قدری اور زندیق کہ جو خدا اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے وہ بھی اگر اس کے ذریعہ استدلال کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے مخالف پر غالب آجاتے ہیں، تو مجھے معلوم ہو گیا کہ قرآن بغیر کسی نگران اور نگہبان کے حجت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے نگران کا فیصلہ ہی حرف آخر ہو گا، لہذا میں نے ان سے پھر سوال کیا کہ :"قرآن کا نگران و نگہبان کون ہے؟" تو انہوں نے کہا :"ابن مسعود بھی کچھ جانتے تھے، عمر بھی عالم تھے اور حذیفہ کو بھی اس کا علم حاصل تھا"۔ میں نے ان سے پوچھا :"مذکورہ افراد تمام قرآن کے عالم تھے؟" انہوں نے کہا :"نہ! تمام قرآن کے عالم تو نہیں تھے"۔ تو میں نے پوری کائنات میں کسی کو نہیں دیکھا جو سارے قرآن کا عالم ہو سوائے علی بن ابی طالبؑ کے! کیونکہ جب بھی کسی کو کوئی علمی مشکل در پیش آجاتی تو ہر ایک یہی کہتا کہ :"میں نہیں جانتا" لیکن یہ صرف اور صرف علی بن ابی طالبؑ تھے جو ہر منزل اور میدان میں یہی کہتے نظر آتے "میں جانتا ہوں" اس لئے میں گواہی دیتا ہوں کہ "علیؑ ہی قرآن کے وارث، نگران اور نگہبان تھے اور ان کی اطاعت فرض تھی اور وہ رسول خدا کے بعد حجت خدا تھے اور انہوں نے قرآن کے بارے میں جو کچھ فرمایا حق فرمایا" یہ سن کر امام جعفر صادقؑ نے منصور سے فرمایا "خدا تمہارا بھلا کرے!!"

﴿نقلی دلائل﴾

اس سلسلے میں نقلی دلائل اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ہم یہاں پر بطور نمونہ چند ایک دلائل کو بیان کریں گے :

۱۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ راتوں میں سے ایک رات کو حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت

آپؑ سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان فرمارہے تھے۔ جب میں نے اپنے آپ کو آنجنابؑ کے مقابل میں دیکھا تو خود کو یوں محسوس کیا "میں تو بحر اوقیانوس کے مقابلے میں ایک خالی گھڑا ہوں"۔ اس وقت آپؑ ارشاد فرمانے لگے کہ: "اگر چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کردوں"۔

۲۔ غایۃ المرام میں اسناد کے ساتھ اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا: "اگر میرے لئے تکیہ لگادیا جائے اور میں اس مسند قضا پر بیٹھ جاؤں تو اہل توریت کے درمیان ان کی توریت سے، اہل انجیل کے درمیان ان کی انجیل سے اور قرآن والوں کے درمیان ان کے قرآن سے ایسے فیصلے کروں جو اللہ کے حضور جا پہنچیں اور اپنی چمک دمک سے دنیا کو خیرہ کر دیں، خدا کی قسم کتاب اللہ کی جو بھی آیت دن کو یا رات کو اتری ہے میں جانتا ہوں کہ کس کے حق میں اتری ہے۔ اور جس جس کے سر پر استرا چلا ہے اسی اسی کے بارے میں قرآن کی آیت موجود ہے جو اسے جنت یا جہنم لے جائے گی"۔

اس پر ایک شخص کھڑا ہو گیا اور پوچھا: "امیر المؤمنینؑ! آپؑ کے حق میں کونسی آیت نازل ہوئی ہے؟" آپؑ نے فرمایا: "اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" (ھود / ۱۷) تو کیا وہ شخص اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہو اور اس کے پیچھے ہی پیچھے انہی کا ایک گواہ ہو۔ چنانچہ پیغمبر خداؐ "اپنے رب کے بیّنہ پر ہیں" اور میں اس بارے میں ان کا "شاہد" ہوں جو "ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوں"۔

۳۔ غایۃ المرام ہی میں ہے کہ شیخ طوسیؒ کی امالی سے اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: "تم مجھ سے کتاب خدا کے بارے میں سوال کرو، کیونکہ خدا کی قسم کتاب خدا کی کوئی آیت رات یا دن میں، سفر یا حضر میں نازل نہیں ہوئی مگر رسول خداؐ نے مجھے وہ پڑھا دیا اور اس کی تاویل مجھے سکھادی"۔ اس پر ابن کواء نے کھڑے ہو کر کہا: "یا امیر المؤمنینؑ! جو آیت آپؑ کی غیبت میں اترتی تھی اس کے بارے میں آپؑ کیا فرماتے ہیں؟" اس پر حضرتؑ نے فرمایا: "آنحضرتؐ پر جو قرآن میری غیبت میں اترتا تھا تو آنحضرتؐ اسے میرے لئے محفوظ اور مخصوص فرمالیا کرتے اور جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ مجھے پڑھا دیا کرتے اور فرماتے: "یا علیؑ! اللہ نے فلاں فلاں چیز نازل فرمائی ہے اور اس کی یہ یہ تاویل ہے"۔ چنانچہ آپؐ مجھے اس کی تاویل اور تنزیل دونوں سے آگاہ فرماتے"۔

۴۔ بحار الانوار میں بصائر الدرجات سے نقل کیا گیا ہے، اس میں اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ راوی نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "آپؑ کے قربان جاؤں آیا حضرت رسول خداؐ تمام انبیاء کے علم کے وارث تھے؟" امامؑ نے فرمایا: "ہاں!" میں نے کہا: "آدمؑ سے لے کر اپنی ذات تک کے؟" فرمایا "ہاں ایسا ہی ہے" میں نے پھر پوچھا: "آنحضرتؐ ان کی نبوت کے وارث بھی تھے اور علم کے بھی؟" امامؑ نے فرمایا: "اللہ نے جس پیغمبر کو بھی بھیجا ہے، آنحضرتؐ ان سب سے اعلم تھے!" تو میں نے کہا: "عیسیٰ بن مریم، حکم خدا مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے یہ سچ ہے؟" فرمایا: "ہاں سچ ہے! اور سلیمان بن داؤد پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے، اور حضرت رسول اسلامؐ ان سب چیزوں پر قادر تھے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ جب ہُدہُد گم ہو گیا اور حضرت سلیمانؑ نے اس کی گمشدگی پر شک کرتے ہوئے کہا: "مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ" (نمل / ۲۰) اور (سلیمانؑ نے کہا) کیا

بات ہے کہ میں ہُدہُد کو (اس کی جگہ) نہیں دیکھتا یا واقع میں وہ کہیں غائب ہے؟ حالانکہ سر کش جنات، ہوا، چیونٹیاں، جن وانس اور شیاطین تک ان کے تابع فرمان تھے۔ پھر بھی غضبناک ہو کر ہُدہُد کے بارے میں فرمایا: "لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ" (نمل / ۲۱) (اگر ایسا ہے تو) میں اسے سخت سے سخت سزا دوں گا یا نہیں تو اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا۔ حضرت سلیمانؑ کے اس پر غضبناک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہُدہُد ان کیلئے پانی کی راہنمائی کرتا تھا جبکہ حضرت سلیمانؑ اس چیز سے محروم تھے۔ اس وقت حضرت سلیمانؑ کو پانی کی ضرورت محسوس ہوئی دیکھا تو پانی کا رہبر ہُدہُد موجود نہیں ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جو نہ تو حضرت سلیمانؑ کو عطا ہوئی تھی اور نہ ہی لشکر کے کسی اور فرد کو حالانکہ سر کش جنات تک ان کے تابع تھے مگر ہوا کے نیچے زمین میں موجود پانی کا انہیں بھی علم نہیں تھا، اور پرندے اس سے باخبر تھے۔ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَى" (رعد / ۳۱) اگر کوئی قرآن بھی نازل ہوا ہوتا جس کی وجہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے چل کر کھڑے ہوتے یا ان کی وجہ سے زمین کی مسافت طے کی جاتی یا اس کی برکت سے مردے بول اٹھتے۔

ہم ہی اس قرآن کے وارث ہیں ہمارے پاس ہی وہ قرآنی ذرائع ہیں جن سے پہاڑوں کو چلایا جا سکتا ہے، مسافت کو قطع کیا جا سکتا ہے اور مردوں کو حکم خدا سے زندہ کیا جا سکتا ہے، ہم ہی جانتے ہیں کہ فضا کے نیچے اور زمین کے اندر کیا ہے؟ اور کتاب اللہ کی تصریح کے مطابق اللہ نے انبیاء ما سبق کو جو کچھ بھی عنایت کیا تھا وہ سب کچھ ہمارے لئے "ام الکتاب" (قرآن مجید) میں مقرر کر دیا ہے۔ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ" (نمل / ۷۵) اور آسمان اور زمین میں کوئی ایسی بات پوشیدہ نہیں جو واضح و روشن کتاب میں لکھی موجود نہ ہو۔ اور فرماتا ہے: "ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا" (فاطر / ۳۲) پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو قرآن کا وارث بنایا جنہیں (اہل سمجھ کر) منتخب کیا۔ پس ہم وہی ہیں جنہیں اللہ نے منتخب کیا ہے اور ہم ہی اسی قرآن کے وارث ہیں جس میں ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

۵۔ کافی میں اسناد کے ساتھ عبد الرحمٰن بن کثیر سے اور وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے "قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ" (نمل / ۴۰) وہ شخص جس کے پاس کتاب خدا کا کسی قدر علم تھا بولا کہ میں آپ کی پلک جھپکنے سے بھی پہلے تخت کو آپ کے پاس حاضر کئے دیتا ہوں۔ کی تلاوت کی پھر آپؑ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو کھول کر سینے پہ رکھ کر فرمایا: "عِنْدَنَا وَاللّٰهِ عِلْمُ الْكِتَابِ كُلِّهِ" خدا کی قسم! ہمارے پاس تمام کتاب کا علم ہے۔

۶۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ اذینہ کہتے ہیں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے وہ امیر المؤمنینؑ ہیں"۔ پھر آپؑ سے سوال کیا گیا: "جس کے پاس کچھ کتاب کا علم ہے وہ افضل ہے یا جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "پہلے کی مثال دوسرے کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے مچھر کے پر پر پانی کا ذرہ سمندر کے مقابلے میں ہوتا ہے"۔

۷۔ غایۃ المرام میں اسناد کے ساتھ عبد الاعلیٰ بن اعین کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سنا آپؑ نے

فرمایا: "میں اولاد رسولؐ سے ہوں، میں کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جانتا ہوں، کتاب اللہ میں تخلیق کائنات کی ابتداء کا تذکرہ ہے اور اسی میں ہی قیامت تک ہونے والے واقعات موجود ہیں۔ اس میں آسمان و زمین، جنت و دوزخ اور گزشتہ و آئندہ کی خبریں موجود ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں جیسے اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فِيهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ" "اس میں ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے"۔

۸۔ اسی سے ملتی جلتی روایت کافی میں بھی موجود ہے جو عبد الاعلیٰ کی زبانی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کو فرماتے سنا: "خدا کی قسم! میں کتاب اللہ کو اس کے اول سے لے کر آخر تک سب سے زیادہ جانتا ہوں گویا کہ وہ میری ہتھیلی میں ہے، اس میں آسمان و زمین کی اور گزشتہ و آئندہ کی خبریں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس میں ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے"۔

ان احادیث پر تبصرہ

بعض محققین نے ان احادیث پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ: "حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "گویا کہ وہ میرے ہاتھ میں ہے" یہ اس بات کی طرف متوجہ کرانے کیلئے فرمایا ہے کہ کتاب خدا کے بارے میں آپؑ کا علم شہودی ہے، بسیط ہے، واحد بالذات ہے اور تمام سے متعلق ہے۔ جس طرح ہتھیلی پر نظر ایک مرتبہ پڑتی ہے اور اس کے سب اجزاء پر ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ اگر تعدد ہوتا ہے تو یہ صرف اعتباری ہوتا ہے۔ حضرتؑ کا یہ فرمانا کہ: "اس میں آسمانوں کی خبریں ہیں" اس سے آپؑ کی مراد ہے افلاک کے حرکات اور احوال، ملائکہ کے حالات اور درجات، کواکب کی حرکت اور ان کے مدار، ان حرکات کے فوائد اور اثرات، غرض وہ تمام امور جو عالم علوی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور ان کے فوائد فلکیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت کا یہ فرمانا کہ: "اس میں زمین کی خبریں ہیں" یعنی زمین کے جوہر اور اس کی انتہا کی، جو کچھ زمین کے اندر یا اس کے اطراف میں، جو اس کے شکم کے اندر ہے یا اس کی فضا میں ہے۔ معدنیات وغیرہ اور فلک کے نیچے جو بھی بسیط اور مرکب چیزیں ہیں کہ جن کے تھوڑے سے حصہ کے ادراک سے انسانی عقول دنگ رہ جاتی ہیں اور اس کے ادنیٰ ترین مرتبے تک پہنچنے سے پہلے ہی ظاہری فکر و نظر لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں۔

امامؑ کا یہ فرمانا "اس میں گزشتہ و آئندہ واقعات کی خبریں ہیں" یعنی گزشتہ لوگوں کی خبریں بھی ہیں اور بعد میں آنے والے افراد کی بھی، کلی طور پر بھی اور جزوی طور پر بھی۔ جنت کے حالات و مقامات، ان کے مراتب و درجات کا باہمی تفاوت، اتباع و اطاعت سے حاصل ہونے والے ثواب، عبادت و زہد کی وجہ سے ملنے والا اجر، جہنم اور اس کے طبقوں کی ہولناکیاں، عقوبت و مصیبت کے حالات، عالم برزخ میں نور و ظلمت کے مراتب کا فرق، اس میں مخلوق کے ساتھ سختی اور نرمی کے سلوک کی حالت، غرض اس میں ہر ایک چیز کا ذکر اور حالات و کیفیات موجود ہیں کیونکہ بقول خود "اس میں ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے" یعنی ایسی وضاحت اور شرح کہ جس کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

چوتھا امر:

تفسیر بالرائے کی ممانعت

معلوم ہونا چاہئے کہ کثرت سے ایسی روایات بیان ہوئی ہیں جو تفسیر بالرائے سے روکتی ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک کو یہاں پر بیان کرتے ہیں:

۱۔ مجمع البیان میں ہے: "صحیح روایات جو حضرت رسالتمابؐ اور ان کے مقدس اور معصوم جانشینوں سے ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ کہ "قرآن کی تفسیر صحیح روایات اور نص صریح کے بغیر ناجائز ہے"۔ پھر فرماتے ہیں "مذہب عامہ کے نزدیک یہ ہے کہ حضور پاکؐ نے ارشاد فرمایا ہے "جو شخص اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرے گا اور وہ حق کی حدود تک بھی جا پہنچے گی پھر بھی اس نے خطا کی ہے"۔

۲۔ تفسیر عیاشی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "جو شخص اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرے گا اگر تو وہ صحیح ہوگی اس پر اسے کوئی اجر نہیں ملے گا اور اگر غلط ہوگی تو وہ آسمان سے بھی دور تر مقام سے گر کر تباہ ہو جائے گا"۔

۳۔ حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے آباءواجداد کے ذریعہ حضرت امیر المؤمنینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتا ہے:

الف۔ وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو میرے کلام کو اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرتا ہے۔

ب۔ مجھے نہیں پہچانا اس شخص نے جو مجھے اپنی مخلوق سے تشبیہ دیتا ہے۔

ج۔ نہیں ہے میرے دین پر وہ جو میرے دین میں اپنے قیاس کو کام میں لاتا ہے"۔

۴۔ کافی میں زید شحام سے روایت ہے وہ قتادہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کی گفتگو کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "قتادہ! تم پر بہت افسوس ہے کہ اگر تم قرآن کی تفسیر اپنی طرف سے کرتے ہو تو پھر ایسی خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ اور اگر دوسروں سے اخذ کر کے بیان کیا تب بھی تم ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔...... (یہاں تک کہ فرمایا) قتادہ! خدا تم سے سمجھے، قرآن کو صرف وہی جان سکتے ہیں جن سے قرآن کے ذریعہ خطاب کیا گیا ہے"۔

تبصرہ: جب یہ چیز آپ کو معلوم ہو گئی تو پھر ہم یہاں پر بطور تبصرہ یہ کہتے ہیں کہ متاخرین سے کچھ لوگ جو "اخباری" کہلاتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ: "جب تک ائمہ اطہار علیہم السلام سے کوئی بیان صادر نہ ہو، اس وقت تک نہ تو احکام شرعیہ میں سے کوئی حکم قرآن سے استنباط کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے استدلال قائم کرنا جائز ہے" اس بارے میں وہ مذکورہ روایات کا سہارا بھی لیتے ہیں اور دوسری کئی اور روایات کو بھی اس مقصد کیلئے پیش کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے اس موقف کی جملہ مجتہدین (اصولیون) مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ متفقہ طور پر قرآن کی محکم آیات خواہ نص ہوں یا ظاہر پر جواز عمل کے قائل ہیں۔ اور انہوں نے اپنے اس موقف پر وافی دلائل اور شافی برہانوں کے ساتھ استدلال کیا ہے۔ جنہیں انہوں نے علم کلام میں ذکر کیا ہے۔ اور ہمیں اس مقام پر ان دلائل کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہاں پر مقصود، مذکورہ روایات کے معانی کی تحقیق کرنا ہے تاکہ ہمارا مدعا واضح

ہو جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اخباری حضرات کا ان روایات کا سہارا لینا بے سود ہے کیونکہ ان روایات کی ان کے مقصود پر دلالت نہیں ہوتی۔ اس بات کی وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ "تفسیر" کو لفظ "فَسَرَ" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "چھپی ہوئی چیز سے پردہ اٹھانا" جیسے کہا جاتا ہے "فَسَرَالشَّيْءَ" جب کسی چیز کا پردہ ہٹایا جائے۔

بعض حضرات اس کا معنی کرتے ہیں "مشکل لفظ سے مراد کو ظاہر کرنا" اور کتاب "اوقیانوس" میں ہے کہ "تفسیر کا لفظ مفسرین کے عرف میں تاویل کے ہم معنی ہے" اور کتاب "المصباح" میں ہے کہ لفظ "تفسیر" کا مادہ "فَسرًا" ہے۔ ضرب یضرب کے وزن سے ہے اور "فَسَرْتُ الشَّيْءَ" کے معنی ہیں "میں نے چیز کو واضح طور پر بیان کر دیا" جبکہ "الصحاح" میں "فسر" کے معنی "بیان" کے ہیں اور "فسر" اور "تفسیر" ہم معنی ہیں۔

مندرجہ بالا تشریح کے بعد ایک بار پھر ہم اپنے مطلب کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر روایات میں مذکور تفسیر سے مراد پہلے دو معانی میں تو ظاہری معانی اور نص کے ساتھ عمل کرنے سے ممانعت پر احادیث مذکورہ کی دلالت بطریق اولیٰ نہیں ہو گی، کیونکہ ظاہری بات ہے کہ مذکورہ دونوں معانی کے مطابق تفسیر ان الفاظ کی ہو گی جن کے معانی مخفی اور پوشیدہ ہیں اور ان الفاظ کی ہو گی جن کے معانی مشکل ہیں جیسے مجمل اور متشابہ الفاظ ہیں۔ اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ جن الفاظ کے معانی بذات خود ظاہر ہیں اور ان پر کسی قسم کا کوئی پردہ پڑا ہوا نہیں ہے کہ جسے ہٹایا جائے اور اس کی حقیقت کو ظاہر کیا جائے۔ ان میں کوئی اشکال ہی نہیں کہ انہیں واضح کرنے کی ضرورت در پیش آئے۔ اگر "تفسیر" کو "تاویل" کے ہم معنی لیا جائے تو بھی یہی صورت حال ہو گی۔ کیونکہ جن چیزوں کی تاویل کی ضرورت ہوتی ہے ہم بھی اسے اپنی طرف سے تاویل کے ناجائز ہونے کے منکر نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ جن متشابہات کی تاویل کی ضرورت ہوتی ہے ان کیلئے صرف اور صرف ائمہ اطہارؑ ہی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے "وَمَایَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّااللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" (آل عمران / ۷) اور خدا اور ان لوگوں کے سوا جو راسخ علم رکھتے ہیں، ان کا اصل مطلب کوئی نہیں جانتا، لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آیات محکمات" میں ان کے ظاہر پر عمل کرنے کی اجازت کہاں سے حاصل ہوئی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: "مصباح" اور "صحاح" کی تعبیر کے مطابق کہ تفسیر کے معنی ہیں "توضیح اور بیان" کے۔ اسی لئے مذکورہ روایات سے استدلال کرنے کی ایک صورت ہے۔ کیونکہ تفسیر صرف مجمل اور متشابہ الفاظ کے معانی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

ہاں البتہ یہ اور بات ہے کہ مذکورہ روایات میں مذکور "رائے" سے مراد عقلی اور ظنی اعتبار ہے جو استحسان کی طرف لوٹتا ہے۔ تو اس لحاظ سے "تفسیر بالرائے" سے مراد ہو گی "لفظ کا اس کے ظاہر کے خلاف پر، یا دو احتمالات میں سے ایک پر حمل کرنا اس وجہ سے کہ اس کی نظر قاصر میں اس کا اس طرف رجحان ہے۔ تو اس لحاظ سے یہ تعریف کتاب کے ظاہر کو اس کے لغوی اور ظاہری عرفی معانی کو شامل نہیں ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان روایات سے مقصود و مطلوب مخالفین مذہب کی مذمت اور ان کی سرزنش ہے کیونکہ وہ تفسیر قرآن کے سلسلے میں اپنی فاسد رائے کے مطابق اپنے آپ کو ائمہ اطہار علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرف

مذکورہ حدیث قدسی میں بھی ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے "جو میرے دین میں قیاس کو کام میں لاتا ہے"۔ اسی طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک فرمان ذی شان میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ آپ ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: "لوگ متشابہ الفاظ کے سلسلے میں ہلاک ہوتے ہیں، کیونکہ ایک تو وہ ان کے معانی سے واقف نہیں ہوتے اور دوسرے ان کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے ان کیلئے تاویلیں گھڑ لیتے ہیں جس طرح ان کا جی چاہتا ہے، اور اس بارے میں وہ اپنے آپ کو اوصیاء پیغمبر علیہم السلام سے بے نیاز سمجھتے ہیں"۔

اس بارے میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "رائے" سے مراد "نفسانی خواہشات اور طبعی رجحان ہو۔

امام غزالی کا تبصرہ

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے کہ "رائے" سے مراد "نفسانی خواہشات اور طبعی رجحان" بھی ہو سکتی ہے۔ تو اس بارے میں امام غزالی اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں، اگر انسان کی کسی شئے میں اپنی رائے ہوتی ہے اور طبعی میلان اور نفسانی خواہشات تو وہ قرآن مجید کی تاویل بھی اپنی رائے کے مطابق کرتا ہے۔ تا کہ اس طرح سے وہ اپنی غرض کو صحیح ثابت کر سکے۔ اور اگر اس کیلئے وہ خواہش اور رائے نہ ہوتی تو قرآن مجید سے اس کیلئے وہ معنی ظاہر نہ ہوتا۔ البتہ ایسا وہ کبھی تو جان بوجھ کر کرتے ہیں جیسے وہ لوگ جو قرآن کی بعض آیات کے ذریعہ اپنی بدعت کو صحیح ثابت کرتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آیت کی مراد وہ نہیں ہے جسے ہم لے رہے ہیں، لیکن وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں تا کہ وہ فریق مخالف پر غالب آجائیں۔ اور کبھی ان کا مقصد صحیح ہوتا ہے اور وہ قرآن مجید سے دلیل پیش کرتے ہیں اور اس استدلال کے بارے میں جانتے بھی ہیں کہ قرآن کی مراد یہ نہیں ہے۔ جیسے وہ شخص جو سنگدل افراد کو نفس کے ساتھ جہاد کرنے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ: "اِذْهَبْ اِلیٰ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغیٰ" (نازعات / ۱۷) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے وہ اس کے دل کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ "فرعون" سے مراد "یہی" ہے یعنی "دل" ہے۔

اس جنس کو بعض اوقات واعظین کرام صحیح مقاصد کے حصول، کلام کے حسن اور سامعین کے تشویق و ترغیب کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ "باطنیہ" بھی اپنے غلط ناجائز اور فاسد مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتے ہیں تا کہ اس طرح سے لوگوں کو دھوکہ دے سکیں اور انہیں اپنے باطل مذہب کی طرف بلا سکیں۔ اس طرح سے وہ قرآن مجید کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتے ہیں اور اسے اپنے مذہب کا مؤید قرار دیتے ہیں، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں قرآن کی مراد قطعاً یہ نہیں ہے۔

<u>اس ساری گفتگو کا نتیجہ</u>: ہمارے اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو بھی اخبار و روایات بیان ہو چکی ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ کہیں پر قرآن مجید کی ظاہر اور محکم آیات سے استنباط کرنے سے منع کیا گیا ہو اور نہ ہی انہیں سن کر یا نقل کر کے ان پر عمل کرنے سے روکا گیا ہو، بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو استنباط کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ" (نساء / ۸۳) تو بے شک جو لوگ ان میں اس کی تحقیق کرنے والے ہیں اس کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور متواتر احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب دو متعارض حدیثیں تمہارے سامنے آجائیں تو انہیں قرآن

تطبیق دو۔ جو اس سے مطابقت رکھتی ہو اسے لے لو اور جو نہ رکھتی ہو اسے مسترد کر دو۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب خدا حجت ہے اور مختلف فیہ احادیث کے پرکھنے کا مرکز ہے۔ اگر نص کے بغیر اس کے معنی سمجھنا غیر صحیح ہوتے تو پھر احادیث کو اس کے ساتھ تطبیق دینا کیونکر ممکن ہوتا اور یہ بات ہی غیر مفہوم ہے۔ اس کی مزید تفصیل "قوانین الاصول" پر ہمارے حواشی میں موجود ہے۔ اس مقام پر اور بھی بہت سی قرآنی بحثیں ہیں قرائات سبعہ کا تواتر، قرآن کے فضائل، اس کی قرائت کے فضائل اس کے سننے اور اس کی طرف نگاہ کرنے کے فضائل وغیرہ۔ جو نہایت ہی باعظمت اور نفیس بحثیں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے مزید کوئی گفتگو نہیں کرتے ۔البتہ بعض مناسب مقامات پر ان میں سے بعض چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اور خدا ہی توفیق دہندہ اور مددگار ہے۔

اٹھارویں فصل

حج اور بیت اللہ کی تفصیلی گفتگو

وَ مِنْهَا

وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلَهٗ قِبْلَةً لِّلْاَنَامِ يَرِدُوْنَهٗ وُرُوْدَ الْاَنْعَامِ وَيَاْلَهُوْنَ اِلَيْهِ وُلُوْهَ الْحَمَامِ جَعَلَهٗ سُبْحَانَهٗ عَلَامَةً لِّتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهٖ وَ اِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهٖ وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهٖ سُمَّاعًا اَجَابُوْا لَهٗ دَعْوَتَهٗ وَصَدَّقُوْا لَهٗ كَلِمَتَهٗ وَ وَقَفُوْا مَوَاقِفَ اَنْبِيَائِهٖ وَ تَشَبَّهُوْا مَلَائِكَتَهُ الْمُطِيْفِيْنَ بِعَرْشِهٖ يُحْرِزُوْنَ الْاَرْبَاحَ فِيْ مَتْجَرِ عِبَادَتِهٖ وَ يَتَبَادَرُوْنَ عِنْدَهٗ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهٖ جَعَلَهٗ سُبْحَانَهٗ لِلْاِسْلَامِ عَلَمًا وَّلِلْعَائِذِيْنَ حَرَمًا فَرَضَ حَجَّهٗ وَ اَوْجَبَ حَقَّهٗ وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهٗ وَ قَالَ سُبْحَانَهٗ "وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً وَّ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

اور اسی خطبے کا حصہ ہے

اور اللہ نے اپنے حرمت والے گھر کا حج تم پر واجب کیا ہے جسے لوگوں کا قبلہ بنایا، جہاں لوگ اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں جس طرح پیاسے حیوان پانی کی طرف، اور اس طرح وارفتگی سے بڑھتے ہیں جس طرح کبوتر اپنے آشیانوں کی جانب، اللہ سبحانہ نے اس کو اپنی عظمت کے سامنے ان کی فروتنی و عاجزی اور اپنی عزت کے اعتراف کا نشان بنایا ہے۔ اس نے اپنی مخلوق میں سے سننے والے لوگ چن لئے ہیں جنہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہی اور اس کے کلام کی تصدیق کی، وہ انبیاء کی جگہوں پر ٹھہرے، عرش پر محو طواف فرشتوں سے مشابہت اختیار کی، وہ اپنی عبادت کی تجارت گاہ میں منفعتوں کو سمیٹتے ہیں اور اس کی وعدہ گاہ مغفرت میں بڑھتے ہیں، اللہ سبحانہ نے اس گھر کو اسلام کا نشان اور پناہ چاہنے والوں کیلئے حرم بنایا ہے، اس کا حج فرض اور ادائیگی حق کو واجب کیا ہے، اور اس کی طرف راہ نوردی فرض کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا: "اللہ کا واجب الادا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا حج کریں، جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔ اور جس نے کفر کیا تو جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے"۔